سیرۃ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ

(اتہام شیعیت کی حقیقت)

مؤلف
مولانا علی احمد عباسی رحمہ اللہ

اعداد و تقدیم
محمد فہد حارث

حارث پبلی کیشنز

سیرۃ امام ابوحنیفہؒ

(اتہام شیعیت کی حقیقت)

مؤلف:

مولانا علی احمد عباسی رحمہ اللہ

اعداد و تقدیم:

محمد فہد حارث

حارث پبلی کیشنز

نام کتاب	سیرۃ امام ابوحنیفہؒ
نام مؤلف	مولانا علی احمد عباسی
مطبوعہ	حارث پبلی کیشنز
سال طباعت	مارچ ۲۰۱۹ء
تعداد	۵۰۰
قیمت	-/۴۰۰

فہرست مضامین

انتساب

فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ

کے نام

جن کی علمی کاوشوں سے یہ احقر ہمیشہ مستفید ہوتا رہا ہے۔ اعتدال کیا ہوتا ہے، دین کیسے سمجھنا ہے، حکمت کیا ہوتی ہے، اور باشعور تحریر کسے کہتے ہیں، یہ سب اس احقر نے حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ کی تحاریر سے سیکھا ہے۔ اللہ ان کا سایہ اس احقر کے سر پر تا زیست سلامت رکھے۔

تقدیم

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سن ۸۰ ہجری میں پیدا ہوئے، ان کے اساتذہ میں حماد بن سلیمان اور عطاء بن ابی رباح شامل ہیں، جبکہ قاضی ابو یوسف اور امام محمد بن حسن شیبانی ان کے مشہور تلامذہ میں سے تھے۔ یہ وہی امام محمد بن حسن شیبانی ہیں جنہوں نے امام ابوحنیفہ کے انتقال کے بعد امام مالک بن انس رحمہ اللہ (ولادت ۹۳ ہجری) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان کو یہ شرف حاصل رہا کہ فقہائے اربعہ میں سے پہلے دو حضرات کے یہ براہ راست شاگرد تھے۔ انہیں امام محمد بن حسن شیبانی کے ایک ہم سبق امام محمد بن ادریس الشافعی (ولادت ۱۵۰ ہجری) تھے جو کہ امام مالک بن انس کے شاگرد تھے۔ گویا ایک واسطے یعنی امام محمد بن حسن شیبانی کے ذریعے امام شافعی کو امام ابوحنیفہ کی فقہ سے بھی استفادے کا موقع ملا تو دوسری طرف براہ راست امام مالک کی فقہ سے بھی مستفید ہوئے۔ جبکہ امام مالک کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ فقہ اربعہ کے دو اماموں کے وہ براہ راست استاد رہے یعنی امام شافعی و امام محمد۔ اسی طرح سے امام شافعی کے شاگرد امام احمد بن حنبل (ولادت ۱۶۴ ہجری) تھے۔ گویا امام احمد بن حنبل کو براہ راست امام شافعی کی فقہ جاننے کا موقع ملا اور بالواسطہ یعنی امام شافعی کے ذریعے امام مالک اور امام ابوحنیفہ کی فقہ سے بھی مستفید ہوئے۔

امام احمد بن حنبل کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا موقع امام بخاری (ولادت ۱۹۴ ہجری) کو حاصل رہا جبکہ انہیں امام بخاری کی شاگردی کا شرف امام مسلم (ولادت ۲۰۴ ہجری) کو

حاصل تھا۔ یاد رہے کہ امام بخاری اور امام مسلم کے بیشتر اساتذہ مشترک تھے جیسا کہ امام احمد بن حنبل اور امام یحیی بن معین۔ اسی طرح سے امام ترمذی کو بھی براہ راست امام بخاری و امام مسلم کی شاگردی کا شرف حاصل رہا جبکہ امام ابن ماجہ کو امام مسلم کے استاد امام ابوزرعہ رازی کی شاگردی و سرپرستی حاصل رہی۔ انہیں امام ابن ماجہ کے ایک اور استاد امام ابوبکر ابن ابی شیبہ تھے جو کہ امام ابن ماجہ کے ساتھ ساتھ امام ابوداؤد کے بھی استاد تھے۔ جبکہ امام نسائی کو امام ابوداؤد اور امام قتیبہ بن سعید سے استفادہ کا موقع ملا جبکہ امام ابوجعفر طحاوی امام نسائی کے مشہور تلامذہ میں سے تھے۔

المختصر اس دقیق و گنجلک تفصیل کی وجہ یہ بتانا مقصود تھا کہ ہمارا علمی ورثہ خیر القرون کے دور سے اس قدر مربوط اور ایک دوسرے سے جڑا ہے کہ نہ صرف چاروں ائمہ ایک دوسرے سے باہم مربوط اور مستفید رہے بلکہ فقہائے اربعہ کا یہ سلسلہ آگے بڑھ کر محدثین سے ملا اور پھر ہمارے صحاح ستہ کے تمام مولفین بھی اسی ربط و سلسلے سے باہم جڑے رہے۔ ایسا نہیں ہوا کہ کوئی فقیہ یا محدث کہیں بیچ میں بغیر کسی ربط کے آ گیا ہو۔ یہی وجہ رہی کہ ان ائمہ و محدثین کے زمانے میں قواعدِ اصولیہ کے تحت شدید فقہی و فروعی اختلاف کے باوجود یہ ائمہ اور ان کے براہ راست شاگرد ایک دوسرے سے نہ صرف مستفید ہوتے رہے بلکہ ایک دوسرے کی بے پناہ عزت و احترام بھی کرتے رہے۔ ظاہری بات ہے ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی طریقے سے دوسرے سے جڑا ہوا تھا۔ مثال کے طور پر امام ترمذی کو لے لیں، جو کہ امام بخاری کے شاگرد تھے، جبکہ امام بخاری امام احمد بن حنبل کے شاگرد تھے، امام احمد بن حنبل امام شافعی کے شاگرد تھے، امام شافعی اور امام محمد بن حسن شیبانی ہم سبق تھے اور امام مالک کے تلامذہ میں شامل تھے۔ امام محمد بن حسن شیبانی امام ابوحنیفہ کے شاگرد تھے جبکہ امام ابوحنیفہ کو امام حماد بن ابی سلیمان کی شاگردی کا شرف حاصل رہا، امام حماد امام ابراہیم نخعی کے شاگرد خاص تھے، جبکہ امام ابراہیم نخعی کو امام علقمہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا موقع ملا جو کہ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگرد خاص تھے اور سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ بقول سیدنا ابوموسی اشعریؓ نبی کریم ﷺ کے اہلبیت میں شامل فرد اور قرآن کے سب سے زیادہ جاننے والے صحابی تھے۔ سو یوں یہ سلسلۃ الذہب صحاح ستہ

کے مولفین سے لے کر نبی کریم ﷺ تک بمعہ جید ترین واسطوں کے پہنچ جاتا ہے، اور یہی ایک بات کافی ہونی چاہیے متجددین کے بودے دلائل کے ابطال کے لئے جو کہ احادیث کو نبی ﷺ کے انتقال کے ڈھائی سو سال کے بعد کا بتانے کی سعی لاحاصل اور ہمارے فقہاء کو محدثین سے برگشتہ دکھانے کی مذموم کوششیں کرتے ہیں۔

ہمارے فقہاء کی جزرسی

پھر یہ متجددین اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ ہمارے فقہاء پر معترض ہوتے ہیں کہ انہوں نے اپنی فقہاء مرتب کرتے ہوئے انسانی جان، ضروریات اور حریت کا اس طور سے خیال نہیں کیا جس طور سے خیال ان کے ''استاد محترم'' اپنی جدید فقہ کی تدوین میں کر رہے ہیں۔ ایسے حضرات سے مکمل حسنِ ظن رکھتے ہوئے ان کے اس اعتراض کو ہم دو باتوں پر قیاس کرتے ہیں، آیا انہوں نے کبھی ''روایت پرست'' قدیم و جدید فقہاء کی کتب کا مطالعہ نہیں کیا، اور اگر کیا ہے تو پھر وہ ان کتب کے مندرجات سمجھنے سے قاصر رہے۔ ائمہ اربعہ کی فقہ سے لے کر ظاہریہ و زیدیہ فقہاء تک میں انسانی جان، ضروریات، حریت حتیٰ کہ علم تک کا جس طور سے خیال رکھا گیا ہے اس کی مثال انسانی تاریخ کے کسی بھی مدون قانون میں ملنا محال ہے۔ زیادہ نہیں، اگر ہمارے ان متجددین حضرات نے صرف علامہ ابن قدامہ حنبلی کی المغنی، علامہ عبیداللہ بن سلام کی کتاب الاموال، الدرالمختار بمعہ حاشیہ ابن عابدین، النووی کی المجموع، ابن نجیم المصری کی البحر الرائق جو کہ امام عبداللہ بن احمد نسفی کی کنزالدقائق کی شرح ہے اور قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج ہی سبقاً کسی استاد سے پڑھ لی ہوتی تو اس طرح کی غلط فہمی کا کبھی شکار نہ ہوتے۔

ایسے حضرات کی غلط فہمی ہم صرف ایک مثال دے کر رفع کرنا چاہیں گے، وگرنہ فقہ اسلامی تو اس طرح کی مثالوں سے بھری پڑی ہے جن کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے فقہاء انسانی زندگی اور اس کی ضروریات کا کس قدر باریک بینی اور نزدیکی سے مشاہدہ کرنے والے لوگ تھے کہ بلا کسی خدائی مدد کے صرف انسانی کاوش کے زیر اثر ایسا کرنا ناممکن لگتا ہے۔ خیر ہم

مثال کی طرف آتے ہیں۔ زکوٰۃ کی بابت بات کرتے ہوئے مقدار نصاب کی بحث کے زیر اثر فقہاء نے ''زائد از ضرورت چیزوں'' کا مبحث قائم کرتے ہوئے انسان کی بنیادی ضرورتوں پر بحث کی ہے کہ جن کی تکمیل کے بعد انسان کا مال زکوٰۃ کے نصاب کو پہنچتا ہے۔ اس سے متعلق فقہاء نے ''انسان کی حقیقی ضرورتوں'' کی تعریف بیان کی ہے جو کہ زکوٰۃ کے باب میں سب سے بنیادی اہمیت کی بحث ہے اور جس کے تعین کے بعد ہی کسی انسان پر زکوٰۃ کے وجوب کا فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔

فقہائے احناف نے ''حقیقی ضرورتوں'' کی بڑی جزرس علمی تعبیر کی ہے اور بتایا ہے کہ ایک انسان کی حقیقی ضرورت میں وہ اشیاء شامل ہیں جو کہ انسان کو ہلاک ہونے سے دور رکھیں، جیسا کہ غذا اور اس کا خرچ جس میں کھانے اور پینے دونوں کی اشیاء شامل ہیں، جائے سکونت یعنی مکان، اسلحہ، گرمی و سردی سے تحفظ دینے والے کپڑے، ایسی چیزیں جن سے انسان تقدیراً اپنی ہلاکت کو دور رکھ سکے یعنی اپنے اوپر آنے والی مصیبتوں سے خود کو بچا سکے، اس کی سب سے بین مثال قرض ہے، جیسا کہ جو بقدر نصاب زکوٰۃ مال مقروض کے پاس ہے، مقروض پر واجب ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے بجائے اس مال کو قرض اتارنے کے لئے استعمال کرے کیونکہ اس مال سے قرض اتار کر وہ اپنے اوپر قرض نہ اتارنے کی صورت میں آنے والی کسی مصیبت جیسا کہ قید وغیرہ کو دور کر سکے کیونکہ قید ہو جانا آزاد انسان کے لئے ہلاکت کے درجے میں ہے۔ اسی طرح ان حقیقی ضرورتوں میں گھریلو استعمال کا سامان، پیشہ وارانہ آلات جو اس کو رزق کمانے میں مدد دیتے ہیں اور سب سے بڑھ کر تعلیم یافتہ انسان کے لئے اس کی کتابیں بھی شامل ہیں، کیونکہ جہالت بھی انسان کے لئے ہلاکت کے درجے میں ہیں۔ اگر کسی شخص کے پاس بقدر نصاب دراہم (روپیہ یا مال) ہوں، جو وہ اپنی ان ضروریات پر خرچ کرنے کا محتاج ہو، تو زکوٰۃ میں دینے کے لئے یہ دراہم کالعدم شمار ہوں گے، جیسے کسی پیاسے شخص کے پاس پینے کا صرف اتنا ہی پانی ہو جس سے اس کی جان بچ سکتی ہو تو بلحاظ وضو پانی کو کالعدم تصور کیا جائے گا اور اس شخص کو تیمّم کرنا جائز ہوگا۔ یہ ساری تفصیلات الدر المختار حاشیہ ابن عابدین اور البحر الرائق

کے جز ثانی میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

یہ ہے ہمارے فقہاء کا بلند کردار و سوچ کہ ان کے نزدیک انسانی حریت اور علم ضروریاتِ زندگی میں شامل ہیں کہ آزاد انسان کے لئے قید اور تعلیم یافتہ انسان کے لئے جہالت کو موت و ہلاکت قرار دیا ہے اور پھر آپ الزام لگاتے ہیں کہ ہمارے فقہاء نے انسانی ضروریات و حریت کا خیال نہیں کیا۔ جناب عالی ! آج کسی ترقی پسند ملک میں بھی انسانی ضروریات کی بنیادی تعریف میں اس قدر باریک تفصیلات موجود نہیں جو کہ ہمارے فقہاء پچھلے ۱۳۰۰ سالوں سے بیان کرتے آرہے ہیں۔ اب جناب ''استاد محترم'' اس میں کون سے اضافے فرمانے لگے ہیں یہ تو ان کی جدید فقہ کے مدون ہو کر منظر عام پر آنے کے بعد ہی پتہ چلے گا۔ فی الحال ہمارا مشورہ ''استاد محترم'' کے تلامذہ کو یہی ہے کہ برائے مہربانی اپنے استاد کی محبت میں غلو کے پیش نظر ''روایت پرست'' فقہاء سے متعلق غلط پروپیگنڈہ سے پرہیز کیجئے اور کوشش کر کے کسی استاد سے سبقاً سبقاً کم از کم متقدمین فقہاء کی کتب کا مطالعہ کیجئے۔ ان شاء اللہ اس طرح کے لایعنی خیالات سے جلد افاقہ ہوگا۔

ہمارے محدثین کا تفقہ فی الدین

اسی طرح ہمارے یہ متجددین دوست ہمارے محدثین پر بھی معترض ہوتے ہیں کہ محدثین جیسے امام بخاری وغیرہم پر محدثانہ رنگ کافی غالب تھا جس کی وجہ سے ان میں تفقہ کی کمی تھی۔ ایسے لغو اعتراضات پر انسان صرف اپنا سر ہی پیٹ کر رہ سکتا ہے۔ بھلا جس محدث کے لئے اہل علم کے ہاں ''فقہ البخاری فی تراجمہ'' کا جملہ معروف ہو اس کی بابت یہ خیال کرنا کہ اس میں تفقہ یا فقہ کی جزرسی کی کمی تھی سخت لائق استعجاب بات ہے۔ جس کسی نے امام بخاری کی صحیح بخاری کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہو وہ یہ مانے بغیر رہ ہی نہیں سکتا کہ امام موصوف صرف ایک حافظ حدیث یا راوی حدیث نہ تھے بلکہ متون حدیث کی گہرائی میں اتر کر ان کے موتیوں کو اجاگر کرنے والے فقیہ بھی تھے۔ امام بخاری نے جس طرح اپنی صحیح میں تراجم ابواب قائم کئے ہیں

اس سے تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا امام بخاری نے صحیح حدیث کی کتاب کی تدوین کا ارادہ نہیں کیا تھا، بلکہ ان کا اصل ارادہ فقہی آراء پر مبنی ایک ایسی کتاب کی تالیف تھا جس میں فقہی احکام و عقائد میں ادلہ کی بنیاد قرآن اور صرف صحیح حدیث پر رکھی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک ہی حدیث سے مختلف فقہی استنباط کا قرینہ موجود ہوتا ہے تو امام بخاری ایک ہی حدیث کو اپنی صحیح میں مختلف ابواب میں لے کر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح بخاری میں بارہا ایسا دیکھنے کو ملتا ہے کہ امام بخاری نے ایک باب کا عنوان باندھا اور اس کے ذیل میں کوئی حدیث ذکر نہ کی، غالبًا یہ اشارہ اس جانب ہے کہ اس مضمون اور باب سے متعلقہ حدیث نبی ﷺ سے منقول تو ہے لیکن وہ میری کتاب کی شرط پر نہیں ہے، اس لئے وہ یہاں نہیں لائی جارہی ہے، گویا اصل مقصد فقہی احکام کا استنباط ہے۔ اسی بات کو امام ابن حجر عسقلانی مقدمہ فتح الباری میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''اتنی بات تو طے ہے کہ امام بخاری نے صحت کا التزام کیا ہے، مزید ان کے پیش نظر یہ بات بھی ہے کہ وہ اس مجموعہ کو فقہی فوائد سے خالی نہ چھوڑیں اور حکیمانہ نکتوں سے بھی اسے مزین کردیں چنانچہ امام بخاری نے اپنی فہم سے متن حدیث میں سے کئی معانی کا استنباط فرمایا جنہیں کتاب کے متفرق ابواب میں مختلف مناسبت سے بطور عنوان ذکر کردیا ہے، نیز ان آیات احکام کا بھی التزام کیا جن کا اس مسئلہ سے تعلق ہو اور آیتوں کی تفسیر کی جانب لطیف انداز سے اشارے بھی کردیئے، یہی وجہ ہے کہ امام نے کئی ایک جگہ پر ترجمۃ الباب باندھا اور اس کے تحت کوئی آیت ذکر کردی اور سند متصل سے کوئی حدیث نہ لاکر صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا **فیہ عن فلان عن النبی ﷺ** اور کبھی بغیر سند کے متن کا ٹکڑا بھی ذکر کردیتے ہیں۔'' (ج۱،ص۸)

المختصر امام بخاری کا صحیح کی تالیف سے اصل مقصود صحیح احادیث کو اس طرح جمع کرنا تھا کہ فقہی احکام اور معنی کی نشاندہی ہو جائے اور یہی وجہ ہے کہ صحیح بخاری کا قاری بین طور پر محسوس

کر سکتا ہے کہ امام بخاری مجتہد مطلق ہیں۔اسی لئے کسی مسئلہ میں ایک امام کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں تو کسی مسئلہ میں دوسرے امام کی رائے کو راجح قرار دیتے ہیں اور کبھی دونوں آراء پیش فرما کر کوئی تیسری رائے لاتے ہیں جو آئمہ میں سے کسی کی نہیں ہوتی بلکہ امام بخاری کی خود کی ہوتی ہے۔

پھر امام بخاری نے اپنی جامع الصحیح کو جس طرز پر تقسیم کیا ہے وہ نہ صرف ان کے تفقہ پر دلالت کرتا ہے بلکہ ساتھ ہی اپنے اندر بہت دلچسپی بھی رکھتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ امام بخاری نے تمام کتب وابواب کے درمیان ہم آہنگی ومناسبت کا بھرپور خیال رکھا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے ''بدء الوحی'' کی حدیث لائے ہیں جو کہ تمام تر شریعت اسلامی کی بنیاد ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ خاص کر یہ حدیث اپنے مکی استاد امام حمیدی سے لاتے ہیں گویا یہ بتلانا مقصود ہو کہ اسلام کی ابتداء وحی سے ہوتی ہے اور وحی کے اترنے کا پہلا مکان مکہ مکرمہ تھا سو میں بھی اپنی کتاب کو بدء الوحی سے شروع کر کے پہلی حدیث ایک مکی راوی سے لایا ہوں۔اس کے بعد ''کتاب الایمان'' کا باب لاتے ہیں کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی طاعت قبول نہیں، اس کے بعد ''کتاب الصلوٰۃ'' لائے جو کہ ایمان کے بعد پہلا فرض عمل ہے، پھر ''کتاب الزکوٰۃ'' کیونکہ قرآن میں صلوٰۃ وزکوٰۃ کا ساتھ ساتھ ذکر ہے۔بعض نسخوں میں ''کتاب الجنائز'' کتاب الزکوٰۃ سے پہلے ہے کیونکہ جنائز بھی صلوٰۃ سے ہی متعلق ہے۔اس کے بعد صوم اور حج۔عبادات سے فراغت کے بعد ان کتب کو ذکر کیا ہے جن کا تعلق معاملات سے ہے جیسے بیوع، سلم، اجارہ، ہبہ اور عتق وغیرہ۔اس کے بعد ان کتب کو ذکر کیا ہے جن میں انسانوں کے درمیان تنازع کی نوبت آتی ہے اور اولی الامر سے مدد لینی پڑتی ہے، چنانچہ کتاب الشہادت، صلح، وصیت، جہاد اور خمس کو ذکر فرمایا۔پھر کچھ اور کتب ذکر کی ہیں جن کا تعلق فقہی مضامین سے نہیں جیسا کہ بدء الخلق، ابواب الجنۃ والنار، کتاب الانبیاء، کتاب علامات النبوۃ، مناقب قریش، فضائل صحابہؓ، اس کے بعد مغازی اور پھر تفسیر۔ان ابواب سے فراغت کے بعد واپس فقہی مضامین کی طرف پلٹ کر نکاح، طلاق، نفقات کے ابواب قائم کرتے ہیں جن کی تکمیل کے بعد لوگوں کے شخصی معاملات کی طرف توجہ دیتے ہوئے اطعمہ، اشربہ، طب ومرضیٰ، ادب، بر وصلہ اور استیذان کے ابواب قائم فرماتے ہیں

اور مختلف احادیث کوابواب و کتب کی مناسبت سے مکرر نقل کرتے جاتے ہیں۔

اس کے بعد حقوق العباد سے متعلق ابواب لاتے ہیں جیسے کفارات، نذر وایمان، حدود اور اکراہ، پھر کچھ ایسے ابواب لاتے ہیں جن کا تعلق فی الجملہ ایمانیات اور عقیدے سے ہے جیسے کہ کتاب تعبیر الرویا، فتن، احکام، الاعتصام بالکتاب والسنۃ۔ پھر کتاب الزہد والرقاق کا ذکر کرتے ہیں۔ سب سے آخر میں کتاب التوحید لے کر آتے ہیں جس میں عقائد اور کلامی مسائل کے متعلق کلام کیا گیا ہے گویا یہ بتانا مقصود ہو کہ ایک مومن کو اپنے اعمال کی فکر کے ساتھ ساتھ ہمیشہ اپنے ایمان کی سلامتی کی فکر بھی لگی رہنی چاہیئے مبادا کسی کج روی کی بنیاد پر ایمان غارت ہو جائے اور سب کچھ دھرا رہ جائے۔

اس ہم آہنگی و مناسبت کا اس قدر خیال رکھا ہے کہ اپنی جامع صحیح کی شروعات ''انما الاعمال بالنیات'' سے کرتے ہوئے اس کا اختتام ''کلمتان خفیفتان'' پر فرمایا ہے گویا یہ بتلانا مقصود ہو کہ میں نے اپنے اس عمل کو خالص نیت کے ساتھ اللہ کی رضا کے لئے انجام دیا ہے تاکہ روز محشر میرا یہ عمل میزان میں تل کر بھاری ثابت ہو۔

المختصر امام بخاری کی پوری صحیح بخاری امام موصوف کے تفقہ فی الدین اور فقہ دانی پر شاہد ہے اور یہی وجہ رہی کہ کئی مسائل جیسے کہ فاتحہ خلف الامام اور رفع الیدین وغیرہ میں امام شافعی کی رائے کے موافق ہونے کے باوجود امام صاحب کئی مسائل میں ان سے اختلاف کر کے اپنی مجتہد مطلق کی حیثیت کو برقرار رکھتے ہیں اور یقین جانئے اگر امام بخاری کو امام محمد بن حسن شیبانی یا اسد بن فرات جیسے فقہ میں لائق شاگرد مل جاتے تو آج امام بخاری کی اپنی فقہ مروج ہوتی۔

حقیقت تو یہی ہے کہ متقدمین میں محمد نامی دو شخصیات ایسی ہیں جن کے تفقہ فی الدین پر اگر قسم کھالی جائے تو کبھی جھوٹی ثابت نہ ہو، ایک محمد بن اسمعیل المعروف امام بخاری اور دوسرے تلمیذ امام مالک و امام ابوحنیفہ امام محمد بن حسن شیبانی۔ ہر چند کہ ان دو شخصیات کی فقہ ایک دوسرے سے کافی حد تک مختلف الخیال و مسائل ہیں لیکن امام بخاری کی صحیح کے ترجمۃ الابواب اور امام محمد بن حسن شیبانی کی جملہ کتب کے مندرجات قاری کو سر دھننے پر مجبور کر دیتے

ہیں کہ کوئی فقہی مسائل واحکام کے استنباط میں اس قدر جزرس اور عبقری کیونکر ہوسکتا ہے۔آپ ایک حدیث سو دفعہ پڑھ لیں، آپ اس سے دو سے زیادہ مسئلے نہ نکال پائیں گے اور اسی ایک حدیث کو امام بخاری اپنی صحیح میں پانچ مختلف جگہ لاکر پوری شدومد سے پانچ مختلف مسائل پر استدلال کر جاتے ہیں۔اسی طرح سے امام محمد کی المبسوط ہو یا السیر الکبیر وصغیر ہو، الاصل ہو یا الزیادات ہر کتاب امام صاحب کی فقاہت پر دلالت کرتی ہے۔مسلم امہ بالعموم اور اہلحدیث و احناف بالخصوص ان دو شخصیات کے علمی احسانات کے بوجھ تلے رہتی دنیا تک دبے رہیں گے۔

امام ابوحنیفہؒ اور تفقہ فی الدین

متجددین تو جو کام کرتے ہیں وہ اس بابت معذور و مجبور ہیں کہ ان کا اصل مقصد ہی اخلاف کو اسلاف سے برگشتہ کر کے اسلاف کے ذریعے وارد ہوئے اسلامی ذخیرے کو غیر معتبر ٹھہرانا ہے لیکن افسوس اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب مسلکی تعصب کے زیرِ اثر اہلسنت سے تعلق رکھنے والے اصحاب ایک دوسرے کی ممدوح شخصیات پر طعن کرنے سے گریز نہیں کرتے۔خود اس احقر کے ایک دوست معترض ہوئے کہ علم الحدیث سے اشتغال رکھنے کے باوجود آپ امام ابوحنیفہ کے اس قدر مداح کیوں ہیں۔ہم نے عرض کیا کہ جناب جرح وتعدیل کے میدان میں کوئی ایسی شخصیت دکھادیجئے جن پر جرح موجود نہ ہو، سو اگر امام ابوحنیفہ پر کچھ محدثین کی جرح ملتی ہے تو اس سے ان کے علمی مقام و مرتبہ کا انکار کیونکر ممکن ہوسکتا ہے۔امام محمد بن اسحٰق بن یسار کو تو امام مالک جیسے محدث نے دجال وکذاب کہہ کر مجروح کیا، اس کے باوجود علماء کا ایک گروہ کثیر ان کی تعدیل کرتا نظر آتا ہے۔تو پھر یہ اصول امام ابوحنیفہ پر تو بدرجہ اولی لاگو ہونا چاہیے۔

دوست مزید معترض ہوئے کہ امام صاحب حدیث سے نابلد تھے، اس پر تو یہ احقر سر ہی پیٹ کر رہ گیا، بھلا دنیا میں مروج سب سے بڑی فقہ کا بانی جو کہ اتنی بڑی فقہ کی تدوین کا سامان کر گیا، وہ حدیث سے نابلد ہوسکتا ہے بھلا۔انسان کا کام اس کی پہچان ہوتا ہے اور امام ابو حنیفہ کی فقہ ان کی حدیث دانی کا منہ بولتا ثبوت ہے، باقی سہو تو ہر امام سے ہوئے ہیں سو امام

ابوحنیفہ اس سے مبرا کیونکر ہو سکتے ہیں۔

امام شعبہ کے تفقہ فی الحدیث کا کون معترف نہ ہوگا، شعبہ کو امام ابوحنیفہ سے ایک خاص تعلق تھا، ان کی غیر حاضری میں اکثر ان کی ذہانت اور خوبی فہم کی تعریف کرتے تھے، امام ابوحنیفہ کی تعدیل میں ان کا یہ قول زبان زد عام رہ چکا ہے کہ ''جس طرح میں جانتا ہوں کہ آفتاب روشن ہے، اسی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علم اور ابوحنیفہ ہم نشین ہیں۔''

امام یحییٰ بن معین سے ایک دفعہ کسی نے سوال کیا کہ آپ امام ابوحنیفہ کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں، ابن معین نے فرمایا کہ میرے لئے ابوحنیفہ کی تحسین کے لئے یہی بات کافی ہے کہ شعبہ نے انکو حدیث و روایت کی اجازت دی اور شعبہ آخر شعبہ ہی ہیں۔ (عقود الجمان)

البتہ یہ بات درست ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ محدث کے طور پر مشہور نہ ہو سکے لیکن اس سے یہ مطلب اخذ کرنا کہ امام صاحب حدیث میں کم مایہ تھے، سخت غلط استنباط ہوگا۔ چونکہ حدیث کی بہ نسبت فقہ میں امام صاحب کو کمال غالب تھا، سو ان کی مشہوری بھی اسی کے تحت ہوئی، خاص کر جب کہ امام ابوحنیفہ کی حدیث میں کوئی تصنیف بھی نہیں۔ لیکن اسی طور سے امام شافعی بھی محدث کے طور پر مشہور نہ ہو سکے بلکہ ان کی وجہ شہرت بھی فقہ ہی بنی تو کیا ان کے معاملے میں بھی حدیث میں کم مایہ ہونے کا الزام آئے گا۔ اصل بات یہی ہے کہ امام ابوحنیفہ و امام شافعی بحثیت فقیہہ زیادہ مشہور ہوئے، امام مالک بحثیت فقیہہ و محدث جبکہ امام احمد بن حنبل محدث کے طور پر شہرت پائے، اب کوئی اس سے یہ نتیجہ نکالے کہ امام احمد بن حنبل فقہ میں کم مایہ تھے تو شافعی و ابو حنیفہ احادیث سے نابلد تو ایسے صاحب کی تفقہ دانی پر سر ہی دھنا جا سکتا ہے۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ امام بخاری و مسلم نے امام صاحب سے کوئی روایت نہیں لی جب کہ امام صاحب کے تلامذہ سے کئی روایات لی ہیں جو کہ امام صاحب کے حدیث میں ضعیف ہونے پر دلالت کرتا ہے، تو ایسے اصحاب کی خدمت میں عرض ہے کہ امام بخاری و مسلم نے تو امام شافعی سے بھی کوئی روایت نہیں لی سو کیا اس قاعدے کی رو سے وہ بھی ضعیف ٹھہرائے جائیں گے۔

اگر امام ابوحنیفہ کے صرف تلامذہ کی فہرست پر ہی غور کرلیا جائے تو امام صاحب کے تفقہ فی الحدیث سے متعلق بہتر رائے قائم ہوسکتی ہے۔عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی،عبداللہ بن مبارک،ابونعیم فضل بن دکین،مکی بن ابراہیم،ابو عاصم النبیل وغیرہم امام ابوحنیفہ کے مشہور تلامذہ میں سے ہیں۔

اب کوئی یہ پوچھے کہ کیا وجہ ہوئی کہ ائمہ اربعہ میں سے صرف امام ابوحنیفہ پر محدثین کی جرح شدت سے ملتی ہے تو اس کی وجہ ہمارے نزدیک امام ابوحنیفہ کا اہل رائے کے لقب سے مشہور ہوجانا تھا،اور چونکہ محدثین کے ہاں رائے و قیاس کا استعمال مستحسن نہیں سمجھا جاتا تھا، اس وجہ سے اس لقب کی نسبت امام صاحب کے لئے بدگمانی کا باعث بنی۔ ہمارے اس خیال کو تقویت عبداللہ بن مبارک اور امام اوزاعی کے اس واقعہ سے بھی ملتی ہے کہ امام عبداللہ بن مبارک امام اوزاعی سے فن حدیث کی تکمیل کے لئے بیروت تشریف لے گئے۔امام اوزاعی کو جب پتہ چلا کہ ابن مبارک کوفہ سے تشریف لائے ہیں تو برجستہ پوچھا کہ کوفہ میں ابوحنیفہ کون شخص ہے جو دین میں نئی باتیں نکالتا ہے؟ عبداللہ بن مبارک نے کوئی جواب نہیں دیا اور گھر چلے آئے۔دو تین دن بعد دوبارہ امام اوزاعی کی خدمت میں حاضر ہوئے کچھ اجزاء ساتھ لیتے گئے،امام اوزاعی نے وہ اجزاء ان کے ہاتھ سے لے لئے۔ان اجزاء کے سرنامہ پر''قال نعمان بن ثابت'' لکھا تھا،امام اوزاعی ان کو بغور پڑھتے گئے پھر عبداللہ بن مبارک سے پوچھا کہ یہ نعمان بن ثابت کون شیخ ہیں؟ عبداللہ بن مبارک نے فرمایا کہ عراق کے ایک شخص ہیں جن کی صحبت میں رہا ہوں،امام اوزاعی نے فرمایا کہ بڑے پائے کے عالم ہیں۔عبداللہ بن مبارک نے عرض کیا کہ یہ وہی ابوحنیفہ ہیں جن کو آپ مبتدع بتاتے تھے،امام اوزاعی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اپنے قول سے یہ کہتے ہوئے رجوع کرلیا کہ بے شبہ میری بدگمانی غلط تھی،جس کا میں افسوس کرتا ہوں۔امام ابوحنیفہ سے ذاتی واقفیت کے بعد اس طور کی بدگمانی رفع ہونے کی مثالیں جناب باقر اور دوسرے اہل علم کے واقعات میں بھی ملتی ہے۔

الغرض ہمارے ناقص خیال میں جن جن محدثین و بزرگ حضرات کو امام صاحب کی

رفاقت وصحبت میسر رہی وہ امام صاحب کی جلالت قدری کے معترف رہے جن میں امام عبداللہ بن مبارک، امام اوزاعی، امام زفر، اور امام محمد بن حسن شیبانی جو کہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے مشترکہ شاگرد تھے، بلکہ انہوں نے امام ابوحنیفہ سے زیادہ امام مالک کی صحبت میں وقت گزارا تھا، وغیرہم شامل ہیں۔

رہی بات بعض محدثین کی امام ابوحنیفہ پر جرحیں تو اس طرح کی جرحیں اسماء الرجال کے علم میں عام ہیں، امام مالک کی جرح محمد بن اسحٰق بن یسار پر، امام احمد بن حنبل کی جرح امام اوزاعی پر اور بعض محدثین کی جرحیں عکرمہ مولی ابن عباس، محمد بن بشار بصری اور احمد بن صالح مصری پر، اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہیں اور ایسی جرحیں قطعی شخصیت پر طعن کا ذریعہ نہیں بنتی۔

المختصر امام ابوحنیفہ کا تفقہ فی الدین میں ایک اپنا مقام ہے۔ ان کی حدیث دانی کا انکار کرنا ناانصافی پر مبنی ہوگا، البتہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ علم الحدیث میں اگر امام ابوحنیفہ کی بات امام احمد بن حنبل کے معارض آئے گی تو امام ابوحنیفہ کی بات رد کرنے پر غور کیا جا سکتا ہے کہ امام احمد بن حنبل امیر المومنین فی الحدیث تھے، لیکن یاد رہے یہی اصول وہاں بھی لاگو ہوگا جہاں علم الفقہ میں امام احمد بن حنبل کی بات امام ابوحنیفہ کے معارض آئے گی کہ امام ابوحنیفہ کو فقہ میں وہی مقام حاصل ہے جو امام احمد بن حنبل کو حدیث میں۔

مسلکی تعصب اور شخصیات: قاضی ابو یوسف، امیر ہارون الرشید اور زبیدہ خاتون

پچھلے دنوں ایک تحریر پڑھنے کا اتفاق ہوا جس میں کبار حنفی مجتہد وفقیہ قاضی ابو یوسف، امیر المومنین ہارون الرشید جیسے علم دوست خلیفہ اور زبیدہ خاتون جیسی عابدہ و زاہدہ خاتون کو فضول فقہی حیلوں میں مشغول باور کروانے کی مذموم سعی کی گئی۔ امام ابو یوسف جیسا عبقری، امیر ہارون الرشید جیسا مخلص خلیفہ اور زبیدہ جیسی زاہدہ خاتون پر حیلہ بازی کی تہمت یوم قیامت پرسش کا سبب بن سکتی ہے۔ امام ابو یوسف کچھ بھی نہ کرتے، صرف ایک کتاب الخراج ہی لکھ جاتے وہی ان کی علمی عظمت اور نام کو کافی ہوتا۔ زبیدہ خاتون کا زہد اور رفاہ عامہ کے لئے ان

کے کام آج بھی تاریخ کی کتابوں میں ثبت ہیں جبکہ امیر ہارون الرشید جیسا علم الحدیث سے شغف رکھنے والا خلیفہ جو اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر بغداد سے مدینہ وارد ہوا کہ امام مالک سے ان کی موطا کا سماع کر سکے۔ خیر القرون کے ان اشخاص کی اس طرح کے بے اصل و بے سروپا قصوں کے تحت کردارکشی سخت غیر علمی طرز عمل ہے۔

ایسی لایعنی اور بے اصل تحاریر کو دیکھ کر نہایت افسوس ہوتا ہے کہ نجانے کب ہم میں سے مسلکی تعصب ختم ہوگا۔ ہماری اخلاقی حالت اس قدر دگرگوں ہو چکی ہے کہ ہمارے مدرسہ کا وہ طالبعلم جس نے درس نظامی کے چوتھے سال کی بھی ابھی تکمیل نہیں کی ہوتی، وہ پوری جرات و بیباکی سے امام ابو یوسف، امام محمد بن حسن شیبانی، امام ابن الجوزی، امام ابن تیمیہ اور ابن خلدون وغیرہم پر اپنی زبان دراز کر رہا ہوتا ہے۔ اور پھر حد تو یہ ہے کہ علم الحدیث کی باریکیوں سے بے خبری کے سبب ان علماء پر محدثین کی جرحیں نقل کر کے فرماتے ہیں کہ دیکھو محدثین نے امام ابو یوسف کو حدیث میں ضعیف بتلایا ہے تو امام محمد بن حسن شیبانی کو لائق احتجاج قرار نہیں دیا۔ اوہ میرے بھائی! محدثین کا کسی راوی کو ضعیف ٹھہرانے کا مطلب اس کے کردار یا علمی قابلیت میں شک نہیں بلکہ اخذ حدیث میں اس سے روایت لینے میں از حد احتیاط کا تقاضہ ہوتا ہے۔ امام مالک نے فرمایا تھا کہ مدینہ میں کتنے اصحاب ایسے ہیں کہ اگر ان کے زہد پر قسم کھائی جائے تو جھوٹی نہ ہو لیکن میں ان سے روایت حدیث میں تردد کرتا ہوں۔

واللہ میں آپ سے یہ نہیں کہتا کہ اپنے مسلک کے برخلاف آپ امام ابو یوسف کو محدث اعظم مانیں یا امام محمد بن حسن شیبانی کو محدث کبیر مانیں لیکن کم از کم ان کو ان کا جائز حق تو دیجئے، ان کا فقہ میں جو مقام ہے، بین الاقوامی قوانین کی تشکیل میں جو کردار ہے، ایک عظیم فقہی ذخیرے کے اجراء اور تدوین میں جو کاوشیں ہیں انکا اعتراف تو کیجیے۔ آج فریق مخالف امام بخاری کو فقیہ ماننے سے انکار کر دے تو آپ کی دینی غیرت و مسلکی حمیت سے برداشت نہیں ہوتا تو پھر آپ کیونکر دوسرے فریق کے کبار علماء کی تنقیص میں مستعد نظر آتے ہیں۔ ایک مومن کے لینے اور دینے دونوں کے پیمانے ایک سے ہونے چاہیئے۔ مجھے از حد یقین ہے کہ جو احباب امام

ابو یوسف یا امام محمد بن حسن شیبانی پر معترض ہوتے ہیں انہوں نے ان احباب کی کسی ایک کتاب کا بھی مطالعہ نہیں کیا ہوتا۔ منہج محدثین کا پیروکار ہونے کے باوجود میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ اگر ہمارے ایسے معترض احباب امام ابو یوسف کی صرف کتاب الخراج اور امام محمد بن حسن شیبانی کی صرف کتاب السیر کا مطالعہ کر جائیں تو ان کی فقاہت و علمیت کے قائل ہوئے بنا نہ رہ سکیں گے۔

یہی کچھ عرض ہمارے ان دوستوں سے بھی ہے جو اپنا وقت امام بخاری کہ عدم فقاہت اور امام ابن تیمیہ کے شذوذ کی اشاعت میں صرف کرتے ہیں۔ امام بخاری کی فقاہت کے لئے تو ان کی صحیح کے ترجمۃ الابواب ہی کافی ہیں، اس کے بعد کسی اور شاہد کی ضرورت نہیں پڑتی جبکہ امام ابن تیمیہ جیسے علماء کے بارے میں مستشرقین تک کہہ گئے کہ ایسے عبقری انسانیت کی تاریخ میں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

سو جناب! آپ احباب طالبعلم ہیں، سو طالبعلم ہی رہیں، قاضی و مفتی نہ بنیں کہ فتوی صادر فرمائے جارہے ہیں۔ آپ اپنی پوری زندگی میں دین اسلام کی وہ خدمت نہیں کر سکتے جو یہ علماء اپنی صرف ایک کتاب سے کر گئے۔ سو ان کو پڑھئے اور ان سے استفادہ کیجیے، نقد کا کام کبار علماء کے لئے رکھ چھوڑیئے۔

فقہی مذاہب اور خلفائے اسلام

وضعی روایات کے تحت عموماً یہ باور کروایا جاتا ہے کہ گویا پہلی صدی کے اختتام سے پہلے ہی عمالِ حکومت اور علمائے اسلام میں کافی بُعد پیدا ہو چکا تھا اور دونوں گروہ ایک دوسرے سے دوری بنائے رکھتے تھے۔ جبکہ درست تاریخی حقائق اس بات کی کلیتاً نفی کرتے ہیں۔ حدیث نبویﷺ پر مشتمل پہلی مدون کتاب موطا امام مالک کی بابت صاف تصریح موجود ہے کہ دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر المنصورؒ کے کہنے پر امام مالکؒ نے اس کی تدوین کا آغاز کیا تھا۔ حیات امام مالک ص ۴۳۲ میں علامہ ابو زہرہ مصری لکھتے ہیں کہ: امام مالک کا موطا جمع کرنا

ابوجعفر المنصور عباسی کے کہنے پر مبنی تھا جس میں انہوں نے امام مالک سے درخواست کی تھی کہ حدیث کی ایک ایسی کتاب مدون کیجئے جس میں نہ تو عبداللہ بن عمرؓ کے شدائد ہوں، نہ عبداللہ بن مسعودؓ کے شذوذ اور نہ ہی عبداللہ بن عباسؓ کی رخصتیں۔ اس میں اوسط امور اور وہ باتیں جس میں صحابہ کا اجماع ہے درج کیجئے۔ اس مشورے کی بابت ابن خلدون لکھتے ہیں کہ: امام مالک نے فرمایا: فواللہ لقد علمنی التصنیف یومئذ یعنی اللہ کی قسم (ابوجعفر المنصور نے) مجھے اسی وقت تصنیف کتاب کا طریقہ سمجھا دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امام مالک نے موطا کی تدوین مکمل کر کے اپنی کتاب عباسی خلیفہ ہارون الرشید عباسی کے سامنے پیش کی جس پر اس نے کتاب کی کافی تعریف کی اور تجویز سامنے رکھی کہ اس کو کعبہ میں لٹکا دیا جائے تا کہ تمام بلاد اسلامیہ میں اس مجموعہ حدیث کے تحت فقہ اسلامی پر عمل کروایا جا سکے، جس پر امام مالک نے علمی توسع کے پیش نظر ہارون الرشید کو ایسا کرنے سے منع فرمادیا۔

پھر یہ بات بھی غور کرنے لائق ہے کہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید اس کتاب کو پوری بلاد اسلامیہ کا فقہی ماخذ بنانے کی بات کرتے ہیں جس میں امام مالکؒ نے سیدنا معاویہؓ، سیدنا مروانؓ اور امیر عبدالملک بن مروانؒ جیسے اموی اساطین کے فتاویٰ اور تعامل درج کئے ہیں۔ گویا سیاسی اختلاف اپنی جگہ لیکن علمی طور پر بنوامیہ اور بنو عباس میں کوئی باہمی تعصب نہیں تھا کیونکہ دونوں ہی قرآن وسنت کو دین کا ماخذ ماننے کے دعویدار تھے۔ پھر چار عباسی خلفاء نے خود امام مالک سے موطا امام مالک کی سماعت کی یعنی امیر مہدی عباسی، امیر ہارون الرشید عباسی، امیر محمد الامین عباسی اور امیر عبداللہ المامون عباسی۔ علامہ سیوطی تاریخ الخلفاء ص۴۹۳ میں لکھتے ہیں کہ:

> ''قاضی فاضل نے ایک رسالے میں کہا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ کسی بادشاہ نے طلبِ علم کے لئے سفر کیا ہو سوائے ہارون الرشید کے۔ وہ اپنے دونوں فرزندوں الامین اور المامون کے ساتھ موطا کی سماعت کے لئے امام مالک کے پاس گیا۔ پھر کہتے ہیں کہ ہارون الرشید نے جس نسخے سے سماعت کی وہ مصریوں کے خزانے میں محفوظ تھا، پھر کہتے ہیں کہ اس کی سماعت کے لئے سلطان صلاح الدین ایوبی

نے اسکندریہ کا سفر کیا اور طاہر بن عوف سے اسکی سماعت کی۔ ایسے کسی تیسرے کو میں نہیں جانتا۔''

جس موطا کی تدوین و اشاعت عباسی دورِ حکومت میں ہوئی اس موطا میں امام مالک نے کئی جگہ کسی چیز کا سنت ہونا اموی خلیفہ عبدالملک کے طرز عمل کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ مثلاً کہا ہے کہ فلاں چیز سنت ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اہل علم نے عبدالملک بن مروان کو اس طرح کرتے دیکھا ہے۔ گویا امام مالک نے عبدالملک بن مروانؒ کے طرز عمل کو سنت کی دلیل قرار دیا۔ امیر عبدالملک بن مروانؒ سیرت سے متعلق معلومات کے لئے اکثر و بیشتر عروہ بن زبیرؓ کو سوالات بھیجا کرتے تھے اور عروہ ان سوالات کا تفصیلی جواب دیا کرتے تھے۔ عبدالملک کے خطوط اور عروہ کے جوابات آج بڑی حد تک محفوظ ہیں۔ ان میں سے بہت سے سوالات و جوابات امام طبری نے اپنی تاریخ میں مکمل سند کے ساتھ نقل کئے ہیں۔ اس کے علاوہ واقدی، ابن سعد اور دوسرے مورخین کے ہاں بھی عبدالملک اور عروہ کے یہ سوالات و جوابات مل جاتے ہیں۔ جبکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عروہ بن زبیرؓ کے بھائی سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ امیر عبدالملک بن مروانؒ کے ساتھ حکومتی کشمکش کے نتیجے میں شہید ہوئے تھے، اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ان سیاسی اختلاف کو نہ عبدالملک بن مروانؒ نے کبھی علم کی جستجو میں آڑے آنے دیا اور نہ عروہ بن زبیرؓ نے ان کو بنیاد بنا کر کتمانِ علم کیا۔

۱۹۸۰ء میں ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے مغازی عروہ بن زبیر کو تلاش و بسیار کے بعد تحقیق کر کے ایک کتابی شکل میں چھاپا تھا۔ اس کتاب میں عبدالملک اور عروہ کے یہ سوالات و جوابات من وعن اسی طور سے موجود ہیں جیسا کہ طبری اور ابن سعد وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ مغازی عروہ بن زبیر جو کہ ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی کی تحقیق سے منصۂ شہود پر دوبارہ آسکی، بشرط صحت، سیرت کی سب سے اوّل موجود کتاب ہے۔

اسی طرح جب یحییٰ مصمودی موطا امام مالک کو لے کر مغرب گئے تو وہاں اموی حکومت کی سرپرستی میں موطا کو مقبولیت نصیب ہوئی اور یوں مالکی فقہ ان علاقوں کا دستور قرار

پایا۔گویا مشرق کے عباسی ہوں یا مغرب کے اموی، سب سیاسی اختلافات کے باوجود ایک دین کے پابند تھے۔جس طرح عباسیوں نے موطا میں سیدنا مروان اور امیر عبدالملک بن مروان کے فتاویٰ کو دین کی بابت حجت باور کیا، اسی طرح مغرب کے اموی امراء نے بھی اس کا خیال نہیں کیا کہ موطا کی تدوین عباسیوں کی زیر پرستی اور تجویز کے تحت ہوئی ہے۔اسی طرح سے امام شافعی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب الام کی ج ۴، ص ۱۵۸ میں دیوان فاروقی کے سلسلے میں امیر المومنین سیدنا معاویہؓ کے ساتھ ساتھ عباسی خلیفہ المہدی عباسی کا تعامل بھی بطور نظیر شرعی درج فرمایا ہے۔یہی نہیں بلکہ امام ابوحنیفہ کے شاگرد کبیر جناب امام ابو یوسف کو خلافت عباسیہ میں جو مقام و مرتبہ حاصل تھا وہ کس سے مخفی ہے کہ دولت اسلامیہ کے پہلے قاضی القضاۃ مقرر کیے گئے۔بقول علامہ ابوزہرہ مصری کہ خلافت عباسیہ کا استحکام بھی ایک سبب تھا فقہ حنفی کی اشاعت اور فروغ میں۔(حیات ابوحنیفہ للمولف ابوزہرہ مصری)

بعینہ اسی طور سے امام شافعی اور امام احمد کے مذاہب کو بھی مکمل فروغ اس وقت حاصل ہوا جب کہ عباسی خلفاء نے ان کی سرکاری حیثیت کو تسلیم کرلیا۔امیر القادر باللہ عباسی فقہ شافعی کے ائمہ میں سے تھے اور ساتھ ہی ایک اور عباسی خلیفہ امیر المسترشد باللہ جو کہ عمدۃ الدنیا و الدین کہلاتے تھے وہ بھی فقہ شافعی کے پیروکار تھے اور ان کے اسی لقب کی مناسبت سے امام ابو بکر الشاشی نے اپنی کتاب العمدۃ تحریر کی تھی۔(طبقات الشافعیہ الکبریٰ، ج ۴، ص ۲۹۱)۔ امام شافعی اور امیر ہارون الرشید عباسی کے کافی قریبی تعلقات کا مورخین و فقہاء نے ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ ہارون الرشید امام مالک کے ساتھ ساتھ امام شافعی کا بھی کافی معتقد تھا۔اسی طرح سے مامون اور مابعد کے معتزلی عباسیوں کے ظلم کے بعد جب متبع سنت عباسی خلیفہ جعفر المتوکل علی اللہ عباسی برسراقتدار آیا تو نہ صرف اس نے امام احمد کو خلق قرآن کے مسئلہ کی بابت صعوبتوں سے مکمل نجات دلوائی بلکہ ان کا مخلص معتقد رہا۔یہی وجہ رہی کہ مابعد کے ادوار میں آنے والے عباسی خلیفہ امیر الناصر الدین باللہ اور امیر المستضی باللہ نے حنبلی مذہب اختیار کر کے اپنے عہد حکومت میں اس کی اشاعت کی۔الغرض ایسا قطعی نہیں تھا کہ خلفائے اسلام اور

علمائے اسلام میں کوئی مشرق ومغرب کا بُعد تھا بلکہ ہمارے اکثر خلفاء وعمال امورِ دین کے ماہر بھی ہوتے تھے۔محمد بن قاسم جب سندھ فتح کرنے آئے تو اس وقت علوم الاسلامیہ کی کافی شد بد رکھتے تھے اور جس حجاج بن یوسف نے انہیں سندھ فتح کرنے بھیجا اس کی قرآن فہمی اور ذوقِ قرآنی سے کس کومجال انکار کہ قرآن کی رکوعوں میں تقسیم اور ان پر حرکات لگوانے کا کام حجاج نے ہی کروایا تھا۔اسی طرح الجوہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ میں یہ تصریح ہے کہ سلطان محمود غزنوی فقہ میں کافی درک رکھتے تھے اور کئی فقہی مسائل کی تنقیح ان سے ثابت ہے۔ایسا ہی کچھ معاملہ سلطان صلاح الدین ایوبی کا تھا جنہوں نے طاہر بن عوف سے موطا کی سماعت کے لئے اسکندریہ کا سفر کیا۔المختصر اسلامی تاریخ کے بیشتر خلفاء و امراء اور سلاطین عام طور پر اصحاب علم و فضل تھے جن کی زندگی علم سیاست کے ساتھ ساتھ علم دوستی میں بھی صرف ہوئی۔

امام ابوحنیفہؒ اور زید بن علی کا خروج

تاہم بعض خلفاء اور علمائے وقت کے مابین اختلافات اور باہمی نزاعات کے واقعات بھی ملتے ہیں جن سے ہمیں مجال انکار نہیں، تاہم ایسے واقعات کافی کم ہیں اور چند علماء تک ہی محدود ہیں۔جیسے امام احمد بن حنبل اور معتزلی خلیفہ مامون عباسی کا اختلاف جس کی پاداش میں امام احمد بن حنبل کو سخت صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس طرح کے کئی واقعات جھوٹے راویوں نے گھڑ کر ان جلیل القدر ائمہ کے سر منڈھ دیئے ہیں۔جس میں سے ایک مشہور واقعہ حکومتِ وقت کے خلاف کی گئی بغاوتوں کو امام ابوحنیفہ کی تائید حاصل ہونا ہے۔ابو بکر جصاص جو کہ اپنے معتزلی اور شیعی نظریات کے لئے معروف ہیں، نے اپنی تفسیر کی ج اوّل، ص ۸۱ پر دعویٰ کیا ہے کہ زید بن علی بن حسین نے جب ۱۲۲ ہجری میں ہشام بن عبدالملک کے خلاف خروج کیا تو امام ابوحنیفہ کی پوری ہمدردی ان کے ساتھ تھی، انہوں نے زید کو مالی مدد بھی دی اور لوگوں کو ان کا ساتھ دینے کی تلقین بھی کی (احکام القرآن، ج ۱، ص ۸۱)

مقامِ حیرت ہے کہ امام ابوحنیفہ نے صرف مالی مدد اور تلقین پر ہی کیوں اکتفاء کیا،

پورے طریقے سے مسلح جہاد کیوں نہ کیا حکومتِ وقت کے خلاف زید بن علی کے ساتھ مل کر۔ یہاں تک کہ سید مودودی نے تو خلافت و ملوکیت میں یہاں تک لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے ہشام بن عبدالملک کے خلاف خروج کو جنگِ بدر میں نبی ﷺ کے خروج سے تشبیہہ دی۔ شاید سید مودودی کو خود بھی یہ احساس ہوا ہو کہ ایسا خروج جو جنگِ بدر سے مماثل ہو، اس میں مسلح شرکت نہ کرنے کی بناء پر لوگ امام ابوحنیفہ کی طرف اس تائید کی نسبت کو وضعی و غیر ثابت باور کر سکتے ہیں سو انہوں نے آگے یہ خود بیان کر دیا کہ جب زید کا پیغام امام ابوحنیفہ کے نام آیا کہ آپ میرا ساتھ دیں تو انہوں نے قاصد سے کہا کہ اگر میں جانتا کہ لوگ ان کا ساتھ نہ چھوڑیں گے اور سچے دل سے ان کی حمایت میں کھڑے ہوں گے تو میں ضرور ان کے ساتھ ہوتا اور جہاد کرتا کیونکہ وہ امامِ حق ہیں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ لوگ اسی طرح زید سے بے وفائی کریں گے جس طرح ان کے دادا (سیدنا حسینؓ) سے کر چکے ہیں، البتہ میں روپے سے ان کی مدد کروں گا۔ (بحوالہ المکی، ج ۱، ص ۲۶۰)

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کی جانب اس خروج کی حمایت کی نسبت ہی سخت غیر معتبر ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے سیرۃ النعمان میں اس واقعہ کو من گھڑت قرار دیا ہے جبکہ شاہ عبدالعزیز صاحب بھی تحفۂ اثناعشریہ میں اس حکایت کو غیر صحیح اور خلافِ واقعہ قرار دیتے ہیں۔ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

> ''جس قدر تاریخی اور رجال کی کتابیں ہمارے سامنے ہیں، ان میں کہیں اس کا ذکر نہیں حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو ایک قابلِ ذکر واقعہ تھا۔ زید بن علی نے ۱۲۱ ہجری میں بغاوت کی تھی، اس وقت ہشام بن عبدالملک تختِ خلافت پر متمکن تھا۔ ہشام اگرچہ کفایت شعار اور بعض امور میں نہایت جزرس تھا لیکن اس کی سلطنت نہایت امن و امان کی سلطنت تھی۔ ملک میں ہر طرف امن و سکون کا سکہ بیٹھا ہوا تھا، رعایا عموماً رضامند تھی۔ بیت المال میں ناجائز آمدنیاں نہیں داخل ہو سکتی تھیں، اس حالت میں امام ابوحنیفہ کی مخالفت کی کوئی وجہ نہ تھی۔" (سیرۃ النعمان، ص ۴۰)

ساتھ ہی یہ بات بھی قابلِ غور اور اس روایت کے من گھڑت ہونے پر دلالت کرتی ہے کہ ائمہ احناف بشمول امام ابوحنیفہ بلکہ جمہور ائمہ مجتہدین کا مسلک اس روایت کے خلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ کا مسلک جو تواتر کے ساتھ ان سے منقول ہے اور جو صرف ان کا نہیں بلکہ ائمہ اربعہ اور جملہ مجتہدین فقہاء و محدثین علماء اہلسنت کا مسلک ہے عقیدۃ الطحاویہ میں اس طرح مذکور ہے:

ولا نری الخروج علیٰ ائمتا و ولاۃ امورنا و ان جاروا ولاندعوا علیھم ولا ننزع یدامن طاعتھم من طاعۃ اللہ فریضۃ مالم یا مروا بمعصیۃ و ندعولھم بالصلاح و المعافاۃ (ص۵۰)

یعنی ''اور ہم اپنے ائمہ (سربراہانِ مملکت) اور حکام کے خلاف خروج کو جائز نہیں سمجھتے اگرچہ وہ ظلم کریں اور ہم انہیں بددعا دینا (بھی جائز نہیں سمجھتے) اور ان کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لینا بھی جائز نہیں سمجھتے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کے تقاضے سے ہم ان کی اطاعت کو اس وقت تک فرض سمجھتے ہیں جب تک وہ کسی معصیت کا حکم نہ دیں اور ہم ان کے لئے صلاح اور معافاۃ کی دعا کرتے ہیں۔''

یہ ہے امام ابوحنیفہ اور جمہور اہلسنت کا مسلک جو تواتر کے ساتھ ان سے منقول اور کتبِ فقہ و عقائد میں مسطور ہے۔ فقہ حنفی کی مشہور و معتبر کتاب ردالمختار المعروف بہ شامی باب البغاۃ میں علامہ ابن عابدین شامی مسلکِ احناف نقل کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

و اذا ولی عدلاً ثم جار و فسق لا ینعزل و لکن یستحق العزل ان لم یستلزم فتنۃ

یعنی ''اگر کسی عادل کو خلیفہ بنایا گیا پھر وہ ظلم و فسق کا مرتکب ہوا تو معزول نہیں ہوجاتا لیکن عزل کا مستحق ہوجاتا ہے بشرطیکہ اس کا معزول کرنا کسی فتنہ کا سبب نہ بنے۔''

اسی طرح الفقہ الاکبر عقائد کی مشہور و معروف کتاب ہے۔ اس کے بارے میں مشہور

تو یہ ہے کہ یہ امام ابوحنیفہ کی تصنیف ہے لیکن بعض اہل علم بشمول علامہ شبلی نعمانی نے اس کا انکار کیا ہے تاہم یہ بات متفق علیہ ہے کہ یہ عقائد اہلسنت خصوصاً ماتریدیہ واحناف کے عقائد کی معتبر ترین کتاب ہے۔ اس میں امام ابوحنیفہ اور دیگر ائمہ مجتہدین کے مسلمہ عقائد ونظریات بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں مذکور ہے:

و یجوز الصلوۃ خلف کل برو فاجر

یعنی ''صالح اور فاجر دونوں کی اقتداء میں صلوٰۃ جائز ہے۔''

گویا جب فاجر کی اقتداء میں صلوٰۃ جائز ہے تو بدرجہ اولیٰ اس کی امارت بھی جائز ہوگی، وہ الگ بات ہے کہ مومن اس سے کراہت کریں۔

پھر عجیب تر بات یہ کہ زید بن علی نے امام ابوحنیفہ کے پاس قاصد بھیج کر ان کو خروج میں اپنی تائید کرنے کو کہا جب کہ یہ بات معروف ہے کہ زید بن علی کے خروج کے وقت تک امام ابوحنیفہ کو فقیہ اہل مشرق ہونے کا مرتبہ اور اثر و رسوخ حاصل نہ ہوا تھا اور ۱۲۰ ہجری میں جس وقت زید اپنے خروج کی تیاریاں شروع کر رہے تھے اس وقت امام ابوحنیفہ کی حیثیت امام حماد کے ایک شاگرد کی تھی۔ پھر کیا وجہ ہوئی کہ زید بن علی نے امام حماد کو چھوڑ کر ان کے شاگرد کو خروج میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ زید بن علی فقیہ اہل مشرق امام حماد کو قاصد بھیج کر خود کے ساتھ شریک ہونے کی دعوت دیتے۔ لیکن اس روایت کو وضع کرنے والے راویوں کے حاشیۂ خیال میں یہ بات نہ آئی اور انہوں نے امام حماد کی جگہ امام ابوحنیفہ کا نام لے لیا وہ بھی ایسے وقت میں جب امام صاحب کو نہ فقیہ اہل مشرق ہونے کا مرتبہ حاصل ہوا تھا اور نہ ان کا کوئی اثر و رسوخ تھا۔ پھر اگر واقعی ایسا ہوا بھی ہوتا تو امام ابوحنیفہ جب کہ ابھی امت میں ان کو وہ مقام حاصل نہ ہوا تھا جو بعد میں ان کو مل سکا تو زید کے خروج کی حمایت میں ان کی رائے کس کام کی ہوتی۔ پھر جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ امام صاحب خلیفۂ وقت کے خلاف خروج کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ سلطان ابوالمظفر عیسیٰ بن ایوب الملک امام ابوحنیفہ کا اس متعلق امام ابوحنیفہ کا مسلک و مذہب بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

لا نری الخروج علیٰ ائمتا و ولاۃ امورنا ان جارود ا علینا (السھم المصیب فی الرد علی الخطیب، ص ۴۷)

یعنی ''ہم اپنے ائمہ اور حاکموں کے خلاف خروج و بغاوت کو جائز نہیں سمجھتے اگر چہ وہ ہم پر ظلم ہی کیوں نہ کریں۔''

اس کے بعد سلطان ابوالمظفر فرماتے ہیں: فمن یکون ھٰذا رایہ کیف یری الخروج علی الائمۃ یعنی جس شخص کا نظریہ یہ ہوگا وہ خلفاء کے خلاف خروج کو کب جائز سمجھے گا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب مواقفِ صحابہ پر مبنی تھا جس کی تعلیم آپ نے صحابہ اور امت کو دی تھی۔ صحیح مسلم کتاب الامارۃ کی روایت ہے:

حدثنا احمد بن عبدالرحمٰن بن وھب بن مسلم، حدثنا عمی عبداللہ بن وھب، حدثنا عمرو بن العارث، حدثنی بکنیز، عن بسر بن سعید، عن جنادۃ بن ابی امیۃ، قال: دخلنا علی عبادۃ بن الصامت وھو مریض، فلقنا: حدثنااضلعک اللہ، بعدیث ینفع اللہ بہ سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فقال: دعانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبا یعناہ، فکان فیما اخذ علینا: ان بایعنا علی الشمع والطاعۃ فی منشطنا فی، مکرھنا، وغسرنا ویسرنا، واثرۃ علیننا، وان ننازع الامر اھلہ، قال: الا ان ترو اکفر ابواحاعند کم من اللہ فیہ برھان.

''جنادہ بن ابی امیہ سے روایت ہے، کہا: ہم عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے، وہ (اس وقت) بیمار تھے، ہم نے عرض کی: اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے، ہم کو ایسی حدیث سنایئے جس سے ہمیں فائدہ ہو اور جو آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہو، (سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے) کہا: رسول اللہ ﷺ نے ہم کو بلایا، اور ہم سے بیعت لی۔ آپ ﷺ نے جن امور پر بیعت لی وہ یہ تھے کہ ہم حکام کا حکم سنیں اور اطاعت کریں خواہ ہمیں پسند ہو یا نہ

ہو، اس سے تنگی ہوتی ہو یا فراخی یا ہمیں ایثار سے کام لینا پڑے اور یہ کہ ہم حاکموں سے نزاع نہ کریں سوائے اس کے کہ تم ایسا کفر بواح دیکھو (جس سے خون حلال ہو جاتا ہے) اور اللہ کی طرف سے تمہارے پاس اس بارے میں حجت ہو۔ (صحیح مسلم، کتاب الامار، حدیث ۴۸۸۱)

اسی طرح سیدنا وائل بن حجر سے روایت ہے کہ سلمہ بن یزید جعفی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا:

یا نبی الله! رایت ان قامت علینا امراء یسئلونا حقهم و یمنعونا حقنا فماتا مرنا؟ قال اسمعوا و اطیعوا وانما علیهم ما حملوا و علیکم ما حملتم (مسلم۔ کتاب الامارۃ)

''اے اللہ کے نبی ﷺ! اگر ہم پر ایسے امیر مسلط ہوں جو ہم سے اپنا حق تو مانگیں لیکن ہمیں ہمارا حق نہ دیں تو ایسی صورت میں ہمارے لئے کیا حکم ہے؟ فرمایا: "ان کی بات سنو اور اطاعت کرو۔ ان کی ذمہ داری کا وبال ان پر ہے اور تمہاری ذمہ داری (سمع واطاعت) کا تم پر۔''

نیز فرمایا:

من رایٔ من امیره شیاً یکرهه فلیصبر فانه لیس احد یفارق الجماعة شبراً فیموت الامات میتة جاهلیه (متفق علیہ) (بخاری، کتاب الاحکام)

''جو شخص اپنے امیر میں ناپسندیدہ فعل دیکھے تو چاہیے کہ صبر کرے کیونکہ جو کوئی جماعت سے بالشت بھر بھی جدا ہوا اور مر جائے تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔''

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

عن ابی هریره عن نبی ﷺ قال: من خرج من الطاعة و فارق الجماعة فمات مات میتة جاهلیه و من قاتل تحت رایة عمیة بغضب العصبیة او یدعو الی عصبیة او ینصر عصبة فقتل فقتلة

جاھلیۃ (مسلم، کتاب الامارۃ)

''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص امیر کی اطاعت سے اور مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہوا۔ پھر مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا اور جو شخص کسی اندھے (نشان) کے تحت لڑائی کرے۔ عصبیت کے لئے غصہ دلائے یا عصبیت کے لئے بلائے یا عصبیت کے لئے مدد کرے پھر قتل کیا جائے تو وہ بھی جاہلیت کی موت مرا۔''

ان تمام روایات کی موجودگی میں امام ابوحنیفہ کے لئے یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ ہشام بن عبدالملک کے خلاف زید بن علی کے خروج میں ان کی حمایت کر کے معصیت کبیرہ کے مرتکب ہوتے۔ پھر مقامِ حیرت ہے کہ امام ابوحنیفہ کے منہ سے زید بن علی کے خروج کو جنگِ بدر کے مماثل قرار دیا جا رہا ہے۔ استغفر اللہ۔ جناب زید بن علی کی اس بغاوت کو جس کو شرعاً کسی طور سے جائز نہیں کہا جا سکتا جو کہ مسلمانوں کے اس وقت کے متفق علیہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے خلاف برپا کی گئی اور جس کا مقصد صرف حصولِ اقتدار کے سوا اور کچھ نہ تھا، غزوۂ بدر سے تشبیہ دینا جس کا واحد مقصد اعلاء کلمۃ اللہ تھا جو کافروں کے مقابلے میں تھا، جہاد فی سبیل اللہ کی توہین اور شریعت اسلامیہ کی تضحیک ہے۔ اس تشبیہ کا دوسرا مکروہ پہلو یہ ہے کہ جس مبارک جنگ کے شرکاء امت کے افضل ترین افراد اور اللہ تعالیٰ کے وہ عباد مخلصین تھے جن کا مقبول عند اللہ ہونا قطعی و یقینی ہو اور جس جنگ کے سپہ سالار افضل الخلائق سید الانبیاء نبی ﷺ ہوں، اس کی برابری کوئی جنگ نہیں کر سکتی۔ جناب زید بن علی کے خروج کو اس کے برابر و مشابہ قرار دینا سخت بے ادبی اور گستاخی ہے جس کا تصور بھی امام ابوحنیفہ جیسی ذی علم و متقی شخصیت سے کرنا محال ہے۔ اگر ہم زید بن علی کو ولی کامل بھی تسلیم کر لیں تو بھی ان کے ایسے سینکڑوں مل کر بھی کسی ادنیٰ صحابی کی خاکِ پاء کی برابری نہیں کر سکتے چہ جائیکہ ان کے خروج کو اس جنگ سے تشبیہ دینا جس میں نبی ﷺ بنفس نفیس شریک ہوں اور امت کی افضل ترین جماعت یعنی جماعتِ صحابہ رضوان اللہ اجمعین شاملِ جہاد ہو۔ یہ صرف صحابہ کرامؓ کی شان میں نہیں بلکہ خود نبی ﷺ کی شان میں

بھی صریح گستاخی اور توہین ہے۔ امام ابوحنیفہ اس شنیع قول سے قطعی بری ہیں اور ان کی جانب اس قول کی نسبت ان پر افتراء و بہتان ہے۔ اور اگر یہ قول امام ابوحنیفہ سے درست ثابت ہو تو خود امام صاحب کی وثاقت و مرتبہ کو صفر کرنے کو کافی ہے۔ اگر نعوذ باللہ من ذالک امام ابوحنیفہ نے زید بن علی کے خروج کو غزوۂ بدر کا مماثل سمجھا تھا اور وہ انہیں امامِ حق سمجھتے تھے تو دو باتوں میں سے ایک بات انہیں کرنی چاہیے تھی۔ یا تو زید کا ساتھ دے کر بزعم خویش سیدنا ابوبکرؓ و عمرؓ کی سی فضیلت حاصل کر لیتے یا انہیں سمجھاتے کہ اوّل وسائل مہیا کریں، رائے عامہ کی حمایت حاصل کریں اور مناسب وقت کا انتظار کر کے خروج کریں جب کامیابی یقینی نظر آئے۔ ان دونوں باتوں میں سے امام صاحب نے کسی بھی بات پر عمل نہ کیا تو یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ لوگوں کو زید کا ساتھ دینے کی تلقین کرتے تھے اور روپے سے زید کی مدد کرتے تھے۔

امام ابوحنیفہ اور ائمہ شیعہ کی شاگردی

پھر اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ یہاں تک دعویٰ کیا گیا کہ اہلسنت کی سب سے بڑی مروجہ فقہ یعنی فقہ حنفی اہل تشیع کے اماموں کی شاگردی کا شاخسانہ ہے کیونکہ فقہ حنفی کے بانی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ نے اکتساب علم جناب محمد الباقر، ان کے فرزند جناب جعفر الصادق اور جناب زید بن علی بن الحسین سے کیا ہے۔ یہ ایک ایسی لغو بیانی ہے جس کی تائید کسی صحیح السند تاریخی روایت سے نہیں ہوتی۔ کتب اسماء والرجال میں امام ابوحنیفہ کے اصل شیوخ میں کہیں بھی ان حضرات کا نام نہیں آتا۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ اس بابت منہاج السنۃ، ج ۴، ص ۱۴۳ میں لکھتے ہیں:

> ''یہ ایک ایسا جھوٹ ہے جسے ادنیٰ علم کا آدمی بھی جانتا ہے، کیونکہ ابوحنیفہ تو جعفر صادق کے ہم طبقہ ہیں۔ جناب جعفر الصادق کی وفات ۱۴۸ ہجری کی ہے جبکہ امام ابوحنیفہ نے ۱۵۰ ہجری میں وفات پائی۔ ابوحنیفہ تو صادق کے والد ابوجعفر محمد الباقر کے زمانے میں فتوی دیا کرتے تھے اور ایسی کوئی بات معروف نہیں کہ امام ابوحنیفہ

نے جعفر الصادق یا ان کے والد سے کوئی ایک مسئلہ بھی لیا ہو، بلکہ انہوں نے علم ان بزرگوں سے حاصل کیا جوان دونوں سے زیادہ معمر تھے جیسے عطا بن ابی رباح اوران کے اصل استاد حماد بن ابی سلیمان۔''

پھر بات یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ اوران کے اساتذہ کا علمی وفقہی معیار کافی بلند تھا جبکہ جناب جعفر الصادق کا نام دور خیر القرون میں بعض احادیث کی روایت میں تو ملتا ہے لیکن ان کی فقہ کا کوئی وجود اس زمانے میں نظر نہیں آتا، اسی لئے جسے فقہ جعفری کہا جاتا ہے اس کا ذکر چوتھی صدی ہجری میں اس وقت سامنے آیا جب بویہی شیعہ حکومت نے پر پرزے نکالے اوراس وقت چند اختراعی ووضعی قوانین کو جناب جعفر کی طرف منسوب کر کے فقہ کے نام پر رواج دیا جانے لگا۔ اس سے پہلے جناب جعفر کا نام نہ تو کسی فقیہہ کے طور پر ملتا ہے اور نہ ہی ان کی فقہ کا کوئی محدث و فقیہہ ذکر کرتا ہے۔اسی بات کوامام ابن حزم اپنی کتاب **الملل و النحل** ،ج ۴،ص ۳۹ میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

''سیدنا ابن عباس رض نے اپنی فقہ بیس کتابوں میں جمع کی ہے اور اگر تلاش کیا جائے تو ان کی احادیث بھی قریب قریب اسی حد تک پہنچے گی، حالانکہ حسن وحسینؓ کی فقہ دو ورق تک بھی نہیں پہنچتی۔ یہی حال جناب علی بن حسین بن علی کا بھی ہے۔محمد بن علی (الباقر) کی حدیث اور فقہ ایک چھوٹے سے جز تک پہنچتی ہے اور اسی طرح جناب جعفر الصادق کی بھی۔ حالانکہ روافض کا دعوی یہ ہے کہ امام کے پاس شریعت کا کل علم ہوتا ہے۔جعفر الصادق کے بعد تو ہمیں ان آئمہ کے علم کا بالکل پتہ ہی نہ چلا۔ نہ حدیث میں، نہ فقہ میں، باوجود یکہ ان لوگوں کا زمانہ ہمارے زمانے کے قریب ہے۔''

الغرض امام ابوحنیفہ کا سارا اکتساب علم جلیل القدر اصحاب رسول ﷺ کے تلامذہ سے تھا جیسے کہ عطا بن ابی رباح جو کہ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ کے تلمیذ تھے جبکہ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کا علم امام صاحب نے امام حماد بن ابی سلیمان سے حاصل کیا تھا، سوامام صاحب کو ہم عصر علوی

حضرات سے اکتساب علم کی قطعی حاجت نہ تھی اور نہ ہی ان کو اس کا موقع ملا، کیونکہ امام صاحب کی بیشتر زندگی کوفہ میں گزری جبکہ مقدم الذکر علوی حضرات کا قیام مدینہ میں رہا جہاں امام صاحب کا آنا صرف حج کے مواقع پر ہی ہوتا تھا۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ امام ابوحنیفہ کی جناب محمد الباقر یا جناب جعفر الصادق سے ملاقاتیں ہی نہ رہی ہوں گی، قرین قیاس ہے کہ ان اصحاب سے امام ابوحنیفہ کی صحبتیں رہی ہوں، علمی مذاکرات بھی ہوئے ہوں کہ جب امام صاحب زیارت مسجد نبوی ﷺ کی غرض سے مدینہ آتے ہوں تو ان اصحاب سے ملتے ہوں۔ یقیناً ایک دوسرے کی تکریم بھی ہوتی ہوگی جو کہ اہل علم کا شعار ہے، لیکن اس کے یہ معنی کیسے ہوگئے کہ امام صاحب نے اپنے ان ہم عصر حضرات سے اخذ علم کیا اور اس تعلق سے امام ابوحنیفہ کی پوری فقہ دنیائے شیعیت سے مستعار لی گئی ہے۔

پھر امام مالک جو کہ سوائے حج کے ساری زندگی مدینہ سے باہر نہ نکلے، اور جن کی شائد روزانہ ہی جناب جعفر الصادق سے ملاقات بھی ہوتی ہوگی لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ موطا امام مالک میں جناب جعفر الصادق سے صرف چند ہی روایات آتی ہیں، جبکہ اسی جگہ سیدنا مروانؓ اور ان کے لائق و عالم فرزند عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ کی مرویات و فتاوی کثرت سے موطا میں پائے جاتے ہیں۔ گویا جب مدینہ میں رہتے ہوئے جناب جعفر الصادق کے علم کا کوئی خاص اثر امام مالک کی فقہ پر نہیں پڑسکا تو کوفہ میں موجود امام ابوحنیفہ کی فقہ کو جناب جعفر الصادق کے علم کا مرہون منت گردانا چہ معنی دارد۔

خود اہل تشیع کے معتبر عالم قاضی نوراللہ شوستری جن کو شیعہ ''شہید ثالث'' کا لقب دیتے ہیں اپنی کتاب مجالس المومنین میں اعتراف کرتے ہیں کہ امام ابوحنفیہ کو اکتساب علم میں جناب جعفر الصادق سے کوئی ''خاص فیض'' حاصل نہ ہوسکا:

> ''امام جعفر الصادق سے ابوحنیفہ کی شاگردی صرف اس قدر تھی کہ ان حضرت سے کچھ حدیثیں سنی تھیں، چونکہ وہ حضرت ان (یعنی ابوحنیفہ) کو مردودوں میں سے سمجھتے تھے۔ ان سے تقیہ کرتے اور اظہار مذہب حق کا ان پر اخفاء کرتے۔''

(ج ۱،ص ۵۳۶)

المختصر نہ ہی تو کسب علم میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے سامنے جناب جعفر الصادق رحمہ اللہ کی کوئی ایسی علمی فضیلت تھی کہ امام ابوحنیفہ ان سے علم حاصل کرتے اور نہ ہی ان کو اس کا موقع ملا سو یہ کہنا سراسر بے جا اور خلافت حقیت بات ہے کہ فقہ حنفی جیسی وسیع اور سب سے بڑی وعبقری فقہ جو کہ دوسری ہجری کے اواخر تک مدون ہوچکی تھی، اس فقہ سے مستعار لی گئی ہے جس کی تدوین ہی وضعی طور پر چوتھی صدی ہجری میں ایک شیعی حکومت آل بویہ کی سرپرستی میں جناب جعفر الصادق کی طرف غلط طور پر منسوب کر کے کی گئی تھی۔

امام ابوحنیفہ اور شیعیت

اس کے بعد کچھ منچلوں کی طبیعت نے زیادہ شوخی دکھائی تو انہوں نے امام ابوحنیفہ کی بابت یہ گوہر افشانی فرمائی کہ امام ابوحنیفہ کا ذہنی میلان تشیع کی جانب تھا اور ان کی ساری فقہی موشگافیاں جناب جعفر صادق کی تربیت اور علوم کے مرہون منت تھیں۔ جہاں تک امام ابوحنیفہ کے جناب جعفر صادق سے علم الفقہ سیکھنے کی بات ہے تو اس دعویٰ کا ابطال ہم اوپر کر آئے ہیں۔ اب جہاں تک رہی یہ بات کہ امام ابوحنیفہ کا میلان شیعیت کی طرف تھا تو اس دعویٰ پر افسوس سے زیادہ حیرانی ہی دکھائی جاسکتی ہے۔ یہ بات معروف ہے کہ علمائے حدیث میں بعض حضرات کے نزدیک اہل ہوا و بدعت سے اخذِ روایت میں نرمی ہے اور بعض کے ہاں سختی ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک ان علماء میں شامل ہیں جن کے ہاں اس بارے میں سختی پائی جاتی ہے اور خصوصیت سے یہ سختی ان لوگوں کے حق میں زیادہ ہے جن میں تشیع پایا جاتا ہو کیونکہ تشیع سے آدمی جنگ جمل وصفین میں فریق بن جاتا ہے اور ان واقعات کو غیر معمولی اہمیت دے کر صحابہ کرامؓ کی جناب میں سوءظن کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ امام ابوحنیفہ شیعی تصورات رکھنے والوں سے اس قدر زیادہ بیزار تھے کہ ان کی روایت قبول کرنے کے بھی روادار نہ تھے۔ چنانچہ علامہ خطیب بغدادی نے الکفایہ فی علم الروایۃ میں اپنی سند سے امام ابوحنیفہ کے شاگرد خاص عبداللہ بن

مبارک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: ابوعصمہ نے امام ابوحنیفہ سے دریافت کیا کہ آپ مجھے کن لوگوں سے روایت لینے کا حکم فرماتے ہیں، امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ ہر معتبر ثقہ شخص سے اگرچہ وہ عقائد میں جماعت سے ہٹا ہوا ہو، سوائے شیعہ کے۔ پھر فرمایا کہ ان (شیعہ) کا اصل عقیدہ تو یہ ہے کہ اصحاب محمد ﷺ کو گمراہ ثابت کریں۔ (ص ۱۲۶)

اسی طرح ایک صفحہ پہلے ہی خطیب بغدادی اپنی کتاب میں لکھ چکے ہیں کہ ہم نے پہلے ابوعبداللہ الشافعی کی یہ بات بیان کی ہے کہ اہل ہوا لوگوں کی روایت قبول کی جاسکتی ہے سوائے روافض کے خاص طبقے کے۔ یہی بات امام اصحاب الرائے ابوحنیفہ سے بھی نقل کی گئی ہے اور قاضی ابو یوسف سے۔ (ص ۱۲۵)

امام ابوحنیفہ کی پہلی ملاقات جب جناب عطاء بن ابی رباح سے ہوئی اور طلب علم کے لئے آپ نے ان کی خدمت میں رہنا چاہا تو اس کا حال ابن بطال نے شرح بخاری میں اس طرح سے لکھا ہے:

> ''ابوحنیفہ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں میں نے مکہ میں عطاء بن ابی رباح سے ملاقات کی اور ان سے کچھ سوال کئے۔ انہوں نے پوچھا ''تم کہاں کے ہو''، میں نے عرض کیا ''کوفہ کا''، اس پر انہوں نے فرمایا کہ ''تم اس بستی کے ہو جہاں کے لوگوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور گروہ گروہ بن گئے''، میں نے کہا جی ہاں۔ پھر انہوں نے فرمایا ''تمہارا تعلق ان میں سے کس گروہ سے ہے؟'' میں نے عرض کیا ان سے جو بزرگان سلف کی جناب میں بے ادبی نہیں کرتے، تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں اور گناہ کے سبب کسی کو کافر نہیں سمجھتے۔ اس پر انہوں نے فرمایا ''تمہیں دین کا عرفان ہے اسی پر جمے رہنا۔'' (تفسیر المنار، ج ۸، ص ۲۱۸)

اب کہاں تو امام صاحب اہل تشیع سے روایت تک لینے کے روادار نہ ہو، خود کو ان سے مبرا قرار دیتے ہوں اور کہاں ان کی بابت یہ خامہ فرسائی کہ ان میں تشیع تھا یا ان کا ذہنی میلان شیعیت کی طرف تھا۔ امام ابوحنیفہ کوفہ میں رہے ضرور تھے لیکن اہل تشیع سے ہمیشہ متنفر ہی

رہے۔اور جہاں تک یہ بات رہی کہ امام ابوحنیفہ نے اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے خلاف خروج میں جناب زید بن علی بن حسین کی حمایت کی تھی اور وہ اس کوغزوۂ بدر کے مماثل قرار دیتے تھے تو یہ بات بھی سخت لغو اور بے اصل ہے۔جس کا ابطال ہم اوپر کرآئے ہیں اور ان شاء اللہ کتابِ ہذا میں قارئین مولانا علی احمد عباسی کے قلم سے اس بابت مزید ادلہ سے مستفید ہوسکیں گے،تاہم یہ بات یادرہے کہ جس خروج کو امام ابوحنیفہ کے منہ سے غزوۂ بدر کے مماثل قرار دیا جاتا ہے،خود امام ابوحنیفہ نے اس خروج میں کوئی عملی حصہ نہ لیا بلکہ اپنے گھر میں بیٹھے رہے اور اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کی بیعت پر مستقیم رہے۔

زیرِنظر کتاب کی وجۂ طباعتِ ثانی

المختصر اس طرح کے اور کئی وضعی الزامات اور واقعات ہیں جو کہ امام ابوحنیفہ کی نجی و سیاسی زندگی سے متعلق کذاب راویوں نے گھڑ کر تاریخ کی کتب میں شامل کردیئے ہیں۔مولانا علی احمد عباسی نے اس طرح کے بیشتر واقعات کی قلعی اپنی زیرِنظر کتاب امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی میں کھولی ہے۔یہ کتاب عرصۂ دراز سے ناپید تھی۔راقم الحروف کے پاس اس کا ایک نسخہ نہایت مخدوش حالت میں موجود تھا۔چونکہ اس احقر نے حارث پبلی کیشنز کی بنیاد رکھی ہی اس سوچ وفکر پر ہے کہ اس ادارے سے ان کتب کی اشاعتِ نو کی جائے جو زمانے کے نامساعد حالات کے سبب ناپید ہونے کو ہیں۔اس سلسلے میں حارث پبلی کیشنز سے اب تک مولانا علی احمد عباسی مرحوم کی کتاب سیدنا معاویہ کی سیاسی زندگی،مولانا عبدالسلام مبارکپوری کی اولیاء اللہ اور تصوف اور امیر حجاج بن یوسف سے متعلق مختلف اہل علم کے مضامین پر مشتمل کتاب امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ۔۔چند غلط فہمیوں کا ازالہ شائع کی جاچکی ہیں۔اس سلسلے میں اب چوتھی کاوش مولانا علی احمد عباسی کی کتاب امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی آپ قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس کتاب کی اشاعت کوعلم کی دنیا میں ایک گرانقدر اضافہ پائیں گے اور امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی سے متعلق بیشتر حقائق کا درست ادراک کرسکیں گے۔

تعارفِ مصنف

جب مولانا علی احمد عباسی مرحوم کی کتاب سیدنا معاویہؓ کی سیاسی زندگی شائع کی تو کئی احباب نے استفسار کیا کہ آپ کو مصنف کا تعارف بھی دینا چاہیے تھا جو کہ کتابِ مذکور میں موجود نہ تھا۔ سو اب جب مولانا علی احمد عباسی مرحوم کی دوسری کتاب کی اشاعت کی جارہی ہے تو مناسب خیال کیا جاتا ہے کہ کچھ ان کی بابت مختصر تعارف ہدیۂ قارئین کردیا جائے۔ مولانا علی احمد عباسی مرحوم کے اجداد کے متعلق مالک رام صاحب اپنی کتاب تذکرہ معاصرین میں لکھتے ہیں کہ: ان کے خاندان کا سلسلہ بواسطۂ خلیفہ عباسی (بغداد) امین الرشید (خلفِ ہارون الرشید) رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب تک پہنچتا ہے۔ خلیفہ امین الرشید (۸۰۹ھ -۸۱۲ھ) حضرتِ عباسؓ سے نویں پشت میں تھے۔ جب ۱۲۵۸ء میں ہلاکو خان نے بغداد کو تاراج کیا اور آخری خلیفہ بنی عباس مستعصم باللہ کو تہِ تیغ کردیا تو اس خاندان کے اکثر اشخاص جان اور ناموس بچانے کی خاطر ترکِ وطن پر مجبور ہوئے۔ انھی خلیفہ امین سے دسویں پشت میں مخدوم زادہ محمد یوسف بھی تھے، وہ ہندوستان چلے آئے۔ یہ سلطان غیاث الدین بلبن کا عہدِ حکومت تھا۔ سلطان نے ان کی خاندانی عظمت اور علمی حیثیت کے پیشِ نظر انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور شایانِ شان منصب اور عہد عطا کیا۔ یہ خاندان ایک صدی تک آرام و آسائش سے دلّی میں مقیم رہا تھا کہ اتنے میں قہرِ خداوندی امیر تیمور کی شکل میں نازل ہوا۔ اب مخدوم زادہ محمد یوسف سے چوتھی پشت میں مولانا شمس الدین یہاں سے نکل کر پنجاب چلے گئے اور زندگی کے بقیہ ایام انہوں نے وہی بسر کیے۔ ان کے پوتے مولانا رکن الدین عباسی (ابن مولانا نظام الدین) سلطان سکندر لودھی کے عہد میں پنجاب سے نقلِ مکانی کرکے امروہہ آئے۔ عباسانِ امروہی انھی مولانا رکن الدین کے اخلاف ہیں۔

مولانا رکن الدین کی نویں پشت میں مولانا سید احمد علی شاہ عباسی پچھلی صدی کے صاحبِ صورت و سیرت بزرگ تھے۔ شروع میں خاندانی جاہ و ثروت سے کنارہ کش اور یادِ اللہ

میں مشغول رہے۔ اگرچہ با قاعدہ حضرت حافظ موسیٰ چشتی قادری مانک پوری سے بیعت تھے، لیکن دوسرے سلاسلِ طریقت مثلاً صابریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ میں بھی خلافت واجازت سے سرفراز ہوئے۔ تمام وقت مطالعۂ کتبِ دینیہ میں صَرف ہوتا یا عباداتِ الٰہی میں۔ پیر کے دن ۲۹ رشوال ۱۲۹۷ھ (۴ ارکتوبر ۱۸۸۰ء) کو اِکیاسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ امروہہ میں شاہ علاؤل کی درگارہ میں، بلکہ انہی کے پہلو میں دفن ہوئے۔

سید احمد علی شاہ کے اکلوتے فرزند سید محمد علی عباسی ۱۲۴۷ھ (۳۲-۱۸۳۱ء) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے دینی تعلیم اور درسِ نظامیہ کی تکمیل مختلف اساتذہ سے کی، پھر حکومتِ انگریزی میں ملازم ہوگئے۔ اسی اثناء میں وکالت کا امتحان پاس کر کے اسے بطورِ پیشہ اختیار کر لیا۔ پہلے مختلف مقامات پر کام کیا، لیکن بالآخر امروہہ میں مقیم ہوگئے۔ ان کا شہر کے اکابر میں شمار ہوتا تھا۔ یہیں ۱۸۹۷ء میں رحلت کی اور اپنے والد کے پہلو میں جوارِ حضرت شاہ علاؤل میں دفن ہوئے۔

سید علی محمد عباسی نے اپنی زندگی میں دو نکاح کئے۔ پہلی بیوی سے دو بیٹیاں اور چار بیٹے ہوئے۔ جبکہ دوسری بیوی سے ایک بیٹی اور چار بیٹے ہوئے۔ انہیں سید علی محمد عباسی کے پوتے کتابِ ہٰذا کے مصنف مولانا علی احمد عباسی مرحوم تھے۔ آپ قیامِ پاکستان کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آگئے، کچھ عرصہ کراچی میں قیام کر کے معاش کی غرض سے سوات منتقل ہوگئے جہاں جہانزیب کالج سوات میں آپ پروفیسر مقرر ہوئے۔ اسلامی تاریخ پر آپ کی گہری نظر تھی یہی وجہ ہے کہ آپ کی تالیف سیدنا معاویہؓ کی سیاسی زندگی جو کہ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں لکھی گئی تھی، اربابِ اہلِ علم میں کافی معروف ہوئی اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب خلافت وملوکیت کی تاریخی وشرعی حیثیت میں مولانا علی احمد عباسی کی اس کتاب کے حوالہ جات دیے ہیں۔ مؤلف مرحوم کا اندازِ بیان نہایت ہی سلیس اور آسان فہم ہوتا ہے۔ آپ کی کتابیں عموماً شروع سے لے کر آخر تک انتہائی دلچسپ اور اپنے اندر نہایت وقیع معلومات رکھتی ہیں۔ جن میں قاری کو روایات کی بھول بھلیوں میں الجھانے کے بجائے سیدھے سادھے آسان، عام فہم اور منطقی

مباحث کے ذریعے بات سمجھانے کوشش کی جاتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی کے علاوہ مولانا علی احمد عباسی دیگر کئی نادر تحقیقات کے بھی مؤلف رہ چکے ہیں جن میں سیدنا معاویہؓ کی سیاسی زندگی اور مقتل الحسین للمؤلف ابومخنف کا اردو ترجمہ و تعلیقات شامل ہیں۔ چونکہ مولانا علی احمد عباسی مرحوم کا تعلق مسلکِ احناف سے تھا اور یہ احقر منہجِ محدثین کا دم بھرتا ہے، اس لیے کتاب کے چند مباحث میں مؤلف مرحوم سے اختلاف ہوجانا فطری امر ہے۔ تاہم اپنی گوناگوں مصروفیت کے سبب یہ احقر مؤلف مرحوم کی پچھلی کتاب کے برخلاف اس کتاب پر حاشیہ و تعلیقات کا کام نہ کرسکا۔ یہ یاد رہے کہ یہ کتاب ایک حنفی صاحبِ علم کے قلم سے نکلی ہوئی ہے سو اس میں کئی ایسے اصولی مباحث ہوسکتے ہیں جن سے محدثین کے منہج کے بنیادی اختلافات موجود ہوں لیکن ان سب کے باوجود یہ بات بھی اپنی جگہ حق و مسلم ہے کہ ان اختلافات سے اس کتاب کی افادیت و اہمیت میں کوئی کمی نہیں آتی۔

اس کتاب کی طباعت کے سلسلے میں سب سے پہلے تو اس اللہ عزوجل کے حضور شکر گزار ہوں کہ اس مالک نے اس احقر کو اس قابل بنایا کہ وہ یہ کام کرسکے۔ اگر اس کی مدد شاملِ حال نہ ہوتو کوئی کام ممکن نہیں۔ اسی کے کرم سے یہ کام ہوسکا ہے اور اس کام کی ہر اچھائی صرف اسی ذاتِ باری تعالیٰ کے سبب سے ہے۔ اس مالکِ کُل کے شکریہ کے بعد اپنے عزیز دوست راشد جمال، محمد صہیب نذیر اور بلا احمد راؤ صاحبان کا شکریہ ادا کروں گا کہ ان کے تعاون کے بغیر یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچنا ناممکن تھا۔ ان کی ہمت اور ساتھ رہا کہ یہ کام ہوسکا۔ اللہ اس دوستی اور ساتھ کو ہمیشہ بنائے رکھے۔ علاوہ ازیں فضیلۃ الشیخ قاضی طاہر علی الہاشمی صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے ہمت بندھائی تو اس کتاب کی اشاعت کی طرف توجہ کرسکا۔ اللہ ان جیسے حق گو عالم کا سایہ تازیست ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ اسی طرح اس کتاب کی اشاعت میں اور بھی چند احباب کی خصوصی مدد شاملِ حال رہی لیکن کیا کروں ان کی درویشانہ صفت کا کہ انہوں نے اپنے ناموں کا تذکرہ کرنے سے سختی سے منع کررکھا ہے، اسی لیے ان کا نام لیے بغیر ہی ان کی جناب میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں۔

کسی بھی کام میں کمال صرف اس ذاتِ بے ہمتا کو ہی سزاوار ہے،مخلوق کا کام تو غلطیوں سے پُر ہوتا ہے۔پھر بھی اپنے تئیں پوری کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں کوئی غلطی کوئی کمی نہ رہ جائے ،تاہم اس کے باوجود اگر کوئی کمی یا غلطی رہ جائے تو قارئین سے التماس ہے کہ اس بابت مطلع فرمائیں،ان شاء اللہ ایجابی طریق سے آئی ہر تنقید کو سر آنکھوں پر رکھا جائے گا۔

محمد فہد حارث

۶ رفروری ۲۰۱۹ء

تعارف

حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کے سوانح وتذکرے کی یہ نئی کتاب اس اعتبار سے اور بھی قابل قدر ولائق توصیف ہے کہ امام صاحب کے مدّون مذہب اور سیاسی مسلک کے بارے میں جو خلاف واقعہ روایتیں اور وصفی قصّے کہانیاں صدیوں سے مشہور ہیں۔فاضل مؤلف کتاب نے تحقیق وریسرچ کے اعلیٰ معیار سے انہیں جانچا، پرکھا ہے۔جس سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ومنکشف ہوگئی کہ یہ سارے قصّے ولایعنی فضولیات اسی زہریلے پروپیگنڈے کا شاخسانہ ہیں جو اموی وعباسی خلفاء کی تنقیص اوران علوی باغیوں کی مدح وتقدیس میں برابر ومتواتر ہوتا رہا ہے۔ جو وقتاً فوقتاً حکومت قائمہ کے خلاف بادعائے تفاخر نسب خروج وبغاوت کر کے غائب و خاسر رہے تھے۔اسی سلسلے میں یہ داستان سرائی بھی کی جاتی ہے کہ امام صاحب نسبتاً چونکہ ابناء فارس سے ہیں اور مولد ومنشاء بھی آپ کا شیعان علی کا مرکزی شہر کوفہ تھا جسے حضرت علیؓ نے اپنے مختصر سے ایام خلافت میں مدینۃ النبی کے بجائے دارالخلافہ سیاسی مصالح سے بنالیا تھا۔یہ واقعہ امام صاحب کی ولادت سے کوئی چوالیس سال قبل کا ہے مگر کہا جاتا ہے کہ امام صاحب کے والد ثابت کو جو اس زمانے میں کم سن تھے۔آپ کے دادا نے حضرت علیؓ کے حضور دعائے خیر وبرکت کے لیے پیش کیا تھا۔امام صاحب کے اجداد میں ان کے دادا ہی مشرف بااسلام ہوئے تھے۔ حضرت نے اس فارسی بچے کو دعائے خیر دی تھی پس اسی ایک واقعے سے جو آپ کے والد ثابت کے بچپن کا بتایا جاتا ہے امام صاحب کو علوی خاندان کا اسدرجہ عقیدت مند ظاہر کیا گیا ہے کہ جب

کوئی علوی وفاطمی آپ کے زمانے میں خلیفہ وقت کی اطاعت سے منہ موڑ کر اور جماعت سے علیحدگی اختیار کرکے شریعت کے واضح احکام کی خلاف ورزی میں خروج و بغاوت کا اقدام کر بیٹھتا۔امام صاحب حمایت سے اس کی نہ چوکتے خفیہ خفیہ مالی امداد کیا کرتے بلکہ ایک علوی کے خروج و بغاوت کو تو کہا جاتا ہے۔آپ نے غزوۂ بدر کے معاذ اللہ مماثل قرار دے ڈالا تھا۔لیکن اس مفروضہ غزوہ وجہاد میں بذات خود شریک ہونے کی سعادت حاصل نہ کی۔اس ضمن میں یہ کذب بیانی بھی کی جاتی ہے کہ اموی خلافت میں تو کوڑے لگوانے کی سزا آپ کو دی گئی اور عباسی خلیفہ نے عہدہ قضا پر تقرر کرنا چاہا انکار پر قید وبند کی سزا دی بعد میں زہر دے کر مروا ڈالا۔یہ سارے واہی قصّے اور وضعی روایتیں قطعاً بے بنیاد ہیں۔فاضل مؤلف نے نقد و درایت سے ان فضولیات کی قلعی پوری طرح کھول دی ہے اور روایتاً ودرایتاً ثابت کر دکھایا ہے کہ امام صاحب کی ایذادہی و اہانت کے بجائے عباسی خلافت میں آپ کی مناسب قدر ومنزلت کی گئی۔

مکہ معظّمہ میں چند سال متواتر قیام کرنے کے بعد بردایت صدرالایمہ امام اعظمؒ زمانہ امیر المومنین ابوجعفر المنصور عباسی کوفہ واپس آئے۔(ج۱ص۲۴) امیرالمومنین کی پہلی ملاقات کو حاضر دربار ہوئے۔امیر عیسیٰ بن موسیٰ عباسی نے **ھذا عالم الدنیا الیوم** [آج یہ تمام دنیا میں سب سے بڑے عالم ہیں] کہہ کر تعارف کرایا۔فاضل مؤلف کتاب نے مستند حوالے سے بتایا کہ امیر المومنین نے فرمایا:

> ''اے نعمان! تم نے کہاں کہاں علم فاضل کیا ہے؟ امام اعظم نے جواباً کہا۔کہ میں فاروق اعظم حضرت عمرؓ،حضرت علیؓ،حضرت عبداللہ بن مسعودؓ،حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے علمی سرچشموں سے سیراب ہوا ہوں۔امیر المومنین نے یہ سن کر اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا۔اے نعمان! تم نے اپنا علمی رشتہ الطیبین الطاہرین المبارکین رضی اللہ عنہم اجمعین سے مضبوط قائم کیا ہے۔''

پھر اہل علم کے بغایت قدردان وسرپرست خلیفہ نے جو بذات خود بلند پایہ عالم و محدث تھے اور ملت اسلامیہ میں باضابطہ علمی تحریک کے بانی اور جاری کرنے والے تھے۔امام

صاحب کو بعزت واحترام اپنے پاس رکھا دینی وعلمی مہمات امور کی انجام دہی ان کے سپرد کی جو امام صاحب مرتے دم تک انجام دیتے رہے۔

مودودی صاحب نے اپنی رسوائے زمانہ کتاب خلافت وملوکیت میں جس کے چند فقرے شیعی کتابچہ نویس نے بھی درج کیے ہیں جو یہ غلط بیانی عصبیت جاہلی کے جذبے سے کی ہیں کہ امام ابوحنیفہ نے بذات خود غیر سرکاری طور سے فقہ کی تدوین کی۔اس کی مکمل تردید ہماری تالیف حقیقت خلافت وملوکیت میں کی جا چکی ہے اور فاضل مؤلف نے بھی تدوین فقہ کے اس عظیم کارنامے کا زیر سرپرستی خلافت عباسیہ انجام دیا جانا اور رائج ہونا تجسس بیان مستند حوالوں سے پیش کیا ہے سبائی راویوں اور علوی باغیوں کے طرف داروں نے امام صاحب کے قید وبند اور ہتک حرمت کی روایتیں اور قصّے جو تراشے ہیں محض فضولیات ہیں۔

حضرت امام اعظم کو سیاسی ہنگاموں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔دینی اور علمی ماحول میں ساری عمر بسر کی۔احکام شریعت کی متابعت میں اور اپنے اساتذہ کرام خصوصاً حضرت عطا بن ابی رباح کے مسلک وموقف کے اعتبار سے جو حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد رشید تھے امام صاحب پوری طرح جماعت سے وابستہ رہے اور تعلیمات نبویہ کے مطابق خلیفہ وقت کی اطاعت پر مضبوطی سے قائم رہ کر فتنہ وفساد کی تحریکوں سے محترز رہے۔بفحوائے آیت کریمہ: **ان الـــذیـــن فـرقـورا دیـنـهـم و کانو شیعالست منهم فی شی** [جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کرلیں اور گروہ (شیعہ) بن بیٹھیں (اے رسول) تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔] تفرقہ بازوں سے حضرت امام اعظم بھی ایسے متنفر رہے کہ شیعہ راویوں سے جو صحابہ کی توہین کر کے علم دین کے لیے خطرہ ہیں اور تقیہ کا عقیدہ بھی انہیں اور مشکوک کر دیتا ہے۔روایت لینا جائز نہ سمجھتے تھے۔امام عبداللہ بن المبارک کی سند سے یہ قول آپ کا منقول ہے کہ اہل ہوا (اہل بدعت) سے روایت لی جا سکتی ہے بشرطیکہ وہ عادل ہوں۔(**الا الشیعة فان اصل عقید تهم تضلیل اصحاب محمد** ﷺ) لیکن شیعہ سے روایت نہ لی جائے کیونکہ ان کے عقیدے کی عمارت حضور انور ﷺ کے صحابہ کی توہین تضلیل پر ہے۔(الکفایہ فی علم الروایۃ) اب دیکھیے جو پیشوائے مذہب وامام اہل

سنت والجماعت کسی شیعہ سے روایت قبول کرنے کے بھی روادار نہ ہوں۔حضرات شیخین السیدین کی افضلیت کو مذہب اہل سنت کی پہچان بتا کر یہ فرمایا کرتے ہوں۔ثم نقران افضل هـذا الـدمة اعنی خير الامم بعد نبينا محد صلى الله عليه وسلم ابوبكرؓ ثم عمرؓ ثـم عثمانؓ ثم علیؓ (کتاب الوصیۃ امام ابوحنیفہ) یعنی پھر ہم یہ اقرار کریں کہ سب سے افضل اس امت یعنی خیر الامم میں بعد ہمارے پیارے نبی اکرم ﷺ کے ابوبکرؓ ہیں پھر عمرؓ پھر عثمانؓ پھر علیؓ ان ہی پیشوا و امام اعظم کو مذہباً شیعہ بتانے کو کسی شیعہ نے جو اپنے نام کے ساتھ ''اجتہادی'' کا دم چھلا بھی لگاتے ہیں۔ایک لچر کتابچہ اس نام سے شائع کرایا ہے۔

امام ابوحنیفہ شیعہ تھے۔تاریخی انکشاف

مگر لطف تو یہ ہے کہ ''تاریخی بکواس'' کی کامل و مکمل تردید و تکذیب خود ان ہی کے علماء و فضلاء اس سابق کی تحریرات بالخصوص شیعان ہند کے ''شہید ثالث'' قاضی نور اللہ شوشتری علیہ ماعلیہ جیسے غالی شیعہ کی تصریحات سے ہو جاتی ہے۔جو ان کی مشہور تالیف مجالس المومنین کے صفحات میں دیکھی جاسکتی ہیں۔شوشتری نے 'بہت سے' اکابر اہل تسنن حجۃ الاسلام امام غزالی، شیخ سعدی و مولانا رومی وغیرہم کو زمرہ شیعہ میں شامل کیا ہے۔لیکن امام اعظم کے بارے میں صاف کہہ دیا ہے کہ ''ابـوحـنـیـفـه کـوفـی کـه امـام اعظم خواجه سفی اسـت'' (ج ۲،ص ۲۸۰) نیز شہر کوفہ کے ذکر میں مزید لکھا ہے کہ: ''ابوحنیفہ باوجود کوفی الاصل ہونے کے مذہباً شیعہ نہ تھے۔دار آنحالیکہ کوفیوں کا شیعہ مذہب ہونا تو کسی دلیل کا محتاج نہیں۔البتہ کوفی الاصل کا سنی مذہب ہونا محتاج دلیل کا ہے۔و اگرچه ابوحنیفه کوفی باشد'' (ج ۱،ص ۵۶) شوشتری کے علاوہ ایک اور شیعہ مؤلف حسن صدر الدین نے کتاب الشیعۃ وفنون اسلام میں جس کا ایک ایڈیشن شیعہ یا پدید آرندگان فنون اسلام ہے۔اس غلط بیانی کے ساتھ کہ شیعوں کو اسلامی علوم وفنون میں سنیوں پر تقدم ما و تفوق ہے۔علامہ سیوطی کے حوالے سے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ سب سے پہلے شخص (اور مقصود اس شخص سے اہل سنت کے شخص سے ہے) جس نے علم فقہ میں کتاب

مدّ ون کی ابوحنیفہ تھے۔(ص۷۹)

شیعہ کتابچہ نویس نے اتہام شیعت کے ساتھ امام اعظم ابوحنیفہ کو شاگرد بھی زید علی بن حسین کا بتادیا ہے اور دوسروں نے شیعوں کے چھٹے امام جعفر صادق کا۔شوشتری نے اس شاگردی کی حقیقت بھی شیعی جبلت سے گستاخانہ طرز عبارت میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

شاگردی ابوحنیفه بحضرت امام جعفر این قدربوده که از آنحضرت بعضے از احادیث شنیده وچون آنحضرت اورا از مردودان میدانستند از وتقیه می نموده اظهار مذهب حق بادنمی نموده. (ج۱،ص۵۳۶)

[حضرت امام جعفر سے ابوحنیفہ کی شاگردی صرف اس قدر تھی کہ ان حضرت سے کچھ حدیثیں سنی تھیں چونکہ وہ حضرت ان کو مردودوں میں سمجھتے تھے ان سے تقیہ کرتے اور اظہار مذہب حق کا ان پر برقہ کرتے۔]

فاضل مؤلف کتاب ہذا نے حضرت امام اعظم کے اساتذہ کرام کا تذکرہ بالتفصیل کرتے ہوئے یہ بھی ثابت کردیا ہے کہ جعفر صادق اور ان کے چچا زید بن علی بن حسینؓ کا کوئی تعلق امام صاحب کے اکتساب علم سے نہ تھا۔امام اعظم ابوحنیفہ کا شمار تو صغار تابعین میں ہے۔ ۲۲ صحابہ کرام میں سے جو ان کے ابتدائے عمر میں موجود تھے۔آٹھ بزرگواروں سے ملاقات ثابت ہے۔سالہا سال قیام مکہ معظّمہ میں رہتا۔بقول صاحب درمختار آپ نے ۵۵ حج کیے تھے۔ حرم کعبہ کی مسجد میں بیٹھے ہوتے تو مسائل شریعت پوچھنے والوں کا ایسا ہجوم ہوتا تھا کہ بقول امام لیث بن سعد **رایت الناس منقصصين عليه** [میں نے دیکھا کہ لوگ ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں] یہ کیفیت کسی علوی و فاطمی بزرگ کی مجلس کی کہیں منقول نہیں۔امام ابن حزم نے اپنی مشہور تالیف الملل والنحل (ج۳،ص۳۹) یہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جعفر صادق کی کوئی برتری و فضیلت علم میں دین میں عمل میں دوسرے ہمعصر علماء میں محمد بن مسلم الزہری وقبیضہ بن ذوئب وغیرہم پر نہ تھی۔لکھا ہے کہ ''ابن عباسؓ نے اپنی فقہ بیس کتابوں میں جمع کی ہے اور اگر تلاش کی جائے تو

ان کی حدیث بھی قریب قریب اسی حد تک پہنچے گی۔حالانکہ حسنؓ و حسینؓ کی فقہ دو ورق تک بھی نہیں پہنچتی۔یہی حال علی بن حسینؒ (زین العابدینؒ) کا بھی ہے۔محمد بن علی (یعنی محمد باقر) کی حدیث اور فقہ ایک چھوٹے سے جزو تک پہنچتی ہے اور اسی طرح جعفر بن محمد (جعفر صادق ۔م) کی بھی حالانکہ روافض کا دعوی یہ ہے کہ امام کے پاس شریعت کا کل علم ہوتا ہے۔جعفر بن محمد کے بعد تو ہمیں ان ائمہ کے علم کا بالکل پتہ نہ چلا۔نہ حدیث میں نہ فقہ میں باوجود یکہ ان لوگوں کا زمانہ ہمارے زمانے کے قریب ہے۔''

حضرت امام ابوحنیفہ بیک واسطہ حضرت ابن عباس کے اور دو واسطوں سے حضرت فاروق اعظمؓ و حضرت علیؓ و حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے علمی سرچشموں سے سیراب ہوئے تھے۔ ہمعصر علوی حضرات سے جو ائمہ شیعہ میں شمار ہوتے ہیں۔اکتساب علم کا مطلق تعلق نہ تھا۔ان کی علمی شان و جلالت ان حضرات سے بہت بلند تھی۔امام ابن المبارک نے اپنے گرامی منزلت استاد کے فیوض و برکات علمی کے بارے میں صحیح کہا ہے کہ:

روی اثـــاره فـــاجـــاب فیهـــا
کـطیـــران الـقـصـــور من الـمـنبـقة
[انہوں نے آثار کو روایت کیا تو ایسی بلندی پروازی دکھائی
جیسے شکاری پرندے بلند مقام سے اُڑ رہے ہوں۔]
ولـم یـکـن لـــه بـــالـعـــراق نـظیـــر
ولا بـــالـمشـــرقیـن ولا بـــالـکـوفة
[نہ عراق میں ان کی کوئی مثال تھی
نہ مشرق ومغرب اور نہ کوفہ میں]

اس لچر کتابچے کے بدگو شیعی مؤلف نے حضرت امام اعظم کے بارے میں یادہ گوئی کرنے کے علاوہ حضرات خلفائے ثلاثہ یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ اکبر و حضرت عمر فاروق اعظمؓ و حضرت عثمان ذوالنورینؓ و دیگر صحابہ کرام کی جناب میں گستاخی کرتے ہوئے شرف صحابیت کی

تنقیص میں جو کلمات بد لکھے ہیں یا ازواج مطہرات ام المومنین حضرت عائشہؓ وام المومنین حضرت حفصہؓ جیسی ذوات عالیہ کو جو بنص قرآن **و من یقنت منکن للہ و رسولہ و تعمل صالحا نوتھا اجرھا مرتین** بنات طاہرات حضرت فاطمہؓ وغیرہا اور تمام صحابہ کرام سے افضل ہیں۔خارج از ایمان قرار دیتے ہوئے وضعی روایت کے اشارے وکنایہ سے لکھ مارا ہے کہ ''شیعہ ان ازواج رسول کو بھی خارج از ایمان سمجھتے ہیں۔جنہوں نے حضرت ماریہ قبطیہ پر تہمت لگائی یا حضرت عثمانؓ کو نعثل یہودی دین سے خارج اور واجب القتل کہا۔''

شیعی راویوں کی ان من گھڑت قطعی جھوٹی اور واہی روایتوں کا کوئی خفیف سا تعلق بھی حضرت امام ابوحنیفہ کے سوانح حیات سے نہیں ہے مگر آنحضرت ﷺ کی یہ دونوں اہل بیت (اہل خانہ) جن کے بارے میں کذباً وافتر اًیہ لغو بیان کی گئی ہے چونکہ صاحبزادیاں ہیں حضرت ابوبکر الصدیقؓ اور حضرت عمر الفاروقؓ جیسے عظمائے ملّت جلیل القدر صحابہ کرام جن سے عناد و دشمنی شیعیت کی گویا اساس وبنیاد کی طرح ہے یہ بدگو شیعہ کتابچہ نویس ان امہات المومنین کی اس طرح بے موقع و بے محل تنقیص کرنے سے بھی کیوں باز رہتا بقول یہ کہ:

نیش عقرب نہ ازپے کین است مقتضائے طبیعتش این است

حضرت علی کو حضرت عمر فاروقؓ کی ذات مستجمع الصفات سے کچھ ایسی عقیدت تھی کہ اپنی نور دیدہ سیدہ ام کلثوم بنت سیدہ فاطمہؓ بنت رسول ﷺ کو ان کی زوجیت میں دیا پھر اپنے ان داماد کے ایک دشمن اسلام سازشی کے ہاتھوں مقتول ہو جانے سے ان کے جنازے کے پاس کھڑے ہوئے کس حسرت سے یہ الفاظ کہے تھے اے کاش! میرے بھی کچھ اعمال ایسے ہی ہوتے جیسے ان صاحب جنازے کے ہیں مگر بدگو شیعی مؤلف نے ایک اختراعی واہی قصّے کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی زبان سے جو حضرت علیؓ کے صاحبزادوں حسن وحسینؓ سے سن و سال میں چودہ پندرہ برس بڑے تھے یہ لغو اور بے بنیاد بات کہلوائی ہے کہ'' ایک دفعہ حسن نے عبداللہ بن عمر کو غلام زادہ کہہ دیا۔انہوں نے باپ سے شکایت کی انہوں نے کہا لکھوا لاؤ صاحبزادہ نے لکھ دیا۔وہ نوشتہ باپ کے پاس لائے تو انہوں نے کہا اس کو میرے کفن میں

رکھ دینا یہ سند ہے۔غلامی اہل بیت ضمانت جنت ہے۔''(ص ۵۰)

کتابچہ نویس کی اس لایعنی بکواس کا مقصد نسل پرستی کے شیعی عقیدے کا اظہار ہے مگر کس واہی طور سے۔حضرت علیؓ کا خاندان بنی ہاشم اور حضرت عمرؓ کا خاندان بنی عدی قبیلہ قریش کے معزز گھرانے رشتوں میں منسلک تھے۔آنحضرت ﷺ بھی نسباً قریشی ہاشمی ہیں۔قبیلہ قریش اور غیر قریشی عرب تفاخر نسبی میں سب سے زیادہ مبتلا تھے۔اسلامی تعلیمات نے اس جاہلی فخر کو مٹا کر سب اہل کلمہ کو بھائی بھائی بنا دیا۔**انما المومنون اخوۃ** ۔نبی کریم ﷺ نے اپنے عظیم خطبہ حجۃ الوداع میں امت کو مختلف نصیحتیں ووصیتیں کرتے ہوئے فرمادیا تھا کہ نسل ونسب کے اعتبار سے کسی عربی کو کسی عجمی پر کسی کالے رنگ والے کو کسی گورے رنگ والے پر کوئی برتری وفضیلت نہیں۔اللہ تعالیٰ کے نزدیک اکرم وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔

آپؐ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ اپنی پھوپھی حضرت صفیہؓ اور اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ آخرت میں ،میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔تم لوگ نیک عمل کرو وہی تمہارے کام آئیں گے۔**فاذانفغ فی الصور فلا انساب بینھم ولا یتساء لون** (سورہ نور)(یعنی پھر جب صور پھونکا جائے گا تو ان کے(انسانوں کے) درمیان کوئی رشتہ نہ رہے گا۔نہ وہ ایک دوسرے سے بات پوچھیں گے۔)نیز فرمایا گیا ہے:**لن تنفعکم ارحامکم ولا اولا دکم یوم القیمۃ** (یعنی تمہارے رشتے اور تمہاری اولاد قیامت کے دن ہرگز تمہیں نفع نہیں پہنچائیں گے۔**فمن ثقلت موازینہ فاولیک ھم المفلحون** (یعنی جن کا (نیکی کا) پلڑا بھاری ہوگا۔وہ کامیاب ہوں گے۔)حضرت عمر فاروقؓ سے یہ کلمہ لایعنی منسوب کرنا'' غلامی اہل بیت ضمانت جنت ہے۔'' اس بد گو شیعی کی احمقانہ جسارت ہے۔شیعہ تحریک حقیقتاً عجمی پیداوار ہے۔شیعی اہل عجم کو حضرت ممدوح سے خاص عداوت تو اسی وجہ سے ہے کہ آپ ہی کے مبارک ایام خلافت میں ایران فتح ہوکر درفش کاویانی کا پرچم ہمیشہ کے لیے سرنگوں ہوکر اسلام کا بول بالا ہوا تھا۔ایک ایرانی شاعر ضیائے کردی ہی نے صحیح بات کہہ دی ہے:

بشکست عمرؓ پشت ہرمزان عجم را
برباد فنا داد رگ و ریشۂ جم را
ایں عربدہ برغصب خلافت زعلیؓ نیست
باآلِ عمرؓ کینہ قدیم است عجم را

اہل البیت سے کلام اللہ میں مراد صرف ازواج نبی کریم ﷺ ہی سے ہے سورۂ احزاب کے چوتھے رکوع میں یانساء والنبی کہہ کرازواج رسول اللہ ہی سے خطاب ہے ان ہی کونصیحتیں ہیں اوران کو رجس سے پاک کرنے کاوعدہ ہے۔ان ہی کواہل البیت (اہل خانہ) فرمایا گیاہے۔آنحضرت ﷺ کسی اورقرابت دار کے لیے چچاہوں یا بیٹی یہ قرآنی لفظ استعمال کرناتحریف معنوی کےمرادف ہے۔بیٹی جوان ہوکر بیاہی جائے وہ اپنے شوہر کی اہل بیت ہوگی نہ کہ اپنے والد کی اہل بیت کہلا سکے گی۔

اس کتاب سیرۃ امام اعظم ابوحنیفہ کے فاضل مؤلف نے مورخانہ معیار تحقیق و ریسرچ سے امام صاحب کے مذہب ومسلک کے ہرپہلوکوبالوضاحت بیان کرکے ان اکاذیب وخرافات کی حقیقت عیاں کردی ہے جواموی وعباسی خلافت کےمخالفین نے امام صاحب کے وقائع زندگی کے سلسلے میں اپنے ذہن سے تراش تراش کرمشتہر کیں۔شیعہ کتابچہ نویس ایک طرف توامام اعظم کومذہباً شیعہ بتاتا ہے۔پھر یہ بکواس بھی کرتا ہے کہ قاضی ابویوسف نے ایک مکمل فقہ تیارکرکے اپنے استادابوحنفیہ کی طرف منسوب کردیا اورفقہ حنفی وجود میں آکرحکومت عباسیہ کا قانون بن گئی اور پانچ سو برس تک اسے حکومت کی سرپرستی حاصل رہی۔اس وجہ سے کثیر التعداد مسلمان اس کے سپرد ہوگئے ورنہ ابوحنیفہ کی نہ کوئی فقہ ہے نہ وہ کسی مدرسہ فقہ کے بانی تھے نہ انہیں اپنی زندگی میں کوئی ایساامتیاز حاصل تھا۔

قاضی ابویوسف نے ابوحنیفہ کوامام اورمجتہد بنادیا ورنہ کوئی انہیں جانتا بھی نہیں (ص ۸۷) اس متعصب شیعہ کوکیا معلوم کہ اسلام کےمشہوراماموں میں کسی کے اتنے اصحاب و شاگردنہیں ہوئے جتنے امام ابوحنیفہ کے ہوئے۔فاضل مؤلف کتاب نے چند جلیل القدر

شاگردوں کے حالات یہی بیان کر دیے ہیں۔امام الکردری نے سات سوتیں مشاہیر علمائے کرام کے نام بقید نام ونسب لکھے ہیں جومختلف دیاروامصار میں آپ کے شاگرد تھے۔علامہ ابن الندیم نے اسی بہتات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

العلم برا وبحرًا شرقا وغرباً بعداً اوقرباً تدوینه رضی الله عنه یعنی دورو نزدیک مشرق ومغرب اور خشکی وتری میں ابوحنیفہ ہی کا علم پھیلا تھا (الفہرست ،ص۲۰۰) شیعوں کے کسی امام کے علمی وسعت کا ایسا کوئی تذکرہ کہیں نہیں الغرض فاضل مؤلف کی یہ کتاب حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے سوانح حیات اور آپ کے گرانقدر علمی خدمات کا جوخلفائے عباسی کے ایما اورسرپرستی میں انجام دیں، آئینہ ہے۔محبّ ومکرم جناب عبدالعزیز صاحب کانپوری انجینئر (فردوس کالونی) اور بعض دوسرے صحیح العقیدہ مخلص صاحبان کاشکریہ واجب ہے۔جن کے تعاون وہمت افزائی سے یہ کتاب منظر عام پر آسکی۔

احقر محمود احمد عباسی، کراچی

۲؍رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ/۳؍نومبر ۱۹۷۰ء

CSCR

حوالہ جات

۱ شوشتری عہداکبری میں لاہور کے قاضی تھے اور بقول شیخ علی حزین شیعی تقیہ سے سنی بنے ہوئے تھے۔اپنی تالیفات میں جوخفیہ رکھتے تھے۔خصوصاً کتاب مجالس المومنین میں اکابر صحابہ کی سخت مذمت وبدگوئی کی ہے۔علمائے حق کی شکایت پر جہانگیر بادشاہ کے دربار میں طلب ہوئے۔اپنی کتاب میں صوفیہ کے تذکرے بھی درج کیے ہیں۔بادشاہ کے پیراور روحانی باپ شیخ سلیم چشتی کے بارے میں پوچھا گیا۔اجل گرفتہ شوشتری کی زبان سے بردایت مؤلف ''سوانح شہید ثالث''،'' قرم ساق سگ پدر نا تحقیق'' کلمات نکلتے ہی سزاعاً زبان گدی سے کھنچوا کر قتل کرادیا گیا۔یہ واقعہ ۱۰۱۹ھ کا ہے۔

CSCR

پیش لفظ

الحمد لله وسلام علی عباده الذین اصطفے محمد خیر الوری و خلفایه اعلام الهدی. اما بعد

اہل پاکستان کی غالب اکثریت حنفی المذہب ہے لیکن امام اعظم ابوحنیفہ کے متعلق عہد حاضر کے جن اہل قلم نے کتابیں لکھیں، کتابچے شائع کیے اور اخباروں، رسالوں میں مضامین طبع کرائے ان میں بلا تحقیق ایسی باتیں لکھ دیں جو عقلاً و نقلاً قابل قبول نہیں۔ یہ غلطیاں زیادہ تر تاریخی اعتبار سے ہیں۔ آپ کی شخصیت، میلان طبع اور مواقف اور پھر آپ کے سلسلہ تلمذ کے بارے میں بے پایہ اور خلاف واقعہ باتیں لکھ کر بعض لوگوں نے یہاں تک ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آپ شیعہ تھے۔ یا شیعت کی طرف رجحان رکھتے تھے نرم سے نرم بات یہ کہی گئی ہے کہ آپ کی ہمدردیاں آلِ علی میں سے ان حضرات کے ساتھ تھیں جو وقتاً فوقتاً خلافت قائمہ کے خلاف کھڑے ہوئے۔

اس خود ساختہ نظریے کے تحت یہ بھی ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی گئی ہے کہ حضرت امام کے نزدیک گویا اصحاب رسول ﷺ کا قائم کردہ نظام خلافت صحیح نہیں تھا۔ یعنی خلفائے اسلام کی یہ حیثیت نہ تھی کہ ان کے ساتھ تعاون کیا جائے اور شرعی بنیاد پر انہیں امام تسلیم کر کے ان کی اطاعت کی جائے۔ حضرت امام کی طرف یہ تصور منسوب کر کے ایسی فضا قائم کی گئی ہے کہ خلفاء بھی گویا ان سے اور ان کے شاگردوں سے کھٹکتے تھے، انہیں ایذائیں دیتے تھے

اور کوشش کرتے تھے کہ ان حضرات کے نظریات امت میں پھیلنے نہ پائیں۔

یہ سب باتیں خلاف واقعہ ہیں ۔اس سلسلے میں صدیوں بعد کے راویوں کی غلط بیانیوں پر تکیہ کیا گیا ہے اور جن غیر محتاط مصنفوں نے اپنی کتابوں میں یہ بے حقیقت باتیں درج کردیں، انہی کو عہد حاضر کے لوگ اپنا ماخذ بنا کر بے سوچے سمجھے یا بالقصد ایک منصوبے کے تحت نقل در نقل کرتے چلے جاتے ہیں۔اگر متقدموں کی کتابیں اور قریب العہد مصنفوں کی تحریروں سے بعد کے لوگوں کی روایات کا مقابلہ کرلیا جاتا تو صحیح صورت حال سامنے آجاتی علاوہ ازیں یہ بھی دیکھنا تھا کہ حضرت امام مجتہد مطلق ہیں اور امت کی غالب اکثریت ان کے اجتہاد پر عمل کرتی ہے۔اس لیے ان اہل تصنیف کی حقانیت کا تقاضا تھا کہ وہ حضرت امام کے شاگردوں اور متوسلوں کے موقف پر بھی نگاہ ڈالتے اور غور کرتے کہ جو باتیں امام صاحب کی طرف منسوب کردی گئی ہیں وہ ان کھلے ہوئے مدّون مذہب سے بھی مطابقت رکھتی ہیں یا نہیں۔

معتبر ترین مآخذ کی روشنی میں جو باتیں سامنے آتی ہیں اور امام صاحب کے مذہب سے بداہتاً عیاں ہیں، ان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب پوری طرح جماعت سے وابستہ تھے۔شیعیت کی ان میں رمق بھی نہ تھی اور تعلیمات نبویہ کے مطابق وہ اجماع صحابہ کو حجت شرعیہ جانتے تھے۔جماعت اور اس کے امام سے وابستگی ان کے نزدیک فرائض ملیہ میں تھی۔خلیفۂ وقت کی اطاعت اور اس کے ساتھ تعاون، ان کی زندگی کا اصول تھا، وہ کسی درجے میں بھی امام جماعت کے خلاف خروج و بغاوت کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔

لوگوں نے فرقہ وارانہ اور نسلی جذبات کے تحت یہ تصور دلوں میں جاگزیں کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے ائمہ اور خلافت قائمہ کے درمیان دوئی تھی اور خلفائے کرام اپنے عہد کے علماء و فقہا پر حریفانہ نگاہ ڈالتے تھے یعنی وحدت امت مفقود تھی اور بجائے اس کے کہ تمام انفرادی و اجتماعی امور ملیہ خلیفہ و امام وقت کی قیادت میں انجام پائیں۔صورت یہ بتائی جاتی ہے کہ امت کی قیادت بٹ گئی تھی۔علماء و فقہا عوام کو ایک راہ لگانا چاہتے تھے اور خلفاء دوسری راہ پر۔ گویا اس طرح ایک طرف یہ جتایا گیا کہ امت سیاسی معاملات سے بے نیاز ہوگئی تھی۔

اسے پروانہ رہی کہ حکومت وقت کیسی ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں اور دوسری طرف اس کی شہرت دی گئی کہ خلفاء بھی من مانی کرتے تھے۔ امت کی فلاح و بہبود سے انہیں غرض نہ تھی جور و استبداد پر ان کا مدار تھا۔ کیونکہ علماء و فقہاء نے یہ وتیرہ اختیار کر رکھا تھا کہ خلافت قائمہ سے عدم تعاون کریں، ان کے مناصب قبول کرنے پر تیار نہ ہوں اور موقعہ بے موقعہ ان کی مخالفت پر ڈٹے رہیں۔

چنانچہ جو ائمہ فقہ و حدیث امت میں اپنا مقام رکھتے ہیں ان کے متعلق عموماً ایسی روایتوں کو شہرت دی گئی جن سے معلوم ہو کہ وہ حکومت کی اطاعت واجب نہیں جانتے تھے اور حکومت بھی ان پر ظلم و ستم توڑتی رہتی تھی۔ یہ سب خیالی فضا محض اس لیے قائم کی گئی ہے کہ اس سیاسی نظام کی حیثیت شرعی نہ رہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے اجماع سے قائم کیا تھا اور امت اسی نظام کی خوگر ہوگئی تھی۔

پھر جن علماء و فقہا کو حکومت کے مناصب پر دیکھا اور امت میں ان کی مقبولیت پائی۔ یا تو ملت کے اندرونی دشمنوں نے ان کی علمی اور روحانی عظمت کم کرنے کے لیے انہیں خلفا کا آلہ کار بتانے کی کوشش کی یا جب اس طرح کام چلتا نظر نہ آیا تو بیان کیا کہ خلفاء تو ان پر رعب حکومت ڈالتے تھے۔ مگر وہ ان کا رعب مانتے نہ تھے اور ان کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر جہاد اکبر کرتے رہتے تھے۔ یعنی ائمہ فقہ و حدیث اور خلافت قائمہ کے درمیان ہمیشہ خلفشار قائم رہا اور باہمی تعاون و احترام و یک جہتی کے ساتھ فرائض ملیہ ادا کرنے کی سبیل نہ رہی۔

گویا جس امت کو اللہ تعالیٰ نے خیر امۃ فرمایا ہے، اہل عالم کے لیے نمونہ بنایا ہے اور اسے بشارت دی ہے کہ اسے صراط مستقیم پر قائم رکھے گا وہ امت ان کے خیال میں آج تک شرّ امت چلی آتی ہے۔ اصحاب رسول اللہ ﷺ اور ان کے دامن سے وابستہ جماعۃ المسلمین سب کا ایک ہی حال تھا۔ یعنی وہ زمانہ جو خیر القرون کہلاتا ہے اور جو ۲۵۰ھ میں ختم ہوا، اسی مدت میں دین مسخ ہوگیا، امت گم راہ ہوگئی اور بقول مودودی صاحب اس کی قیادت ۴۰ھ کے بعد جاہلیت کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اس تصور کے باوجود دعویٰ کیا جاتا ہے کہ دین اسلام ایک زندہ و پائندہ تحریک ہے۔ جس کا نور پورا ہو کر رہے گا۔ اگرچہ کافروں کو ناگوار ہو۔

لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آخری امت کی فطرت ہی ایسی رکھی ہے کہ یہ کبھی غلط بات پر مجتمع نہیں ہوتی اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی غلط رو شخص اپنے ''نسب و علم و تقدس'' کے دام میں اسے پھنسا سکے یہ جب مجتمع ہوگی تو اس نظریے پر جو اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوگا اور جس میں امت کی فلاح ہوگی ۔اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک صدی کے اندر اندر یہ امت تین چوتھائی متمدن دنیا پر چھا گئی اور تیسری صدی کی نصف سے پہلے پہل اہل عالم پر اپنا ذہنی اور روحانی تفوق اس طرح ثابت کردیا کہ زندگی کے ہر نظام اور اسی کے مقرر کردہ منہاج کی پیروی کر کے دنیا کے لوگ کامیاب ہو رہے ہیں۔

چوتھی صدی ہجری جو تاریخ امت کا سیاہ ترین دور ہے اور جس میں عجمی طاقتوں نے سیاسی تفوق حاصل کر کے دین مبین کو مسخ اور دعوت محمدیہ کو فنا کرنے کی کسی سازش سے دریغ نہیں کیا، وہ اپنی کوششوں میں اسی لیے پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے کہ مسلمانوں نے خیر القرون میں اپنا دین مدّون و محفوظ کرلیا تھا اور اپنا لائحہ عمل ایسا رکھا تھا کہ ہر تخریبی تحریک فنا کے گھاٹ اترتی رہی اور امت کی مجموعی قوۃ نے رہ رہ کر غلبہ حاصل کرلیا۔

تاریخ اسلام کی یہی روئداد ہے۔اسی لیے ملّت کے اندرونی دشمنوں نے عاجز آ کر تصنیف و تالیف کا سہارا لیا اور روایات واہیہ کی بھرمار سے اپنی سیاسی شکست کا بدلہ لینا چاہا۔مگر آنحضرت ﷺ کا یہ معجزہ ہے اور آپؐ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کی کرامت کہ ایسی جتنی بھی روایتیں ہیں ان میں قدرتی تضاد پیدا ہوگیا اور اس طرح ان روایات کی اندرونی و بیرونی شہادتیں ان کے بے پایہ ہونے کی منہ بولتی تصویریں بن کر ابھر آتی ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کے مشہور عالم مناظر احسن گیلانی مرحوم جنھوں نے امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی لکھی، یا مودودی صاحب جنھوں نے حال ہی میں اپنی رسوائے زمانہ کتاب خلافت و ملوکیت لکھ کر امت پر اور خود اپنے اوپر ظلم عظیم کیا ہے، یا مصر کے مشہور مصنف شیخ ابوزہرہ المصری، جنھوں نے ائمہ اربعہ پر کتابیں لکھیں، ان میں کسی نے ان ائمہ کی شخصیتوں اور ان جیسی غیر سیاسی اور علمی ہستیوں کے ''سیاسی'' مواقف پر تبصرہ کرتے ہوئے تحقیق سے قطعاً کام

نہیں لیا۔ بلکہ درایت سے منہ موڑ کر صدیوں بعد کے غیر محتاط مؤلفوں کی متضاد خرافات پر تکیہ کر کے وہ باتیں ان بزرگوں کی طرف منسوب کر دیں جو کسی طرح تاریخی حیثیت سے ثابت نہیں کی جا سکتیں۔

مصری عالم احمد امین کا بھی اس سلسلے میں بڑا مقام ہے۔انہوں نے امت کے ثقافتی ارتقاء وزوال پر فجر اسلام ،ظہر الاسلام وغیرہ کتابیں لکھیں۔ان کا مطمع نظر تو ادب تھا مگر دوسری باتیں بھی آ گئیں ہیں۔عہد حاضر کے ذہنی جمود بلکہ پستی کے زمانے میں شخص واحد کا اس طرح کام کرنا بہت بڑا کارنامہ ہے لیکن افسوس کہ تاریخی امور میں ان کا زیادہ انحصار الاغانی پر ہے جس میں رطب ویابس بلکہ بے پایہ روایتوں کی اتنی کثرت ہے کہ اہل تحقیق کے ہاں اس کی کوئی قیمت نہیں اور وقائع تاریخیہ میں اس سے بے محابا استناد کسی درجے میں درست نہیں سمجھا جا سکتا۔صاحب کتاب اگر چہ نسبتاً اموی ہیں لیکن شیعی المشرب آل حمدان کے دربار سے وابستگی کے سبب وہ غلط راہ پر پڑ گئے اور ایسی لغو باتیں لکھ گئے جن کی رکاکت عیاں ہے۔اس کے باوجود احمد امین نے جگہ جگہ الاغانی سے استناد کیا ہے۔

عوام کو فقہی آرا اور مذہبی نکات سے اتنی دلچسپی نہیں ہوتی جتنی ائمہ کی شخصیتوں کے ذاتی اور صفاتی احوال سے۔اس لیے ملت سے وفاداری کا تقاضا ہے کہ ان حضرات کے بارے میں مقدر بھر تحقیق کر کے بات کہی جائے۔تا کہ ان کے حقیقی خط وخال نمایاں ہوں۔ہمارے پیش نظر چونکہ اس وقت امام اعظم ابوحنیفہ کی شخصیت ہے۔اس لیے ہم ان فضولیات اور لغویات کی تنقیح کرنا چاہتے ہیں جو بے احتیاطی سے یا اپنے مفسدانہ عزائم کے تحت لوگوں نے لکھ ماری ہیں اور برابر انہیں شہرت دے رہے ہیں حتی کہ امام صاحب کو شیعیت سے متہم کر کے لغو بیانی کی جسارت بھی کی گئی ہے۔

علی احمد عباسی

سیدو شریف سوات

شخصیت امام اعظم ابوحنیفہؒ

نام ونسب

امام صاحب کا خاندان عجمی الاصل ہے،عرب خاندان تیم اللات سے جو قبائل الخزرج (انصار) سے کوفہ میں مسکن گزین تھا۔ان کا رشتہ ''ولاء'' تھا۔ولاء تین معنی کے لیے مستعمل ہے ایک یہ کہ آدمی جنگی قیدی بن کر آئے اور وہ ایسا ہو کہ نہ اسے احسان رکھ کر چھوڑا جاسکے اور نہ فدیہ لے کر۔پھر دشمن اس تبادلے میں واپس لینے پر بھی تیار نہ ہو۔ایسے جنگی قیدیوں کومختلف مجاہدوں کامملوک بنادیا جاتا تھااور ملکیت میں دیتے وقت آقااور مملوک دونوں کی معاشرتی حیثیت کاخیال رکھا جاتا تھا۔قانوناً یہ مملوک اپنے آقاؤں کے گھر والوں ہی کی طرح ہوجاتے تھے،ان کے کھانے پینے کاانداز حکماً وہی رکھا جاتا تھا جو گھر والوں کا ہو۔اگران کا آقا انہیں آزادکردے تب بھی یہ اسی خاندان سے وابستہ رہتے تھے اوراسی قبیلے میں ان کا شمار ہوتا تھا اور یہ موالی کہلاتے تھے۔ان مولی القوم منهم [ایک قوم کامولیٰ انہیں میں ہوتا ہے]امام صاحب کے خاندانی ولاء کی یہ صورت نہ تھی۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ غیرعرب آزاد قبائل کوامیرالمومنین اپنی ذاتی سرپرستی میں لے لیں اور جیسے امیرالمومنین ہشام نے بعض قبائل عجم کو یہ شرف بخشا تھا اوروہ موالی امیرالمومنین کہلاتے تھے۔امام صاحب کی ولاء اس معنی میں بھی نہ تھی۔

تیسرا دستور تھا کہ آزاد غیرعرب کسی عربی قبیلے میں رضا کارانہ شامل ہوجاتا تھااوروہ قبیلہ اسے اوراس کے خاندان کوقبول کرلیتا تھا۔حضرت امام صاحب کی ولاء اسی قسم کی تھی۔آپ کے دادا

زوطی نے اپنا رشتہ ولاء قبیلہ تیم اللات سے استوار کرلیا تھا۔جن کا خاندان کوفہ میں مسکن گزین تھا۔اس طرح ان کے حقوق وہی ہو گئے جو اس قبیلے کے تھے۔یہ صورت عرب وعجم کا فرق مٹانے کی تھی۔

امیر المومنین حضرت عمر الفاروقؓ کے عہد مبارک میں جب دیوان مرتب ہوا اور تمام قبائل کے سرکاری وظائف تجویز کیے گئے تو جو لوگ بالولاء کسی قبیلے میں شامل ہو گئے تھے ان کے وظیفے کا معیار بھی وہی رکھا گیا جو اس قبیلے کا تھا۔امام شافعی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب الام میں اس کی بعض تفصیلات دی ہیں۔(ج ۴،ص ۱۵۸،طبع مصر،مکتبۃ الزہریہ)دیوان کا یہ نظام خلافت اسلامیہ میں صدیوں قائم رہا۔امیر المومنین المہدی عباسی کے زمانے تک باقی رہنے کا دستاویزی ثبوت الام کی یہی روایت ہے۔

مملوکوں کو سرکاری وظیفہ نہیں ملتا تھا کیونکہ ان کے تمام اخراجات ان کے آقاؤں کے ذمے تھے لیکن امیر المومنین عثمان الشہید الاکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر ولیدؓ بن عقبہ کی گزارش پر مملوکوں کا بھی سرکاری خزانے سے وظیفہ مقرر کرکے ان کی معاشرتی حیثیت بڑھا دی۔طبری نے یہ بات امام شعبی کے حوالے سے بیان کی ہے۔

امام صاحب کے نسب کے سلسلے میں آپ کے جد بزرگوار زوطی تک سب کا اتفاق ہے اس سے آگے جو کہا گیا وہ بے ثبوت ہے۔بعض لوگوں نے (زوطی) کے باپ دادا کو مسلمان عرب ثابت کرنے کے لیے آپ کا نسب نامہ اس طرح مرتب کرڈالا۔نعمان بن ثابت بن زوطی بن یحییٰ بن زید بن ثابت الانصاری التیمی تیم بن ثعلبہ (السہم المصیب فی الردعلی الخطیب ،ص ۷۳ طبع دیوبند)لیکن یہ محض اندھی عقیدت کی کرشمہ سازی ہے اور کسی درجے میں مستحسن نہیں۔

امام طحاوی نے مشکل آلا ثار میں امام صاحب کا بالولاتیمی ہونا خود ان کی زبان سے اس طرح بیان کیا ہے:

قال ابوعبدالرحمن المقری اتیت ابا حنیفة فقال لی من الرجل؟ فقلت رجل من الله علیه بالاسلام فقال لی لاتقل هکذا و لکن وال بعض هذه الاحیاء ثم انتم الیهم فانی کنت اناکذالک.

[ابوعبدالرحمٰن مقری کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے پوچھا

''کون ہوتم'' میں نے عرض کیا ایک شخص جس پر اللہ نے اسلام کے ذریعے احسان کیا ہے (یعنی نومسلم) آپ نے فرمایا ''یوں مت کہو'' بلکہ ان عرب قبیلوں میں کسی سے رشتہ ولاء قائم کرلو اور پھر تم لوگ انہی میں ہو جاؤ گے خود میں بھی ایسا ہی تھا۔]

گویا تیم اللات سے آپ کی نسبت ولاء کی تھی نہ کہ تیم بن ثعلبہ سے نسبی اور صحیح طریقہ لکھنے کا یہ ہے ''التیمی بالولاء'' ویسے اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو شرف عطا فرمایا ہے اور جس رفعت سے نوازا ہے وہاں نسب کی کیا حاجت۔ آپ کے دادا زوطی اسلام لائے تھے اور ان زوطی کے دادا کا مسلمان یا عرب ہونا قطعاً غلط ہے۔ کوفے میں آنے والے آپ کے پہلے بزرگ یہی زوطی تھے اور یہ وہ وقت تھا جب امیر المومنین علیؓ نے مدینے کے بجائے اس بستی کو اپنا دارالخلافہ بنالیا تھا۔ اس طرح یہ طبعی بات تھی کہ جناب زوطی کو حضرت علیؓ سے عقیدت پیدا ہوگئی۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے فرزند ثابت کو امیر المومنین کی خدمت میں پیش کیا تھا اور آپ نے ان کے لیے دعائیں کی تھیں۔ ان ہی ثابت بن زوطی کے فرزند جناب نعمان (ابوحنیفہ) تھے۔

حیثیت عرفی

طبقے کے اعتبار سے امام صاحب صغار تابعین میں ہیں متعدد صحابہ کرام کی آپ نے زیارت کی تھی، مگر تمام علم آپ کا کبار تابعین کے فیوض پر مبنی ہے۔ تاریخ بغداد میں ہے (ج ۱۴، ص ۳۳۴)

دخل ابوحنيفه يوماً على المنصور وعنده عيسىٰ بن موسىٰ فقال للمنصور هذا عالم الدنيا اليوم. فقال له يانعمان عمن اخذت العلم؟ قال عن اصحاب عمر عن عمر، وعن اصحاب على عن على وعن اصحاب عبدالله عن عبدالله وعن اصحاب ابن عباس عن ابن عباس وما كان فے وقت ابن عباس على وجه الارض اعلم منه قال لقد استوثقت لنفسک

[ایک دن ابوحنیفہ (خلیفہ) المنصور کے پاس آئے وہاں عیسیٰ بن موسیٰ عباسی بھی تھے

انہوں نے المنصور سے عرض کیا،آج ساری دنیا میں یہ سب سے بڑے عالم ہیں (خلیفہ المنصور) نے پوچھا نعمان تم نے کہاں کہاں علم حاصل کیا،عرض کیا اصحاب عمر سے عمر کا،اصحاب علی سے علی کا،اصحاب عبداللہ (بن مسعود) سے عبداللہ کا اور اصحاب ابن عباس سے ابن عباس کا اور ابن عباس کے وقت میں روئے زمین پر ان سے بڑا کوئی عالم نہ تھا۔فرمایا تم نے اپنے نفس کی تکمیل بہت مضبوطی سے کی ہے۔]

اسی طرح ''دیار بکری'' کی تاریخ خمیس میں ہے (ص ۶۴،طبع اولے ،۱۳۰۲ھ)

قال ابوحنیفه دخلت علی ابی جعفر امیر المومنین فقال لی عمن اخذت العلم؟قال قلت عن حمّاد عن ابراهیم عن عمر الخطاب وعن علی بن ابی طالب وعبدالله بن مسعود وعبدالله بن العباس قال بخ بخ استوثقت ماشئت یاایاحنیفه الطیبین الطاهرین المبارکین،رضی الله عنهم.

[امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں میں ابوجعفر (المنصور)امیرالمومنین کی خدمت میں حاضر ہوا،انہوں نے پوچھا تم نے علم کہاں سے حاصل کیا ہے؟ میں نے عرض کیا امام حماد سے انہوں نے امام ابراہیم سے انہوں نے (امیرالمومنین)عمر بن الخطاب سے(امیرالمومنین)علی بن ابی طالب سے حضرت عبداللہ بن مسعود سے اور حضرت عبداللہ بن عباس سے،فرمایا واہ واہ ابوحنیفہ تم نے اپنا مقصد پختگی کے ساتھ بڑے خوب و پاک اور مبارک حضرات سے حاصل کیا ہے،اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو۔]

یہ صورت حال ان دونوں عظیم ہستیوں کی پہلی ملاقات کی ہے اس سے بھی واضح ہوا کہ امام صاحب کو صحابہ کرام کے بجائے ان کے اصحاب سے فیض ہے۔ویسے آپ نے جن صحابہ کرام کی زیارت کی،ان کی وفات ایسے زمانے میں ہوئی کہ حضرت امام ان سے بخوبی استفادہ کر سکتے تھے۔چنانچہ بعض لوگوں نے ان صحابہ سے آپ کی بلاواسطہ روایتیں نقل بھی کی ہیں،لیکن ان کا ثبوت نہیں ملا اور نہ امام صاحب نے ان سے اپنی کوئی روایت بیان کی ورنہ

کتاب الاثار (جوآپ کے شاگردوں نے آپ سے روایت کی ہے) اس میں کچھ تو اشارہ ہوتا۔

وجہ یہ ہے کہ معمر صحابہ اپنے آخری زمانے میں نبی ﷺ کا کوئی ارشاد نقل کرنے سے گریز کرتے تھے کہ کہیں امتدادِ زمانہ کے سبب کوئی غلطی نہ ہو جائے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ امام صاحب کے یہاں روایت بیان کرنے کی شرط بڑی سخت ہے۔ وہ صرف ایسی روایت کرنا جائز سمجھتے ہیں جو بالکل اسی طرح یاد ہو جس طرح پہلی دفعہ سنی۔ امام طحاوی نے بسند متصل لکھا ہے:

قال ابوحنیفہ لا ینبغی للرجل ان یحدث من الحدیث الا بما حفظه من یوم سمعه الی یوم یحدث به

[ابوحنیفہ نے فرمایا کہ کسی شخص کو کوئی حدیث بیان کرنی جائز نہیں جب تک اسے روایت کرتے وقت بالکل اسی طرح یاد نہ ہو جس طرح پہلی مرتبہ سنی تھی۔]

وہ تو اس بارے میں اتنے سخت ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی روایت دیکھے جو اسے پہلے سے زبانی یاد نہ ہو تو وہ اس کی روایت کی بھی اجازت نہیں دیتے (الکفایہ فی علم الروایہ ص ۲۳۲ طبع حیدرآباد، دکن) بہرحال امام صاحب نے جن صحابہ کی زیارت کی وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ **مدینہ طیبہ:** حضرت سہل بن سعد الساعدی (م ۹۸ھ) مدینے میں وفات پانے والے آخری صحابیؓ۔

۲۔ **بصرہ:** حضرت انس بن مالک (م ۷۸ھ) بصرے میں وفات پانے والے آخری صحابی۔ امام صاحب نے ان کی زیارت متعدد بار کی۔

۳۔ **کوفہ:** حضرت عبداللہ بن ابی اوفی (م ۸۷ھ) کوفے میں وفات پانے والے آخری صحابی یہیں صغار صحابہ میں ابوالطفیل عامر بن واثلہ کو بھی دیکھا (م ۱۰۰ھ)۔

بعض لوگوں نے دوسرے صحابہ کے بھی نام لیے ہیں لیکن ان کی زیارت کا ثبوت ملنا مشکل ہے کیونکہ امام صاحب بعہد امیر المومنین عبدالملک ۸۰ھ میں پیدا ہوئے تھے جو صحابہ اوپر مذکور ہوئے ان کی زیارت کر سکتے تھے اور ان سے روایت کا بھی امکان تھا لیکن حضرت عبداللہ بن الحارث بن جزالزبیدی (م ۸۶ھ) جو مصر میں وفات پانے والے آخری صحابی ہیں اور وہیں رہتے

تھے، یا حضرت جابر بن عبداللہ انصاری (م۶۸ھ) کی زیارت کا امکان نہ تھا۔ چہ جائیکہ ان سے بلاواسطہ روایت کریں البتہ حضرت یحییٰ بن معین نے جو جرح وتعدیل کے امام ہیں آپ کی روایت سیدہ عائشہ بنت عجردؓ سے سننے کی توثیق کی ہے اور یہ بڑی سعادت ہے لیکن امام صاحب کے اپنے شاگردوں نے آپ کی جو مرد یات نقل کی ہیں وہ کسی صحابی سے نہیں ہیں بلکہ تابعین سے ہیں۔ بات وہی معلوم ہوئی ہے کہ ان میں سے ہر صاحب شیخ فانی کے درجے میں تھے، انہیں خود ارشادات نبویہ نقل کرنے سے احتراز تھا اور دوسرے امام صاحب کو اخذ روایت کے سلسلے میں بڑی شدت تھی یعنی آپ نے جو کچھ سنا بھی ہو تو اسے روایت نہیں کیا۔ ورنہ سات، گیارہ، اٹھارہ اور بیس برس کی عمر میں آدمی بخوبی روایت کرسکتا ہے۔ خصوصاً جب کہ زمانہ ایسا ہو کہ اصحاب پاک دنیا سے اٹھتے جا رہے ہوں وہ زمانہ تو نہایت حرص کے ساتھ ان کی زیارت کرنے اور ان سے استفادے کا تھا۔ حضرت امام نے جن شیوخ سے استفادہ کیا وہ عموماً ہر قسم کی اندرونی سیاسی سرگرمیوں سے بے تعلق ہو کر محض علمی زندگی میں غرق تھے اور حسب تعلیمات ربانیہ (التوبہ:۱۲۲) انہوں نے اپنے آپ کو ترویج علوم کے لیے وقف کر دیا تھا اور عملی سیاست میں حصّہ لے کر وقت ضائع کرنے پر تیار نہ تھے۔ یہی مسلک امام اعظم کا تھا۔ آپ نے علمی سیاست سے کچھ سروکار نہ رکھا، جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ عملی زندگی میں یکسوئی سے مشغول رہنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ معاش کی طرف سے بے فکر تھے۔ آپ کے ہاں کپڑے کا کاروبار اتنا وسیع تھا کہ معتمد گماشتے دور دور مال لے جاتے تھے، اس آمدنی سے آپ نے تعلیم کی اشاعت کا کام لیا، جہاں کوئی جوہر قابل نظر آیا، اسے معاش کی طرف سے بے فکر کر کے تحصیل علم پر لگا دیا۔ امام یوسف ایسے ہی خوش بخت حضرات میں تھے۔

کوفہ

فتح ایران کے بعد حضرت امام اعظمؓ کے فرمان کے مطابق حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے نیا شہر بسایا، جو عرب وعجم کے درمیان بہت بڑی چھاؤنی تھی اور تہذیبوں کا سنگم تھا۔ اسی لیے صحابہ کرامؓ کی توجہ اس بستی کی طرف بہت تھی تا کہ دین کی جڑیں یہاں مضبوط ہوں اور تہذیبوں

کے تصادم کا نتیجہ تخریبی نہ ہونے پائے۔ چنانچہ بہت جلد یہ شہر دنیائے اسلام کا علمی اور تہذیبی مرکز بن گیا اور یہ سب کچھ اس کے دارالخلافہ بننے سے پہلے ہی ہو چکا تھا، حافظ ابوالبشر دولابی نے کتاب الکنی والاسماء میں حضرت قتادہ کے حوالے سے بیان کیا ہے:

عن قتادہ قال نزل الکوفة الف وخمسون رجلاً من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم واربعة وعشرون من اھل بدر.

[حضرت قتادہؒ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ کوفے میں ایک ہزار پچاس حضرات اصحاب رسول خدا ﷺ میں سے یہاں تشریف لائے اور چوبیس اصحاب بدر۔]

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بانی کوفہ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت حذیفہ بن یمانؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت براء بن عازبؓ وغیرہم کو حضرت فاروق اعظمؓ نے وقتاً فوقتاً یہاں بھیجا تھا، نظم ونسق کے علاوہ یہ حضرات دین کی تعلیم بھی دیتے تھے اور ان میں سب سے بڑی مسند عبداللہ بن مسعودؓ کی تھی۔

اس کے بعد امیر المومنین معاویہؓ کے عہد مبارک ومسعود میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور حضرت جریر بن عبداللہؓ نے مسند ارشاد سجائی۔ علامہ ذہبی فرماتے ہیں:

''کوفے میں عبداللہ بن مسعودؓ، عمار بن یاسرؓ، علی بن ابی طالبؓ جیسے حضرات نیز صحابہ کرام کی کثیر تعداد نے اس شہر کو رونق بخشی۔ پھر علقمہ، مسروق اور اسود جیسے ائمہ تابعین ہوئے۔ پھر شعبی، نخعیؒ، حکیم بن عتیبہ، حماد، ابواسحٰق منصور اور اعمش جیسے ان کے اصحاب ہوئے اور یوں ابن عقدہ کے زمانے تک وہاں علم کی کثرت رہی (یعنی چوتھی صدی تک)۔''

ابوعبداللہ الحاکم کا بیان ہے کہ چوتھی صدی تک وہاں صحابہ کرام کی درسگاہوں کے نشانات باقی تھے فرماتے ہیں:

''میں کوفے میں سب سے پہلے ۳۴۱ھ میں داخل ہوا۔ ابوالحسن بن عقبہ شیبانی نے مجھے ایک ایک صحابی کی مسجد دکھائی اور میں ان سب مسجدوں میں گیا۔ اس وقت یہ

مسجدیں (مراکز علمی کی حیثیت سے) آباد تھیں۔ہم نے اپنا ٹھکانہ حضرت جریر بن عبداللہؓ کی مسجد کو بنایا۔(معرفۃ علوم الحدیث،ص ۱۹۱)

لہذا لوگوں کا یہ بیان صحیح نہیں کہ کوفے کی علمی حیثیت دارالخلافہ بننے کے بعد بنی۔ موفق المکی نے لکھا ہے کہ جب حضرت علیؓ کوفہ تشریف لائے تو وہاں کی مسجدوں کو حضرت عبداللہ مسعودؓ کے تلامذہ سے بھرا پایا۔

لقد ترک ابن ام عبدالعینی ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہولاء سرج الکوفہ

[ابن ام عبد یعنی ابن مسعودؓ نے کوفے میں یہ روشن چراغ چھوڑے ہیں۔]

غرض یہ ہے کہ کوفے میں دارالخلافہ بننے سے پہلے ہی یہ شہر علوم اسلامیہ کا مرکز بن چکا تھا۔حضرت علیؓ کا قیام یہاں جتنے دن رہا وہ زمانہ فتنوں کا تھا۔اس لیے آپ کے فیوض سے اہل کوفہ نے چنداں فائدہ نہیں اٹھایا۔شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

وانما ظهر علم علی وفقهه فی الکوفة بحسب مقام فیها مده خلافة.

[حضرت علیؓ کا علم اور آپ کے فقہ کا ظہور کوفے میں اتنے ہی دن رہا جتنے دن آپ خلافت کے دوران وہاں رہے۔] (منہاج السنۃ،ج ۴،ص ۱۳۷)

پھر فرماتے ہیں:

فانما کان الغالب علمه فی الکوفة ومع هذا فاهل الکوفة کانوا یعلمون القران والسنة قبل ان یتولی عثمان فضلاً عن علی۔

[ان کے (یعنی حضرت علیؓ کے) علم کا ظہور زیادہ تر کوفے میں ہوا۔مگر ساتھ یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت میں تو کیا،وہاں حضرت عثمانؓ کے خلیفہ ہونے سے بھی پہلے کتاب وسنت کا علم عام تھا۔]

ساتھ ہی آپ نے وجہ بتائی ہے۔(ص ۱۴۲)

فان اهل الکوفة التی کانت داره کانو اقد تعلمو الایمان والقران وتفسیره والفقة والسنة عن ابن مسعود وغیره قبل ان یقدم علی الکوفة.

[کیونکہ کوفہ جو آپ کا گھر تھا، وہاں کے لوگ ایمانیات، قرآن اور اس کی تفسیر اور فقہ وسنت کا علم ابن مسعودؓ وغیرہ کی خدمت میں حضرت علیؓ کی تشریف آوری سے پہلے حاصل کر چکے تھے۔]

اسی طرح تصریح فرماتے ہیں: (ص ۱۵۷)

ولما ذهب الى الكوفة كان اهل الكوفة قبل ان ياتيهم قد اخذوا الدين عن سعد بن ابى وقاص وابن مسعود وحذيفه وعمار وابى موسىٰ وغيرهم ممن ارسله عمر الى الكوفة.

[جب وہ (یعنی حضرت علیؓ) کوفے گئے ہیں تو ان کی تشریف آوری سے پہلے ہی اہل کوفہ نے دین کا علم حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت عمارؓ، حضرت ابوموسیٰ وغیرہ حضرات سے حاصل کر رکھا تھا جنہیں حضرت فاروق اعظمؓ نے وقتاً فوقتاً کوفہ بھیجا۔]

محض اتنا ہی نہ تھا کہ اہل کوفہ اس علم پر اکتفا کریں جو انہیں کوفے میں حاصل ہوا بلکہ وہ مدینے میں حاضر ہو کر وہاں سے بھی فیض یاب ہوتے تھے۔ (منہاج السنۃ، ج ۴، ص ۱۴۲)

هو (يعنى اباعبدالرحمن السلمى) وغيره من علماء الكوفة مثل علقمه والاسود والحارث الليثى وزرابن حبيش الذى قراعليه عاصم بن ابى الجنود. اخذ واالقران عن ابن مسعود وكانوا يذهبون الى المدينه فياخذون عن عمر وعائشة.

[وہ (یعنی حضرت ابوعبدالرحمٰن السلمی) وغیرہ علماء کوفہ مثلاً حضرت علقمہ، حضرت اسود، حضرت حارث لیثی، حضرت زر بن حبیش جن سے حضرت عاصم بن الجنود نے تجوید کا علم حاصل کیا، ان حضرات نے قرآن مجید کا علم حضرت ابن مسعود سے حاصل کیا تھا اور پھر مدینے جایا کرتے تھے تاکہ حضرت عمرؓ اور حضرت ام المومنین عائشہؓ سے استفادہ کریں۔]

مواقف اساتذہ

امام اعظم جب تحصیل علم کے قابل ہوئے اور امام حماد کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا تو اپنے اساتذہ کرام ہی کے طریقے پر چلے اور ان اساتذہ کا علم یہ تھا جیسا کہ بیان ہوا کہ جو علوم انہیں کوفے کے دارالخلافہ بننے سے پہلے حاصل ہو چکے تھے۔ان میں حضرت علیؓ کے ایام خلافت سے کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا۔اس لیے کہ حضرت علیؓ کی زندگی کے آخری ایام جو کوفے میں گزرے ان کے لیے اتنے پریشان کن تھے اور ایسی ایسی مشکلات سامنے آتی رہتی تھیں جنہیں حل کرنے سے ہی آپ کو فرصت نہ ملتی تھی۔ان ہنگاموں نے آپ کو ایسا زچ کر رکھا تھا کہ علمی مسند سنبھالنے کا موقع نہ مل سکا۔گویا اس عرصے میں امام اعظم کے اساتذہ کو ان سے استفادے کا جو تھوڑا سا موقعہ ملا اس کی حیثیت ذیلی تھی اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے ارتقاء علمی میں حضرت علیؓ کی تشریف آوری کچھ ممد ثابت ہوئی۔نتیجہ یہ نکلا کہ جو علم ان کے پاس پہلے سے تھا اسی پر وہ مطمئن رہے اور فقہ علوی کی حیثیت ان کے ہاں ثانوی رہی۔شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

واعلم ان اهل الكوفة واصحاب ابن مسعود لعلقمه والاسود وشريح الحارث بن قيس وعبيدة السلماني ومسروق وزربن حبيش وابى وائل وغيرهم كانوا يضاون علم عمروابن مسعود دون قول عليؓ.

[جان لو کہ اہل کوفہ اور اصحاب ابن مسعود، مثلاً علقمہ، اسود، شریح، حارث بن قیس، عبیدہ سلمانی، مسروق، زر بن حبیش اور ابو وائل وغیر ہم، حضرت عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کے علم کو حضرت علیؓ کے علم پر ترجیح دیا کرتے تھے۔] (منہاج السنۃ، ج ۴، ص ۱۴۰)

حضرت شریح جو امیر المومنین حضرت علیؓ کے قاضی تھے وہ فقہی مسائل میں اپنا اجتہاد کام میں لاتے تھے۔(منہاج السنۃ، ج ۴، ص ۱۴۱۔۱۴۲)

وشريح قاضيه (اى قاضى امير المومنين على) انما تفقه على معاذ بن جبل باليمين وكان يناظره في الفقة ولا يقلده.

[ان کے (یعنی) امیر المومنین علیؓ کے قاضی (حضرت) شریح نے تمام علم حضرت معاذ بن جبلؓ سے یمن میں حاصل کیا تھا اور فقہی مسائل میں وہ ان سے (یعنی حضرت علیؓ سے) مناظرہ کیا کرتے تھے اور ان کی تقلید نہیں کرتے تھے۔]

حضرت علیؓ کے ایک دوسرے قاضی حضرت عبیدہ سلمانی کا بھی یہی حال تھا۔ان کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت علیؓ نے کوفے میں فرمایا میں پہلے تو ام الولد کو فروخت نہ کرنے کے سلسلے میں خلفاء پیشن کے مطابق رائے رکھتا تھا لیکن اب میری رائے یہ ہے کہ اسے فروخت کیا جاسکتا ہے۔اس پر آپ کے قاضی عبیدہ سلمانی نے اٹھ کر کہا: ''آپ کی جو رائے جماعت کے ساتھ تھی وہی ہمیں آپ کے اکیلے کی رائے سے زیادہ قابل قبول ہے۔'' آپ نے فرمایا: ''اچھا تو جیسا دستور چلا آرہا ہے اسی کو قائم رکھو۔'' مسئلہ یہ تھا کہ جس باندی سے اولاد ہو جائے وہ اپنے آقا کی وفات پر خود بخود آزاد ہو جاتی ہے۔اس لیے ایسی باندی (ام الولد) کو فروخت نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اولاد ہو جانے سے وہ عملاً مثل آزاد بیوی کے ہوگئی۔ایسے ہی اور بھی فقہی اور تفسیری مسائل ہیں، جہاں علماء کوفہ نے اپنی انفرادی رائے کے مقابلے میں اجتماعی مذہب کے مطابق اپنا دستور العمل رکھا۔

ایک مشکل اور یہ آن پڑی تھی کہ حضرت علیؓ کو جو لوگ گھیرے ہوئے تھے وہ آپ کی موجودگی میں بھی غلط بیانی کر بیٹھتے تھے۔آپ کی رائے کے خلاف چلتے تھے اور آپ کی طرف وہ باتیں منسوب کر دیتے تھے، جو آپ کے خواب وخیال میں بھی نہ ہوتیں اور پھر معلوم ہونے پر آپ کو ان کی تردید کرنی پڑتی تھی۔وقائع تاریخی میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں،اس لیے علماء فقہاء کوفہ آپ سے صرف وہی باتیں لیتے تھے جو خود اپنے کانوں سے سنیں اور ہنگامی احوال کے تحت ایسے مواقع کم ہی ہوتے تھے۔نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اہل کوفہ آپ کے علم سے وہ فائدہ نہ اٹھا سکے جو پُر امن ماحول میں اٹھاتے،آپ کی طرف غلط باتیں منسوب کرنے کا یہ عالم تھا کہ حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں آپ کے فتاوے کا ایک مجموعہ پیش کیا گیا تو آپ نے قلم اٹھایا اور کاٹتے چلے گئے۔بار بار فرماتے ''واللہ علی نے یہ ہرگز نہیں کہا ہوگا'' اس مجموعے میں بہت تھوڑی باتیں ایسی رہ گئیں جو حضرت ابن عباسؓ نے آپ کی سمجھیں۔یہ حال تھا اقوال علیؓ کا۔امام مسلم

نے اپنے مقدمے میں یہ واقعہ نقل کیا ہے۔اسی لیے ان حضرات کے ہاں حضرت علیؓ سے سنی ہوئی روایات بہت تھوڑی ہیں اور ایسی کہ ان پر کسی فقہ کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی تھی۔چنانچہ یہ بات وہی رہی جو شیخ الاسلام نے فرمائی ہے کہ علماء کوفہ کے ہاں حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کے ارشادات پر زیادہ تکیہ تھا۔

الشیوخ والفقہاء

علوم نبویہ کے حامل دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شیوخ کہلاتے ہیں یعنی محدث اور دوسرے وہ جنہیں فقیہ کہا جاتا ہے۔شیوخ یعنی محدثوں کا موضوع یہ ہے کہ حدیث کی روایت کریں،اسناد اور متن کی صحت وسقم سے بحث کر کے حدیث کا درجہ متعین کریں۔فقہاء وہ ہیں جو صحیح احادیث کی روایت کے ساتھ ساتھ،ان سے مسائل کا استخراج کریں،خاص و عام حکم کی پہچان ہو اور ناسخ ومنسوخ کا درک رکھتے ہوں۔کتاب وسنت سے کسی مسئلے پر جب اپنا مذہب مرتب کریں تو دلائل و براہین سے اسے ثابت بھی کر سکیں۔

چنانچہ جو حدیث شیوخ سے مروی ہو اس کے مقابلے میں اس حدیث کو ترجیح دی جاتی ہے جس کی روایت فقہا کریں۔خطیب بغدادی فرماتے ہیں۔کہ حضرت وکیع نے حضرت علی بن خشرم سے پوچھا:

ای الاستاذ احب الیکم الاعمش عن ابی وائل عن عبداللہ اوسفیان عن منصور عن ابراھیم عن عقلمہ عن عبداللہ؟"فقلنا الاعمش عن ابی وائل."فقال سبحان اللہ!الاعمش شیخ وابو وائل شیخ وسفیان فقیہ ومنصور فقیہ وابراھیم فقیہ وعلقہ فقیہ و حدیث تداولہ الفقھا؟ خیر من ان یتداولہ' الشیوخ.

[تمہیں کون سی سند زیادہ پسند ہے اعمش روایت کریں ابووائل سے اور وہ عبداللہ (بن مسعود) سے یا سفیان حوالہ دیں منصور کا اور وہ ابراہیم کا اور وہ علقمہ کا اور وہ

عبداللہ (بن مسعود) کا۔ہم نے کہااعمش کی جو روایت ابووائل کے ذریعے ہو۔ فرمایاسبحان اللہ!اعمش شیخ ہیں اورابووائل شیخ ہیں۔لیکن سفیان فقیہ ہیں،منصور فقیہ ہیں،ابراہیم فقیہ ہیں اورعلقمہ فقیہ ہیں جو حدیث فقہا کے ہاں رائج ہو وہ اس سے بہتر ہے جوشیوخ کے ذریعہ رواج پائے۔] (الکفایہ،ص۴۳۶)

اعمش جس حدیث کی روایت ابووائل سے کریں اوروہ ابن مسعودؓ سے اس میں واسطے کم ہوں گے اورایسی حدیث کو''عالی'' کہا جاتا ہے۔محدثوں کے ہاں اس کی بڑی قدر ہے اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ انہیں''عالی'' حدیث ملے۔سفیان سے حضرت ابن مسعودؓتک واسطے زیادہ ہیں مگرراویوں کے فقیہ ہونے کے سبب اسے ترجیح دی جائے گی کیونکہ اسے ان حضرات نے روایت کیا ہے جو دین کے نکات پرعبوررکھتے ہیں۔

یہ وکیع (م ۱۹۸ھ)امام اعظم کے اجلۂ تلامذہ میں ہیں اورامام اعظم ،امام شافعی اور حضرت امام احمد کے اجلہ اساتذہ ہیں۔حدیث کے بارے میں ان کا بیان حجت مانا جاتا ہے۔ یہیں سے امام اعظم اوران کے تلامذہ کاطریقہ کارمعلوم کیا جاسکتا ہے کہ تحصیل علم کے لیے کن حضرات سے استفادہ انہیں عزیز تر تھا۔حضرت امام کے شیوخ کی تعداد چار ہزار بتائی جاتی ہے لیکن استاذ اسے کہتے ہیں جس کی خدمت میں انسان ایک عرصے تک حاضر رہا ہو۔کسی صنف علم میں اس سے تربیت حاصل کی ہواورخود جب درس دینے بیٹھےتواس کے اقوال سے استشہاد کے ساتھ اپنے اجتہاد کی قوت بھی اس کے مذہب سے ثابت کرے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ حضرت امام کاعمومی رجحان اپنے اساتذہ کرام کی طرح فقہ فاروقی اورعلم ابن مسعود کی طرف ہونا چاہیے اورواقعی تھا بھی،جیسا کہ ان کے اپنے بیانوں اوران کے مدّون مذہب سے عیاں ہے ایسا ہونے کی ایک وجہ اور بھی تھی کہ انھوں نے حضرت عطاء بن ابی رباح سے خاص فیض اٹھایا تھااور وہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اورحضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ارشد تلامذہ میں تھے اور یہ دونوں بزرگوار وہ ہیں جنہیں شرف صحابیت کے ساتھ یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ فیوض فاروقی سے بہرہ وافر رکھنے کے سبب ان کا شمار

امت کے عظیم ترین فقہاء میں ہوا۔

اب بعض لوگ بیان کرتے ہیں اور بلاتحقیق بڑی تحدی سے کہ حضرت امام اعظم نے جناب محمد (الباقر) اوران کے فرزند جعفر الصادق سے باقاعدہ تحصیل علم کی تھی اوران دونوں کے علاوہ عبداللہ المحض اور زید بن علی بن الحسین سے بھی انہیں خاص فیض تھا۔اسی لیے ان کے اندر شیعیت کی طرف میلان پیدا ہوگیا تھا۔یہ بیان جس کسی کا بھی ہو از سرتا پا غلط ہے۔اس سلسلے میں شیخ الاسلام بن تیمیہ فرماتے ہیں:

ان ھذا امن الکذب الذی یعرفه من له ادنی علم فان اباحنیفة من اقران جعفر الصادق،توفی الصادق سنة ثمان واربعین و توفی ابو حنیفة سنة خمسین ومائة و کان ابوحنیفة یفتی حیوۃ ابی جعفر والد الصادق وما یعرف ان باحنیفة اخذ عن جعفر الصادق ولا عن ابیه مسئلة واحدۃ بل اخذ عمن کان اسن منهما العطاء بن ابی رباح وشیخه الا صلی حماد بن ابی سلیمان.

[یہ ایک ایسا جھوٹ ہے جسے ادنی علم کا آدمی بھی جانتا ہے کیونکہ ابوحنیفہ تو جعفر الصادق کے ہم طبقہ ہیں۔صادق کی رحلت ۱۴۸ھ کی ہے اور ابوحنیفہ نے ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔ابوحنیفہ تو صادق کے والد ابوجعفر کے زمانے میں فتویٰ دیا کرتے تھے اور ایسی کوئی بات معروف نہیں کہ ابوحنیفہ نے جعفر الصادق یا ان کے والد سے کوئی ایک مسئلہ بھی لیا ہو بلکہ انہوں نے علم ان بزرگواروں سے حاصل کیا جو ان دونوں سے زیادہ معمر تھے جیسے عطاء بن ابی رباح اور ان کے اصل استاد امام حماد ابن ابی سلیمان۔]

رہی یہ بات کہ محمد الباقر عبداللہ المحض یا جعفر الصادق اور زید بن علی بن حسین وغیرہم سے ان کی صحبتیں رہی ہوں،علمی مذاکرات ہوئے ہوں تو کچھ بعید نہیں کیونکہ یہ حضرت مدینے میں رہتے تھے اور امام اعظم جب حج کے موقع پر حرمین شریفین حاضر ہوئے ہوں گے تو ان سے

ملاقات بھی کرتے ہوں گے۔ایک دوسرے کی تعظیم وتکریم بھی ہوتی ہوگی جو اصحاب علم کا شعار ہے۔لیکن اس کے یہ معنی کیسے ہوگئے کہ امام صاحب نے اپنے ان ہم عصر حضرات سے اخذ علم کیا اوراس تعلق سے انہیں شیعہ بتایا جائے۔

علاوہ ازیں دیکھنا چاہیے کہ علوی اکابر مدینے میں رہتے تھے۔امام صاحب کا قیام مکہ معظّمہ میں تو ثابت ہے مگر مدینے میں مستقل طور پر رہنا ثابت نہیں ہوتا لہذا بعض لوگوں کا یہ قول کہ زید بن علی بن الحسین سے امام صاحب نے باقاعدہ تحصیل علم کیا کسی طرح صحیح نہیں۔اول تو اس لیے کہ جب امام صاحب نے ان کے برادر بزرگ محمد الباقر ہی سے اکتساب علم نہیں کیا تو ان سے کیا کرتے۔پھر یہ ہے کہ جناب زید اگرچہ کچھ عرصے کوفے میں رہے مگر یہ زمانہ ان کے سیاسی جوڑ توڑ کا تھا اور خلافت قائمہ کے خلاف وہ خفیہ ریشہ دوانیوں میں مشغول رہے۔اس کا موقعہ ہی کہاں تھا کہ وہ علمی محفلیں منعقد کر سکیں اور لوگ طلب علم کے لیے ان کے پاس آئیں۔ امام اعظم اوران کے اساتذہ کرام کے مسلک کے مطابق یہ مناسب بھی نہ تھا کہ وہ جناب زید کے پاس جاکر اپنی بیعت مشکوک بنالیں جو حسب فرمان نبوی کسی طرح جائز نہیں۔

مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی نے النافع الکبیر لمن یطاح الجامع الکبیر میں رجال حنفیہ کے تحت (ص۱۴،طبع مصطفائی) شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے مذکورہ بالا بیان کی تردید کی ہے اور مشکوۃ المصابیح کے مؤلف ولی الدین ابوعبداللہ کے اس بیان کا حوالہ دیا ہے جو انہوں نے رجال مشکوۃ کے تراجم میں جعفر الصادق کی بابت لکھا ہے:

سمع منه الائمة الاسلام الاعلام نحو يحيى بن سعيدو ابن جريح ومالک بن انس والثوری وابن عينية وابو حنيفة

[ان سے (یعنی صادق) سے اکابر ائمہ نے حدیث کی سماعت کی ہے مثلاً یحییٰ بن سعید نے،ابن جریح نے مالک بن انس نے،سفیان ثوری نے،سفیان بن عینیہ نے اور ابوحنیفہ نے۔]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ولی الدین دونوں آٹھویں صدی کے بزرگ ہیں۔اگر بات

ان کے اپنے زمانے کی ہوتی تو ایک کا قول دوسرے کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا تھا۔ گو پھر بھی قرائن سے وجہ ترجیح معلوم کی جاتی یہاں معاملہ ہے دوسری صدی ہجری کا اور اس کے لیے دلیل قریب العہد مصنف کے بیان سے لانی تھی۔ علاوہ ازیں شیخ الاسلام محقق ہیں اور ولی الدین محض ناقل۔ ظاہر ہے کہ ناقل کے مقابلے میں محقق کا قول قابل ترجیح ہے جب تک اس کے خلاف دلیل سامنے نہ آ جائے۔ ولی الدین نے رجال کے تراجم میں تحقیق سے کام نہیں لیا۔ پانچویں، چھٹی صدی ہجری میں جو باتیں مشہور ہو چکی تھیں وہی لکھ دیں مثلاً حضرت سعید بن جبیرؓ اور امیر حجاج بن یوسف کے مابین جو لکھا ہے وہ خاصا افسانوی ہے۔ ایسے ہی امام اعظم کے متعلق وہی خرافات نقل کر دی ہیں کہ امیر ابن ہبیرہ اور امیر المومنین المنصور نے انہیں عہدہ قضا قبول کرنے پر قید و بند اور تازیانوں کی سزا سنا دی اور محبس میں ان کی وفات ہوئی ایسے ہی متعدد رجال کے کوائف جو انہوں نے نقل کیے ہیں وہ اہل تحقیق کے نزدیک قابل قبول نہیں۔

پھر دیکھنا چاہیے کہ شیخ الاسلام کی عبارت میں یہ کہاں ہے کہ امام اعظم اور جعفر الصادق کی کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ ان سے انہوں نے کوئی حدیث ہی نہیں سنی اور ان کے مابین کبھی علمی مذاکرات ہی نہیں ہوئے۔ وہ تو یہ فرماتے ہیں کہ ''یہ بات جانی پہچانی نہیں کہ ابو حنیفہ نے جعفر الصادق یا ان کے والد ماجد سے کوئی ایک مسئلہ بھی لیا ہو'' یعنی انہوں نے اپنے فقہ کی تدوین میں فقہ جعفری سے کوئی مدد نہیں لی اور نہ اپنے دلائل میں انہوں نے اپنے دونوں بزرگواروں کے اقوال کو بطور حجت پیش کیا۔ امام صاحب نے سیکڑوں بزرگواروں سے روایات سنیں ایسے ہی جناب صادق اور جناب باقر سے بھی سنی ہوں گی۔ امام صاحب کو تو اپنے چھوٹوں سے کبھی عار نہ تھا اور یہ دونوں تو بلند پایہ تھے۔ یہاں سوال ان کی شخصیتوں کی بلندی اور ان سے استفادے کی اہلیت کا نہیں۔ بلکہ تاریخی حیثیت سے ان سے استفادے کے ثبوت کا ہے۔ جو نہیں ملتا اور ملتا بھی کہاں سے کیونکہ جسے فقہ جعفری کہا جاتا ہے اس کا ذکر چوتھی صدی ہجری میں اس وقت سامنے آیا جب بویہی شیعہ حکومت نے پر پرزے نکالے اور اس فقہ کی باقاعدہ تدوین صفوی دور میں ہوئی۔

امام اعظم عراقی تھے اور گاہے بگاہے مختصر ساعات میں ان کی ملاقات جعفر الصادق سے ہوئی ہو گی لیکن امام مالک خاص مدینہ میں رہتے تھے اور شاید روزانہ ہی جناب صادق سے ملاقات ہوتی ہو، اب مؤطا شریف موجود ہے اس میں دیکھا جائے کہ جناب صادق سے کتنی روایتیں لی گئی ہیں۔ صرف معدودے چند۔ اس میں کثرت نظر آتی ہے مالک عن نافع عن ابن عمرؓ کی اور یہ سلسلۃ الذہب کہلاتا ہے جو درجہ حضرت امام مالک کے ہاں اس سند کا ہے وہی درجہ امام اعظم کے ہاں ابوحنیفہ عن عطاء عن ابن عباسؓ کا ہے۔

علاوہ ازیں روایت لینا اور بات ہے اور اپنا مذہب متعین کرنا بالکل دوسری بات۔ چنانچہ جن حضرات کے ذریعے فقہ کی تعلیم عام ہوئی ان میں امام ابن قیم کے علم مدینہ کے لیے حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا نام بتایا ہے۔ اہل مکہ کے لیے حضرت ابن عباسؓ کا اور اہل عراق کے لیے حضرت ابن مسعود کا اس ذیل میں جناب جعفرؒ الصادق کا نام نہیں ملتا وہ بھی منجملہ ہزارہا علماء کے تھے، مگر جہاں تک ان سے علم حاصل کرنے کا سوال ہے تو ائمہ فقہ نے اس کے لیے توجہ دوسرے حضرات کی طرف کی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا اخذ روایت اور تحصیل فقہ دو مختلف باتیں ہیں۔ فلاں نے فلاں سے روایت لی تو اس سلسلے میں بیسوں بلکہ سینکڑوں کا نام لیا جاتا ہے لیکن جب کہا جاتا ہے فلان تفقہ علی فلان تو وہاں صرف دو تین ہی نام لیے جاتے ہیں۔ یعنی فلاں نے فلاں کی خدمت میں حاضر رہ کر حدیث و فقہ پر عبور حاصل کیا ہے، استاد ایسے ہی بزرگواروں کو کہا جاتا ہے نہ کہ ہر شخص کو جس سے کسی نے کوئی روایت لی ہو جناب محمد الباقر نے تو امیر المومنین یزید کی والدہ ماجدہ سیدہ میسون سے روایت لی ہے تو کیا انہیں ان کا شاگرد کہا جائے گا۔

امام ابوحنیفہ اور سیاسی ہنگامے

ائمہ فقہ وحدیث کے بارے میں عموماً اور ابوحنیفہ کے متعلق خصوصاً عجیب وغریب روایتیں وضع کی گئی ہیں یا تو ان کی علمی حیثیت گرانے کی غرض سے یا یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ شیعہ تھے یا شیعت کی طرف مائل کیونکہ بقول رواۃ وہ ان طالبیوں اور علویوں کے عقیدت مند تھے جنہوں نے وقتاً فوقتاً خلافت قائمہ کے خلاف خروج اور بغاوتیں کیں۔

اہل تشیع کے نزدیک حضور اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد نزول قرآن کی غایت اور امت مسلمہ کی تشکیل سے غرض طرح طرح سے یہ بتائی گئی ہے کہ دنیا پر آلِ علی کے اقتدار کا پرچم لہرائے اور تا قیامت اسی خانوادے کے ہاتھ میں امت کی زمام کار رہے۔ باقی مسلمان ان کی تابعداری کے مکلّف ہیں اور بس۔ لیکن ہوا یہ کہ نہ آل علی کو سیاسی اقتدار نصیب ہوا اور نہ علمی حیثیت سے وہ ایسا مقام حاصل کر سکے کہ دوسروں کو چھوڑ کر لوگ تحصیل علم اور اکتساب نور کے لیے محض ان کی طرف مائل ہوں اور انہی کے فیوض دنیا میں پھیلیں۔ یوں تو اس علوی خانوادے میں بھی بڑے بڑے حضرات گزرے ہیں جن سے امت فیض لیتی چلی آ رہی ہے مگر مقام اور مرتبے کے اعتبار سے ان کی حیثیت منجملہ دیگر اکابر امت کے رہی۔ امت محمدیہ جیسی غیر طبقاتی امت میں پیدائشی بزرگی کا کیا تصور ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہی کیا گیا جو شکست خوردہ لوگوں کا طریقہ ہے کہ آل علی کے فضائل ومناقب کی موضوعات کے علاوہ ابوطالب تک کے اسلام اور روحانی برتری کے ثبوت کے لیے روایتوں کا ایک طومار باندھ دیا گیا اور غلو میں نصاریٰ کو بھی مات

کر دیا۔ نتیجے میں صحابہ کرام، خلفاء اسلام اور علماء وفقہاء امت پر طعن و تشنیع کا بازار گرم ہو گیا۔

حضور اکرم ﷺ کے صحابہ ایک لاکھ سے زیادہ تھے جن ہزار سے زیادہ کبار صحابہ ہیں ان کی حیثیت ثانوی اور غیر اہم بنادی گئی بلکہ ان کی تکفیر و تفسیق وارتداد تک نوبت پہنچا دی گئی۔ معارف قرآنیہ اور انوار نبوی کا گنجینہ حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کو قرار دیا گیا اور اکابر صحابہ کی موجودگی میں ان کے سامنے ان طالبی اور علوی بچوں کو ان سے افضل واقدس وانور ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ جنہیں نہ تو نبی ﷺ کی صحبت کا شرف نصیب ہوا نہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جان کی بازی لگانے کا اور نہ نشر و اشاعت دین کے لیے حلقائے درس قائم کا۔

لیکن یہ کام چل نہیں سکتا تھا جب کہ امت کے اکابر علماء فقہاء کو بھی کسی درجے میں اپنا ہم خیال ثابت نہ کرلیں تاکہ عوام کو ان روایات واہیہ سے متاثر کر کے سلف کرام سے بدظن کرنے کی مہم سر کی جائے اس غرض سے سب سے زیادہ توجہ امام اعظم ابوحنیفہ کی طرف کی گئی کیونکہ وہ عجمی الاصل تھے اور کوفی ہونے کے سبب یہ بیان قرین عقل باور کرایا جاسکتا تھا کہ ان کی ہمدردیاں آل علیؓ کے ساتھ تھیں اور ان کے نزدیک خلافت قائمہ کے خلاف خروج کرنے میں وہ حق بجانب تھے۔

اس طرح خلفاء اسلام اور ان کے امراء کو جو سیاسیات اسلامیہ کی تشکیل وارتقاء کی ذمہ داریاں اٹھائے ہوئے تھے انہیں دنیا دار ٹھہرا کر ان کے اور ائمہ فقہ وحدیث کے مابین بغض و تنافر کی خود ساختہ روایات کو فروغ دیا گیا حقائق بدیہیہ کو اس طرح دبایا گیا کہ عام تعلیم یافتہ آدمی بہک جائے، نشر واشاعت کی اس کثرت کا نتیجہ یہ مرتب ہوا کہ آج عالم یہ ہے کہ اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ ان خرافات کو واقعات سمجھ کر امت کے ائمہ وخلفاء کا تذکرہ ایسے کرتے ہیں جیسے وہ دشمنان ملت ہوں اور ان کی علمی وروحانی حیثیت بلند نہ ہو۔

امام صاحب کے زمانے میں آل علی میں سے تین اہم شخصیتوں نے خروج کیے۔ یعنی زید بن علی بن الحسین، محمد الارقط بن عبداللہ بن الحسن بن الحسن اور ان کے بھائی ابراہیم نے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت امام کی ہمدردیاں ان تینوں کے ساتھ تھیں اور وہ اموی وعباسی خلفاء کو غاصبِ

خلافت اور نا اہل امامت سمجھتے تھے۔ دیکھنا یہ ہے کہ عقلاً ونقلاً صحیح صورت حال کیا ہے اور یہ کہ ایسا تصور کذب وافتراء تو نہیں۔ چنانچہ کتاب وسنت، مذہب امام، مواقف تلامذۂ امام اور حقائق تاریخیہ سے تو یہ سب کچھ افتراء محض ہی ثابت ہوتا ہے۔

امام ابوحنیفہ اور زید بن علی بن حسین

زید جناب علی (زین العابدین) کے فرزند تھے۔ اپنے والد ماجد اور بردار بزرگ محمد (الباقر) کے برخلاف ان میں غیر معمولی ترفع نفس تھا اور یہ چاہتے تھے کہ ہم نسب اور ہم چشم لوگوں میں اپنا امتیاز قائم کریں، چنانچہ ان کی پہلی جھڑپ اپنے ابن عم عبداللہ المحض بن الحسن بن الحسن بن علیؓ بن ابی طالب سے ہوئی۔

خیبر اور فدک وغیرہ کا جو حصّہ حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد۔ آپ کا خاص کر دیا گیا تھا اور اسے وقف کی صورت دے دی گئی تھی اس کے پہلے متولی حضرت صدیق اکبرؓ ہوئے پھر حضرت فاروق اعظمؓ فاروقی عہد میں یہ تولیت حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے سپرد کر دی گئی۔ عہد عثمانی میں حضرت عباسؓ کی وفات کے بعد اس کے متولی تنہا حضرت علیؓ رہے۔ آل عباسؓ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا، کیونکہ وہ ان سب کے بڑے بھائی تھے اور حق والوں کا حق ان کے ہاتھ میں محفوظ تھا۔

حضرت علیؓ کے بعد ان کے متولی حضرت حسنؓ ہوئے۔ ان کے بعد اس کی مشترکہ تولیت علیؓ بن الحسینؓ اور حسن المثنی بن الحسن کے سپرد ہوئی لیکن علی بن الحسین کے بعد اس کے تنہا متولی حسن المثنی رہ گئے اور ان کے بعد یہ تولیت ہاشمی خاندانی وقف کی ان کے فرزند ارجمند زید بن الحسن المثنی کو ملی (صحیح بخاری، کتاب المغازی حدیث بنی النضیر) پھر ان زید کے بعد یہ تولیت ان کے بھائی عبداللہ المحض کو ملی۔ اس طرح وقف کا انصرام آل حسن کے ہاتھ میں چلا گیا کسی حسینی یا عباسی کو اس پر اعتراض نہ ہوا کیونکہ یہ تولیت تھی اور ناجائز تصرف کا اس پر امکان نہ تھا۔ گویا پورے اموی دور میں اور ابتداء عباسی عہد تک خلفاء اسلام نے اسی حسنی خاندان میں اس

تولیت کا سلسلہ قائم رکھا۔حضرت مروانؒ اور ان کی اولاد امجاد میں جو خلفاء ہوئے،ان کے بارے میں یہ جھوٹی روایتیں مشہور کی گئیں کہ انہوں نے اس جائیداد پر قبضہ کر لیا تھا اور خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے پھر حق داروں کو دے دیا تھا۔

زید بن علی بن حسین کو یہ صورت ناگوار تھی کہ حسینوں میں تولیت رہے وہ تو اس تولیت میں شرکت چاہتے تھے مگر عبداللہ المحض نے تمام بنو ہاشم کی حمایت کے سبب اسے منظور نہ کیا۔ دونوں میں جھگڑا بڑھا۔حتی کہ راویوں کے بقول جناب زید چونکہ کنیز کے بطن سے تھے فریقین کے درمیان قبیح قسم کی بدکلامی بھی ہوئی۔پھر مقدمہ امیر مدینہ کے ہاں پیش ہوا۔وہاں بھی دونوں نے ایک دوسرے کو سخت سست کہا اور باہمی پست قسم کے طعنے دیے اس پر امیر مدینہ نے قریش اور انصار کا جرگہ طلب کر کے اس قضیے کا فیصلہ چاہا لیکن وہ فیصلہ جناب زید کے خلاف ہوا۔ انہوں نے اس کا مرافعہ امیر المومنین ہشام کے ہاں کیا مگر وہاں بھی ناکامی ہوئی۔ایسا ہی ایک مالی جھگڑا ان کا امیر عمر بن امیر المومنین ولید سے ہوا اور اس معاملے میں بھی فیصلہ زید کے خلاف رہا۔اسی قسم کے اور بھی معاملات یعنی زر،زمین کے جھگڑے تھے۔ان سب میں امیر المومنین کے ہاں زید کے مطالبات کی پذیرائی نہیں ہوئی۔طبری نے اپنے تشیع کے باوجود کئی صفحوں پر یہ سب روایتیں تفصیلاً بیان کی ہیں انہیں پڑھ کر کوئی باوقار آدمی مکدر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

غرض یہ ہے کہ جناب زید کا کوئی معاملہ سیاسی،دینی یا نظریاتی نہ تھا صرف مالی تھا اور وہ بھی باہمی پست نزاع پر مبنی۔طبری کی کسی روایت میں کوئی بات ایسی مذکور نہیں جس سے زید کے معاملات میں کوئی رفعت نظر نہ آئے لیکن اپنی ناکامی کے سبب وہ ایسے زچ ہوئے کہ جذبات میں ہیجان پیدا ہو گیا۔کوفے کے سبائیوں نے ان کی نفسیاتی کیفیت بھانپ لی اور انہیں اپنے ہاں بلا کر بغاوت پر ابھارا۔وہ خود بھی امیر المومنین سے اپنے غیظ و غضب میں یہ کہہ کر آئے تھے اخرج ثم لاترانی الاحیث تکرہ (میں جا تو رہا ہوں مگر مجھے آپ ایسی حالت میں پائیں گے کہ آپ کو ناگوار ہو گی) اسی لیے دمشق سے مدینہ واپس ہونے کے بجائے کوفہ پہنچ گئے تھے اور سبائیوں کے بھرّے میں آ کر خروج کر بیٹھے۔

مگر ان کی حسن تدبیر کا یہ عالم تھا کہ وقت پر دوسو آدمیوں سے زیادہ ان کے ساتھ نہ تھے۔ تین براعظموں میں جس اموی امام کا پرچم لہرا رہا تھا اور ہم عصر امت جسے ایک مثالی حکمران سمجھتی تھی اس کے مقابلے میں دوسو آدمیوں کا بغاوت کرنا سوائے فساد فی الارض کے اور کیا تھا۔ اب غور طلب بات ہے کہ شیخ ابوزہرہ جیسے فرزانہ شخص نے ہواپرست راویوں کی یہ روایت قبول کرلی کہ امام اعظم ابوحنیفہ نے اس خروج میں زید کی حمایت کی تھی اور اسے غزوہ بدر کے مماثل قرار دیا تھا مگر عملاً ساتھ دینے کے بجائے کچھ رقم امداد دے کر گھر میں بیٹھے رہے۔

جناب زید کا خروج ۱۲۰ھ کا ہے۔ یعنی اس وقت امام ابوحنیفہ مجتہد مطلق ہونے کے درجے پر نہ تھے، بلکہ ہزارہا علماء میں سے وہ بھی ایک عالم تھے جن کا نہ فتوی کوئی امتیازی درجہ رکھتا تھا اور نہ عمل، ان کے استاد امام حماد یا تو زندہ تھے یا انہیں وفات پائے اور امام صاحب کو ان کی مسند سنبھالے چند ہی دن ہوئے تھے کیونکہ امام حماد کی وفات بھی ۱۲۰ھ ہی کی ہے۔ امام صاحب کی اس وقت یہ حیثیت نہ تھی کہ اپنے شیخ کے موقف کے خلاف کوئی اقدام کریں کیونکہ اس طرح وہ حضرت حماد کے تلامذہ میں اپنا وقار کھو بیٹھتے اختلاف کرنے کا درجہ تو انہیں بہت بعد میں ملا۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر بفرض محال امام صاحب نے اپنے اساتذہ کرام کے موقف سے ہٹنے کی جرات کی اور صمیم قلب سے یہ جانا کہ زید حق پر ہیں ان کے خروج میں مصلحت ملّیہ ہے اور ان کا ساتھ دینا ایسا ہی ہے جیسے غزوہ بدر میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ہو کر کفار سے نبرد آزما ہونا یعنی انہوں نے امت کے متفق علیہ امام ہشام امیر المومنین کو ابوجہل کی طرح سمجھا۔ ان کے اعوان و انصار اور علماء و فقہاء امت کے علاوہ جمہور بنی امیہ و بنو ہاشم کو کفار مکہ کی طرح جانا پھر ان کے مقابلے میں جناب زید کی شان سرور عالم ﷺ کی سی قرار دی اور ان کے نزدیک دوسو کوفی جو جناب زید کے ساتھ میدان میں آئے وہ رسول اللہ ﷺ کے ان ۳۱۳ جانباز ساتھیوں کا درجہ رکھتے تھے جنہوں نے بدر کے میدان میں کفر کا جھنڈا سرنگوں کیا تھا تو امام صاحب کو سو برس بعد بآسانی شہداء بدر کا درجہ حاصل کرنے میں کیا چیز مانع تھی۔

اگر ایک شخص کو اطمینان ہو کہ جان دے کر اللہ کے ہاں اس کا شمار بدر کے غازیوں

اور شہیدوں میں ہوگا تو اسے اس معرکے میں جناب زید کے پہلو بہ پہلو لڑنا تھا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ کچھ مال دے کر گھر میں بیٹھا رہے۔ اللہ اور رسول ﷺ کے نام پر جو بیعت امیر المومنین سے کی تھی اسے بھی توڑا اور حاصل یہ ہوا کہ نہ غازیوں میں رہے اور نہ شہیدوں میں۔ امام صاحب جیسے اعلم واتقی کے متعلق ابوزہرہ اور دوسرے لوگوں کی بیان کردہ روایت ہیچ محض ہے اور کسی درجے میں اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ امام صاحب نے چونکہ زید کا ساتھ نہیں دیا اور نہ امیر کوفہ نے انہیں اس میں ملوث سمجھا۔ اس لیے یہ ناپاک روایت وضع کی گئی ہے کہ امام صاحب نے کچھ روپیہ دے کر ان کی خفیہ مدد کی تھی۔

ان راویوں کو جب اس خفیہ مدد کا علم ہے تو اموی گورنر امیر یوسف ابن عمر جیسے مدبر کو اس کا علم کیوں نہ ہو سکا، انہوں نے امام صاحب کو اعانت جرم کی سزا کیوں نہیں دی جب کہ اس وقت ان کی کوئی خاص نمایاں حیثیت بھی نہ تھی جو امیر کو ان کے قتل پر کسی فتنے کا خدشہ ہوتا کیونکہ زید سے اہم تو اس وقت ان کی شخصیت نہ تھی انہیں جب قتل کر دیا تو امام صاحب کو بھی کر سکتے تھے۔

جس شخص کو تمام امت کے فقہاء کا امام بننا تھا اگر اس کا کردار ایک معمولی صاحب عزیمت کا سا بھی نہ تھا کہ جس بات کو حق جانے اس کے لیے جان دے تو اس کی حیثیت یہ کب رہتی ہے کہ اس کے متعلق امام شافعی فرمائیں الناس عیال لابی حنیفه فی الفقه (لوگ فقہ میں ابوحنیفہ کے پروردہ ہیں) جناب زید کے خروج میں حضرت امام کی ہمدردی ان کے ساتھ ہرگز نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ امام صاحب کا اور ان کے اساتذہ کرام کا کھلا مذہب ہے۔ لانری الخرو ج علی ائمتنا وولاۃ امورنا (ہم اپنے خلفاء اور اپنے امراء کے خلاف خروج کو ناجائز سمجھتے ہیں) سلطان ابوالمظفر عیسیٰ بن ایوب الملک المعظم نے السھم المصیب فی الرد علی الخطیب میں حضرت امام کا یہ قول نقل کر کے آپ کا مفصل فتوی اس طرح بیان کیا ہے:

اذا سمع الامام ان قوما یدعون الی الخروج فعلیه ان ینبذ الیهم ویمسکهم حتی یظهروا توبة. فاذا صارلهم فیئة یرجعون الیها یقتل

مقاتلهم ويجهز جريحهم ويقتل اسرارهم كما يقتل الكفار.

[جب امام سنے کہ کچھ لوگ خروج کی طرف دعوت دیتے ہیں تو ان کا عہد ان پر لوٹا دے (یعنی ان کے شہری حقوق منسوخ کردے) اور انہیں قید کرلے تا آنکہ وہ توبہ کریں۔ اب اگر ان کا کوئی جتھا بن گیا ہو جوان کی حمایت کرے تو ان میں سے جو لوگ مقابلے پر آئیں انہیں قتل کرے ان کے زخمیوں کو مار ڈالے اور ان میں سے جو گرفتار ہو جائیں انہیں ایسے ہی قتل کرے جیسے کافروں کو مارا جاتا ہے۔]

پھر سلطان موصوف فرماتے ہیں:

فمن يكون هذا رايه كيف يرى الخروج على الائمة قال الله تعالىٰ واما تخافن من قوم خيانةً فانبذاليهم على سواء ان الله لايحب الخائنين. وقال لايمضى قضاء قاضى اهل البغى ولا تقبل شهادتهم

[تو جس شخص کی رائے یہ ہو وہ خلفاء کے خلاف خروج کو کس طرح جائز سمجھ سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر تمہیں کسی گروہ کی طرف سے خیانت کا خطرہ ہو تو ان کا عہد ویسے ہی ان پر پھینک مارو۔ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔]

پھر حضرت امام فرماتے ہیں کہ باغیوں کے قاضی کا فیصلہ ناقابل تنفیذ ہے اور ان کے گواہوں کی گواہی ناقابل قبول ہے۔

یعنی باغیوں کے تسلط کے زمانے میں جو عدالتی فیصلے ہوئے ہوں وہ کالعدم قرار دیے جائیں گے اور ان کی سماعت دوبارہ ہوگی۔

سلطان ابوالمظفر الملک المعظم، سلطان غازی صلاح الدین ایوبی کے بھائی تھے۔ ان کا گھرانا شافعی تھا مگر یہ خود حنفی تھے اور اپنی عقیدت ومحبت میں اتنے شدید کہ سوائے امام اعظم کے اور کسی کا قول نہیں لیتے تھے یعنی نہ صاحبین کا اور نہ ان کے تلامذہ میں سے کسی اور کا۔ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں امام اعظم کے متعلق بہت واہی روایتیں لکھ دی ہیں۔ الملک المعظم نے السہم المصیب میں ان پر سخت تنقید کی ہے۔ یہ رسالہ مصر وہندوستان سے شائع ہو چکا ہے۔

ہمارے سامنے دیوبند کا مطبوعہ رسالہ ہے، سلطان موصوف نے جب یہ رسالہ لکھا تو اس وقت آپ نصاریٰ سے برسر پیکار تھے اور نابلس کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ استحضار علمی اور طمانیت قلب کی یہ شان تھی کہ اسی عالم میں یہ رسالہ لکھا۔ حالانکہ کتابیں ساتھ نہ تھیں جیسا کہ خود اس رسالے میں بیان کیا ہے۔ ایسے جامع الصفات ہوا کرتے تھے ہمارے حکمراں۔ جب ہی تو اس دنیا کو نور وحکمت سے بھر دیا اور تہذیب وتمدن کے اس درجے تک امت کو پہنچا دیا کہ اہل عالم کے لیے نمونہ بنی۔

خلفاء اسلام کے خلاف خروج کے بارے میں سلطان موصوف نے امام صاحب کا فتوی نقل کیا ہے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ خلیفہ وامام جماعت کے خلاف کھڑے ہونے والے کسی شخص سے امام ابوحنیفہ کو ہمدردی ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ یہ فتوی کتاب وسنت کے صریح نصوص پر مبنی ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے:

من خلع یدا من طاعة لقی الله یوم القیمة لاحجة له ومن مات ولیس فی عنقه بیعة مات میتة جاهیلة.

[جس نے خلیفۂ وقت کی بیعت سے ہاتھ کھینچا وہ اللہ تعالیٰ کے حضور ایسا جائے گا کہ اس کے پاس کوئی حجت نہ ہوگی اور جو شخص ایسی حالت میں مرا کہ (خلیفۂ اسلام کی) بیعت اس کی گردن میں نہ ہوتو وہ جاہلیت کی موت مرا۔]

فقہ کے چاروں ائمہ اس بارے میں متفق ہیں اور احکام خداوندی کے مطابق ان کا فتوی ایک ہی ہے۔ ''حیات احمد بن حنبلؒ'' سے حضرت امام احمد کا وہ فتوی یہاں نقل کیا جاتا ہے جس کی روایت امام جوزی نے کی ہے جو اخذ روایت میں انتہا درجے کے سخت تھے۔ وہ فتوی یہ ہے:

''امام وقت اور خلیفہ قائم کی اطاعت واجب ہے خواہ وہ فاسق وفاجر ہو یا نیکوکار اور پرہیز گار۔ وہ جب مسند خلافت پر اس طرح متمکن ہو کہ لوگ اس کی امامت پر جمع ہو گئے ہوں اور اس سے راضی ہوں یا وہ بزور شمشیر خلیفہ بنا ہو اور سب لوگ اسے امیر المومنین کہنے لگے ہوں تو کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ ان ائمہ

وخلفاء پر طعن کرے۔......جس شخص نے ایسے امام المسلمین کے خلاف خروج کیا جس پر لوگ اجماع کر چکے ہوں اور اس کی خلافت مانتے ہوں خواہ یہ اقرار برضا ورغبت ہو یا بہ جبر واکرہ تو اس (خروج کرنے والے) نے مسلمانوں کی قوت کو پارہ پارہ کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کے آثار کے خلاف کیا اور اگر وہ اس خروج کی حالت میں مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔''

چنانچہ یہی ارشاد نبوی میں ہے:

عن زیاد بن علاقة قال سمعت عرفجه قال سمعت رسول الله ﷺ یقول سنکون هناة و هناة فمن اراد ان یفرق امر هذه الامة وهی جمیع فاقتلوه کائنا من کان.

[حضرت زیاد بن علاقہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں میں نے (حضرت) عرفجہؓ کو فرماتے سنا، وہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ عنقریب فتنے پر فتنے برپا ہوں گے تو جو شخص امت کا کلمہ متفرق کرنا چاہے اس حالت میں کہ امت متفق ہو چکی ہو تو ایسے شخص کو قتل کر دو اگر چہ وہ کوئی ہو۔] (صحیح مسلم، ج ۲، ص ۱۳۶، طبع مصر)

یہ ہے اللہ کی کتاب، رسول اللہ ﷺ کی سنت، صحابہ کرامؓ کا اجماع اور ائمہ اربعہ کا متفق علیہ فتوی۔ تو ایسی صورت میں اس کا قطعاً امکان نہ تھا کہ امام اعظم کو جناب زید یا بعد میں خروج کرنے والے شخص سے شمہ برابر بھی ہمدردی ہو یا وہ اس خروج و بغاوت کو کسی درجے میں جائز سمجھتے ہوں چہ جائیکہ اسے جہاد کہیں اور غزوۂ بدر کے مماثل بتا کر معاذ اللہ زندقہ و الحاد میں مبتلا ہوں۔

جناب زید کا شمار علماء بنی ہاشم میں ہے۔ واصل بن عطاء کے شاگرد تھے اس لیے رجحان اعتزال کی طرف تھا۔ ان کے متبع انہیں امام کہتے ہیں اور ان کی اس فقہ پر اپنے علم وعمل کی بنیاد رکھتے ہیں لیکن ان کے ہاں امام کا مفہوم وہ نہیں جو اثنا عشریہ کے ہاں ہے نہ وہ انہیں خدا کی

طرف سے مقرر شدہ کہتے ہیں اور نہ معصوم جانتے ہیں۔ان کے ہاں امامت کا مفہوم دینی اور سیاسی سربراہی سے ہے۔ان کے گروہ کی حیثیت پھر بھی جماعت کے مقابلے میں ایک فرقے کی سی ہوگئی اگرچہ وہ اپنے عقائد واعمال میں جماعت سے بہت قریب ہیں یہ اور بات ہے کہ ضعیف اور بعض بے پایہ احادیث جوانہیں اپنے ان زیدی ائمہ سے ملیں انہی پر ان کا مدار ہے اگر جناب زید نے دوست دشمن کی تمیز کی ہوتی ،غدار کوفی سبائیوں کے بہکائے میں نہ آتے اپنے والد ماجد اور بزرگوں کے طریقے پر چلتے اور عدالتی فیصلے خوش دلی سے قبول کر لیتے تو یہ زیدی فرقہ نہ بنتا۔زیادہ سے زیادہ حنفی ،شافعی مذہبوں کی طرح ان کا بھی ایک فقہی مکتبۂ فکر بن جاتا اور ان کا شمار علماءِ سنت میں ہوتا یعنی ان کے خروج کے سبب ان کے فرقے میں جو مبتدعانہ خیالات آگئے اور جماعت کے مسلک سے وہ یک گونہ باہر ہوگئے یہ بات نہ ہوتی۔

علم تاریخ اور علم سیاست کا غیر جانبدار طالب علم ان کے اقدام کو کسی طرح تعمیری نہیں کہہ سکتا۔علامہ شبلی نے بھی دبے الفاظ میں یہی خیال ظاہر کیا ہے۔امت کے متفق علیہ خلیفہ اور عظیم الشان امام ہشام امیر المومنین کے متعلق ان کا مخصوص گستاخانہ لہجہ اپنی جگہ ہے۔فرماتے ہیں:

> ''جس قدر تاریخیں اور رجال کی کتابیں ہمارے سامنے ہیں ان میں کہیں اس کا ذکر نہیں حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو ایک قابل ذکر واقعہ تھا (یعنی امام ابوحنیفہ کا جناب زید کی مدد کرنا۔ع) لیکن اس کی سلطنت نہایت امن وامان کی سلطنت تھی ملک میں ہر طرف امن وامان کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔رعایا عموماً رضامند تھی۔بیت المال میں ناجائز آمدنیاں نہیں داخل ہوسکتی تھیں۔اس حالت میں امام ابوحنیفہ کی مخالفت کی کوئی وجہ نہ تھی۔'' (سیرۃ النعمان ،ص۴۰،طبع دیوبند)

لوگوں نے جو ہوا باندھی ہے کہ اہل کوفہ میں سے اٹھارہ ہزار آدمیوں نے جناب زید سے بیعت کرلی تھی اور ایک لاکھ آدمی ساتھ دینے کو تیار تھے اس کی کوئی حقیقت نہیں اور نہ اس کا امکان تھا۔اوّل تو اس لیے کہ امیر یوسف عمر جیسے جہاں دیدہ اور بیدار مغز والی کی نگاہ سے اختلال کی یہ صورت پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی اور دوسرے صراحتاً جو بات سامنے آئی وہ یہ تھی کہ دوسو

سے زیادہ آدمی جناب زید کے ساتھ نہ تھے۔فوج سے ان کا کوئی باقاعدہ مقابلہ نہیں ہوا۔معمولی شورش تھی جو اچانک نمودار ہوئی اور زید کے کام آجانے پر ختم ہوگئی۔

انتباہ

امام اعظم نے باغیوں کے متعلق جو فتویٰ دیا ہے وہ بظاہر بہت سخت معلوم ہوتا ہے کیونکہ کافروں اور باغیوں کے ساتھ مسلمانوں کا یہ طرز عمل کبھی نہیں رہا کہ زخمیوں اور اسیروں کو قتل کردیا جائے تاریخ اس پر شاہد ہے اور اس پر مثالیں دینے کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ یہ امر بدیہی ہے ہمارے خلفاء اور ان کے تحت وہ سلاطین جو اسلام کے نمایندے تھے انہوں نے نہ کبھی کسی بستی میں قتل عام کرایا نہ اسیران جنگ کو لازماً قتل کیا اور نہ زخمیوں کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔انہوں نے کسی بستی کو یا کھیتوں کو یا باغوں کو کبھی نہیں اجاڑا اور نہ مواشی کو ضائع کیا۔

لیکن امام اعظم رہتے تھے کوفے میں اور انہیں سبائی عزائم معلوم تھے یعنی یہ کہ ان کا مقصد محض سیاسی اختلال پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ نفس دین کو غارت کرنا چاہتے ہیں اس لیے آپ نے یہ سخت فتویٰ دیا اور یہ فرق ہمیں حضرت علیؓ کے عمل سے بخوبی معلوم ہوجاتا۔اصحاب جمل و صفین سے آپ نے قتال کیا جس کی نوبت سبائیوں کی تخریبی کاروائیوں کے سبب آئی لیکن جمل میں فتح پانے کے بعد آپ نے اعلان کردیا کہ نہ کسی فرار ہونے والے کا پیچھا کیا جائے اور نہ کسی زخمی کو مارا جائے (امام شافعی الام، ج ۴، ص ۲۱۶، طبع مصر) ان کا مال بھی نہیں لوٹا گیا۔مورخوں کے بیان کے مطابق ان کا جو مال سبائیوں نے لوٹ لیا تھا وہ سب ان سے لے کر بصرے کی جامع مسجد میں جمع کردیا کہ جس کا ہو لے جائے۔اسی طرح صفین میں ایک اسیر آپ کے پاس لایا گیا تو آپ نے اسے رہا کردیا اور فرمایا ''میں اللہ سے ڈرتا ہوں میں تمہیں قتل نہیں کروں گا)(ہمیں کتاب، ص ۲۲۴)

امام اعظم کے سامنے خروج کرنے والے سبائی تھے جن کے عزائم کی زد میں نفس دین تھا اس لیے آپ کا فتویٰ اتنا سخت ہے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ خود امیر المومنین ہشام نے شورش

رفع کرنے کے لیے امیر کوفہ کو جو فرمان بھیجا تھا وہ بہت نرم تھا یعنی حسب بیان طبری آپ کے احکام کا خلاصہ یہ ہے:

''میں نے دیکھا کہ زید ایک جھگڑالو، چرب زبان اور تقریر میں رنگ آمیزی کرنے والے شخص ہیں انہیں کوفے میں ٹھہرنے نہ دیا جائے کیونکہ وہ لوگوں کو گمراہ کردیں گے انہیں نکال دو کہ سب کی سلامتی رہے اور کسی کا خون نہ بہے۔ میں تفرقے کے مقابلے میں امن پسند کرتا ہوں۔ جماعت اللہ کی مضبوط رسی ہوتی ہے اور اگر تم سے ان کا تصادم ہی ہو جائے تو تم کو اللہ کی مدد اس وقت ملے گی جب تم اوّل اپنی حجت پوری کردو گے۔ جنگ کے بعد ان لوگوں کے اہل وعیال سے کچھ تعرض نہ کرنا اور فوج کو حکم دینا کہ ان کے گھروں میں داخل نہ ہونے پائے امیر المومنین کا طرز عمل اپنی قوم کو مہالک سے بچانے راہ راست پر لانے اور سیدھے راستے پر چلانے میں شفیق والد کی طرح ہے جو اپنی اولاد کو ہر خطرے سے محفوظ کرنا چاہتا ہے۔''

اس فرمان کا نتیجہ تھا کہ معمولی جھڑپ کے علاوہ کچھ نہ ہوا۔ جناب زید کا سر کٹوانا، جُثہ سولی پر لٹکانا، اس پر تازیانے برسانا اور پھر ایک گڑھے میں پھینک دینا وہ خرافات ہیں جو ذہنوں کو ماؤف کرنے کے لیے سبائی راویوں نے وضع کر کے ''زید شہید'' کا لقب دیا ہے۔ جناب زید سے امیر المومنین ہشام کے گوناگوں نسبی اور نسبتی رشتے تھے ایسی صورت میں ان راویوں کی مکروہ باتیں ہرگز قابل اعتنا نہیں۔ اگر ایسے قریب ترین رشتے نہ ہوتے تب بھی ان بہیمانہ حرکتوں کا امکان نہ تھا جو تمام بنو ہاشم کو امیر المومنین سے برگشتہ کردیں اور عام مسلمان بھی برافروختہ ہو جائیں۔ زید کے اس سانحے پر عالم اسلام میں کوئی ہیجان نہ ہونا اس کی بین دلیل ہی ہے کہ ہم عصر امت کے نزدیک کوئی کام شریعت اور اخلاق فاضلہ کے خلاف نہیں ہوا اور اس کی بھی دلیل ہے کہ جناب زید کے خروج کو جائز نہیں سمجھا گیا۔ چہ جائیکہ حضرت امام اعظم کی ہمدردی ان کے ناجائز فعل سے ہو۔

امام ابو حنیفہ اور امیر ابن ہبیرہ

امیر یزید بن عمر جو ابن ہبیرہ کے نام سے مشہور ہیں اموی عہد کے آخری والی کوفہ تھے جنہیں امیر العراقین کہا گیا انہی کے زمانے میں انقلاب آیا اور خلافت عباسیہ قائم ہوئی۔ ولی عہد خلافت حضرت ابو جعفر المنصور عباسی نے انہیں امان دی تھی لیکن ابو مسلم خراسانی جو عربوں کا سخت دشمن تھا۔ اس نے اپنے تمرد اور سرکشی کے سبب یہ امان منسوخ کر دی اور امیر ابن ہبیرہ پر یہ الزام رکھ کر کہ وہ عباسیوں کے بجائے علویوں کی خلافت کے خواہاں ہیں انہیں شہید کرا دیا۔ امیر المومنین المنصور جب خود سریر آرائے خلافت ہوئے تو جن وجوہ کی بنا پر ابو مسلم کو قتل کیا گیا ان میں علاوہ دوسری سخت تر باتوں کے امیر ابن ہبیرہ کا خون ناحق بھی تھا۔

بہر حال چونکہ عراق میں عباسیوں کے داعیوں کا زور بڑھ رہا تھا اور حالات سے انتشار و اختلال کے خطرات اموی حکومت میں پیدا ہو رہے تھے اس لیے امام ابو حنیفہ حجاز چلے گئے اور فتنہ فرو ہونے تک وہیں رہے۔ آپ مکے سے کوفے اس وقت آئے جب خلافت عباسیہ قائم ہو گئی۔ حضرت امام کا اس طرح کوفہ چھوڑ دینا لوگوں کے لیے بہانہ بن گیا اور ایسی ایسی روایتیں وضع کیں جن کا بطلان عیاں ہے۔ تعجب ان مناقب نویسوں پر ہوتا ہے جنہوں نے عرصہ دراز کے بعد یہ مفتریات اپنی کتابوں میں بھر دیں اور اس بین تضاد کا بھی خیال نہیں کیا جو ایسی ہر روایت میں عیاناً موجود ہے اور نہ یہ دیکھا کہ جس امام کی وہ بات کر رہے ہیں اس کے اپنے مواقف کیا ہیں اور اس نے کن امور کی تعلیم دی ہے۔

کبھی آپ کی علمی قابلیت دکھانے کے لیے کہتے ہیں کہ خوارج (یعنی اس وقت کے سیاسی ہنگامہ آرائی کرنے والوں) کی اصلاح کے لیے امیر ابن ہبیرہ نے امام ابن ابی لیلیٰ اور قاضی ابن شبرمہ سے ایک رسالہ لکھوایا لیکن عرصہ دراز کے بعد وہ جو کچھ لکھ کر لائے اسے امیر نے پسند نہیں کیا۔ کسی شخص نے کہا یہاں کوفے میں ایک صاحب ہیں ابو حنیفہ نعمان بن ثابت، وہ ایسا رسالہ لکھ سکیں گے۔ امیر نے آپ کو طلب کر کے ان صاحبوں کا نوشتہ دکھایا تو امام نے فرمایا

اس میں اللہ اور رسول کے علاوہ سب غلط ہے۔ پھر قلم برداشتہ ایسا مقالہ لکھ دیا جو امیر کو پسند آ گیا۔ گویا جو شخص خاص کوفے میں امام حماد کی مسند پر بیٹھا ہے اور اس کا وہاں عظیم الشان حلقہ درس ہے اسے امیر جانتے نہ تھے اور اس کے تعارف کی ضرورت تھی۔ راوی کا مقصد محض قاضی ابن ابی لیلیٰ اور قاضی ابن شبرمہ کی تنقیص ہے کہ وہ ایک معمولی رسالہ بھی نہ لکھ سکے۔ پھر راوی کہتا ہے کہ امام صاحب شورش پسندوں سے نالاں تھے اور حکومت قائمہ سے وفاداری ایسی ضروری جانتے تھے کہ فوراً اس کی تائید میں ایک مسکت رسالہ لکھ دیا۔

اب دوسری روایت کے مطابق اموی حکومت کے امیر نے سیاسی اختلال کے سبب چاہا کہ ایک ''محبّ اہل بیت'' عالم کو اپنے ساتھ ملا کر اپنی حکومت مضبوط کریں۔ چنانچہ امام صاحب کو قاضی بنانا چاہا اور بعض کے نزدیک اینٹیں گننے کا کام ان کے سپرد کرنا چاہا تو امام صاحب نے ''مخالفت حکومت'' ہونے کے سبب انکار کر دیا۔ اس پر امیر نے انہیں قید کر کے روز آنہ کوڑے لگوائے تا آنکہ علماء و فقہاء نے آ کر فریاد کی کہ اگر اس شخص کو رہا نہ کیا گیا تو یہ مر جائے گا۔ امیر نے کہا کہ کوئی آدمی اسے سمجھائے کہ مجھ سے کچھ مہلت لے تا کہ میں اسے چھوڑ دوں امام صاحب نے مہلت مانگی جو دے دی گئی تو چپکے سے مکے فرار ہو گئے۔ یعنی یا تو حالت اتنی سقیم تھی کہ مرنے کے قریب ہو گئے تھے یا اچانک اتنی طاقت آ گئی کہ اونٹ پر بیٹھ کر سیکڑوں میل کا سفر کر ڈالا۔ پھر ایک طرف تو حکومت کے ایسے وفادار تھے کہ جھٹ اس کی حمایت میں رسالہ لکھ دیا، یا ایسے مخالف ہو گئے کہ حکومت کا عہدہ قبول کرنے کے بجائے قید و بند اور کوڑوں کی سزا کو ترجیح دی۔

ایک طرف آپ کا یہ مقام بتایا جاتا ہے کہ اموی حکومت کا ساتھ دیتے تو کوفے میں امن ہو جاتا اور آپ کے ذریعے اختلال سے نجات ملتی یعنی شہر میں آپ کی ایسی اہمیت تھی کہ امیر آپ کی اعانت کے محتاج تھے اور دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ آپ اتنے بے حیثیت تھے کہ قید میں رہے کوڑے کھائے اور اہل شہر نے اس کی پروا بھی نہ کی اور سب ایسے ہو گئے جیسے کچھ ہو ہی نہیں رہا۔ یعنی امام کی شہرت اور مقبولیت بھی ہے اور لوگوں کی ان سے بے تعلقی بھی۔ وہ ایک

طرف محبّ اہل بیت ہیں کہ عباسی داعیوں کو رام کرسکیں اور حکومت کے ایسے طرف دار بھی کہ عباسی داعیوں سے برگشتہ کرنے کے لیے رسالہ بھی لکھ دیا۔

یہ سب متضاد اور پادر ہوا باتیں محض یہ بہتان رکھنے کے لیے وضع کی گئیں کہ امام صاحب کو خلافت قائمہ کا مخالف ثابت کریں یعنی امویوں کا جن کی حکومت قائم تھی اور عباسیوں کا بھی جن کی حکومت قائم ہونے والی تھی حالانکہ سیدھی سچی بات ہے کہ آپ چونکہ خالص علمی آدمی تھے اور غیر سیاسی زندگی کے خوگر۔اس لیے عراق کی مکدر فضا دیکھ کر مکہ معظّمہ چلے گئے۔[۲] حالانکہ نہ امیر اور ان کے درمیان کوئی مخالفت تھی اور نہ عباسی داعیوں سے کوئی ربط یا اختلاف تھا۔رسالہ لکھوانے ،قاضی بنانے کی پیش کش کرنے اور نہ ماننے پر قید و بند کی مصیبت میں مبتلا کرنے کی سب داستانیں بے حقیقت ہیں ان روایتوں کا تضاد ہی ان کے کذب و زور ہونے کی بین دلیل ہے۔

پھر کہا جاتا ہے کہ قاضی ابن ابی لیلی اور قاضی ابن شبرمہ نے امام صاحب کو سمجھایا تھا کہ جس طرح ہم نے امیر کے مجبور کرنے پر حکومت کے مناصب قبول کر لیے ہیں اسی طرح آپ بھی ظلم و تشدد سے بچنے کے لیے امیر کی بات مان لیجیے اس پر امام نے فرمایا یہ شخص اگر مجھ سے واسط کی مسجد کے ستون گننے کو کہے گا تب بھی میں اس کی بات نہیں مانوں گا۔یعنی ہیں تو کوفے میں اور ذکر کر رہے ہیں واسط کی مسجد کا جیسے کوفے کی کسی مسجد میں ستون ہی نہ تھے۔

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ قاضی ابن ابی لیلی اور قاضی ابن شبرمہ امیر ابن ہبیرہ کی ولایت سے پہلے سے محکمہ قضاء سے وابستہ چلے آتے تھے نہ کچھ جبر تھا اور نہ تقیہ۔بلکہ قواعد دینیہ کے تحت خلافت قائمہ سے وابستگی کو ضروری سمجھنے کی وجہ سے یہ حضرات مناصب پر فائز ہوئے اور عملی روحانی فرائض ادا کرنے کے سبب عملی سیاست سے ہمیشہ کنارہ کش رہے تا کہ اگر کوئی سیاسی فتنہ اٹھے تو عوام کے حقوق محفوظ رہیں اور نا اہل لوگوں کا تصرف عدلیہ پر نہ ہو سکے اور سیاسی اختلا ل سے قانون کی حکمرانی پر کچھ برا اثر نہ پڑنے پائے چونکہ ہر اسلامی حکومت میں عدلیہ ایک خود مختار ادارہ ہوتا ہے اس لیے حکومت کے ردو بدل سے عدلیہ پر کبھی آنچ نہ آئی۔

طبری نے ۱۲۰ھ کے احوال کے تحت صراحت کی ہے وعلی قضاء الکوفة ابن شبرمة (کوفے کے قاضی ابن شبرمہ تھے) پھر ۱۲۱ھ کے تحت کہتے ہیں وعلی قضاء الکوفة ابن شبرمة (کوفے کے قاضی ابن شبرمہ تھے) اس کے بعد ۱۲۲ھ کے احوال بتاتے ہیں قاضی الکوفة فی هذه السنة محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ (اس سال کوفے کے قاضی محمد بن عبدالرحمان بن ابی لیلی تھے) یہاں سے یہ بھی عیاں ہوا کہ جناب زید کے خروج کے وقت یہ دونوں بزرگوار کوفے میں موجود تھے اور انہوں نے اس ہنگامے سے کوئی دلچسپی نہیں لی۔

امام ابن قتیبہ نے صراحت کی ہے۔ (المعارف، ص ۲۱۶)

وکان محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلی ولی القضاء لبنی امیة ثم ولیه لبنی العباس وکان فقیهامفتیا بالرای.

[محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلی بنو امیہ کے زمانے میں عہدۂ قضا پر فائز رہے پھر اسی عہدے پر بنوعباس کے زمانے میں بھی رہے۔ وہ فقیہ تھے اور اجتہاد سے فتویٰ دیتے تھے]۔ (یعنی امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کا مذہب ایک تھا۔)

ہمارے علماء وفقہاء کا یہ دستور تھا جیسا کہ بیان ہوا کہ وہ غیر سیاسی زندگی بسر کرتے تھے اور جانتے تھے کہ قواعد شرعیہ کے مطابق امام جماعت سے وابستگی اور اس کے ساتھ تعاون لازم ہے۔ جن حضرات نے کسی عذر کے سبب یا اپنی کمزوری دیکھ کر حکومت کا عہدہ قبول نہیں کیا یا اپنی علمی شان کے خلاف جانا یا دنیوی مصالح سے بے نیاز رہے اور زاہدانہ زندگی بسر کی وہ بھی سب کے سب بالا استثناء جماعت کی بیعت پر استقامت کو فریضہ ملیہ سمجھتے تھے ان کا انکار حکومت کی تحقیر یا اس سے بے تعلقی کے سبب نہ تھا اور نہ اس لیے تھا کہ ان کی نگاہوں میں خلافت قائمہ کی حیثیت آئینی نہ تھی۔

اس زمانے میں ہر بالغ شخص امام وقت سے بیعت کرتا تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی بستی میں بھی یہ بیعت لی جاتی تھی کہ ہر شخص اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو جماعت اور امام سے وابستہ رکھ کر وحدت امت کا تصور دل میں جاگزین رکھے محض مرکز کی طرف سے اعلان پر اکتفا

نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ بیعت خدا اور رسول کی سنت پر لی جاتی تھی اور یہ ناممکن تھا کہ ہمارے علماء وفقہاء و ائمہ جو بیعت خدا اور رسول کے نام پر کریں وہ رسمی ہو اور منافقت سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نام ان کی زبان پر آئے۔

خلافت قائمہ اور علماء وفقہاء امت کے مابین دوئی یا حریفانہ چشمک ثابت کرنے کے لیے جتنی روایتیں وضع کی گئی ہیں وہ سب ملت اسلامیہ کے اندرونی دشمنوں کی ساختہ پرداختہ ہیں اور بے احتیاط لوگوں نے انہیں اپنی کتابوں میں درج کر دیا کبھی عدم مبالاۃ کے سبب اور کبھی بالقصد تخریبی مقاصد کے تحت تاکہ اصحاب رسول اللہ ﷺ نے جو سیاسی نظام اپنے اجماع سے قائم کیا تھا اس کی حجت مسلم نہ رہے۔

انسانی معاشرے میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں خصوصاً جب وہ معاشرہ اتنا وسیع ہو کہ اس کی پہنائی میں کئی براعظم ہوں تو علماء وفقہاء کا ایک گروہ ایسا رہنا چاہیے جو حکومت کے مناصب سے الگ رہے تاکہ ہر قسم کے لوگ ان سے بے تکلف استفادہ کر سکیں اور یوں امت میں اصلاح اور یک جہتی کی فضا قائم رکھنے کی سبیل ہمیشہ کھلی رہے۔ اسی لیے ہمارے بہت سے اکابر نے اپنے آپ کو حکومت کے مناصب سے الگ رکھا اور چونکہ علماء وفقہاء کا یہ بھی فرض ہے کہ امت کو غلط روی سے محفوظ رکھیں اور قانون کی حکمرانی پر حرف نہ آنے دیں اس لیے بہ کثرت حضرات نے حکومت کے مناصب لیے اور امت نے ان دونوں طبقوں سے پورا فائدہ اٹھایا یوں ثقافت اسلامیہ اس سنام اعلیٰ تک پہنچی جس نے اہل عالم کو ششدر کر دیا۔

امام ابوحنیفہ اور امیر حسن بن قحطبہ

۱۳۲ھ۔۱۳۳ھ میں انقلاب حکومت کے بعد امام اعظم ابوحنیفہ مکے سے کوفے تشریف لائے اور ۱۴۵ھ تک اپنے تدریسی اور تجارتی مشاغل میں مصروف رہے۔ پھر اسی سال دارالخلافہ کی تعمیر کے سلسلے میں بغداد تشریف لے گئے۔ ۱۵۰ھ تک قیام وہیں رہا۔ اسی سال آپ نے وفات پائی اور خانوادۂ خلافت کے قبرستان میں دفن ہوئے جو بعد میں مقابر

خیزرانؒ کے نام سے مشہور ہوا۔

بہر حال یہ تو تھی امام صاحب کی بات، اب امیر المومنین المنصور کے ایک سپہ سالار اور دعوت کے مخلص کارکن امیر حسن بن قحطبہ کی بات ملاحظہ ہو۔ وہ اپنے والد ماجد امیر قحطبہ کی معیت میں ۱۳۲ھ سے بھی پہلے سے دور دراز علاقوں میں خلافت اسلامیہ کی خدمات انجام دے رہے تھے اور ۱۳۶ھ سے لے کر ۱۶۸ھ تک شام اور آرمینا کی گونا گوں مہمیں سر کرنے میں مشغول رہے لیکن ہم یہاں اسی وضعی داستان پر توجہ کرتے ہیں جو امام ابوحنیفہ اور امیر حسن بن قحطبہ کی بابت بڑی آب وتاب سے بیان کی جاتی ہے اور بعض مدعیان تحقیق نے اسے اہمیت دی ہے خلاصہ یہ ہے:

''امیر المومنین المنصور کے مظالم میں ان کا ساتھ دے کر حسن بن قحطبہ نے جو گناہ سمیٹے تھے۔ ان کا بوجھ اپنے ضمیر پر محسوس کر کے انہوں نے امام حنیفہ کے ہاتھ پر توبہ کی لیکن امام نے فرمایا کہ تمہیں اپنی توبہ کا حقیقی ثبوت ابھی دینا ہے چنانچہ جب ۱۴۵ھ میں نفس زکیہ (محمد حسنی) کے خلاف المنصور نے حسن بن قحطبہ کو لشکر لے جانے کا حکم دیا تو امام ابوحنیفہ نے فرمایا اپنی توبہ کے واقعی ہونے کا ثبوت تمہیں دینے کا وقت اب آیا ہے۔ وہاں جانے سے انکار کر دو اور اس خون ناحق میں اپنے ہاتھ مت رنگو۔ ابن قحطبہ نے ایسا ہی کیا اور قید کر دیے گئے۔''

جس شخص نے یہ افسانہ گھڑا ہے اسے اطمینان تھا کہ تاریخ کے اوراق پر کون نگاہ ڈالتا ہے اور واقعی وہ اپنے گمان میں سچا تھا کیونکہ لوگ اس افسانے کو اچھال کر حضرت امام کی شیعیت یا شیعیت کی طرف میلان کے ثبوت میں پیش کیا کرتے ہیں حتیٰ کہ ہمارے زمانے کے بزعم خویش ایک بہت بڑے مفکر اسلام نے اپنی رسوائے عالم کتاب خلافت وملوکیت میں پوری تفصیل سے اسے حجت بنایا ہے اور بار بار محمد حسنی کو نفس زکیہ کہہ کر حضور اکرم ﷺ پر جھوٹ بولا ہے کہ آپ نے محمد حسنی کو ان کے مقتول ہونے سے سوا سو برس پہلے ہی نماز جنازہ پڑھ کر النفس الزکیہ فرمایا تھا۔

مگر صحیح صورت حال یہ ہے کہ نہ کبھی امام صاحب اور امیر حسن قحطبہ یکجا ہوئے نہ انہیں محمد حسنی کے مقابلے پر جانے کا حکم دیا گیا اور اور نہ اس کا امکان تھا کہ ۱۴۵ھ میں امام صاحب کسی سے اس کی توبہ کی واقعیت کا ثبوت طلب کرنے کے لیے اسے محمد حسنی کے مقابلے پر جانے سے روکیں کیونکہ امام صاحب اس وقت بغداد میں تھے نہ کہ کوفے میں اور امیر المومنین کے حضور ان کی خدمت انجام دینے میں مشغول تھے نہ کہ ان کے خلاف کسی سیاسی جوڑ توڑ میں اور امیر حسن بن قحطبہ بھی اس وقت بغداد و کوفے سے سیکڑوں میل کے فاصلے پر اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔

محمد حسنی کے خلاف جو فوجی دستہ بھیجا گیا تھا وہ تادیبی مقصد سے تھا لڑنے کے لیے نہیں بھیجا گیا تھا اسی لیے امیر المومنین نے اس کی کمان کسی غیر ہاشمی کو نہیں دی بلکہ اپنے سگے بھتیجے کے سپرد کی اور ہاشمی سادات کا ایک گروہ ان کے ساتھ کر دیا تا کہ جہاں تک ممکن ہو خون خرابے کی نوبت نہ آئے اور اپنے خاندان کے افراد کے سمجھانے سے وہ راہ راست پر آجائیں۔ کسی غیر ہاشمی کی کمان میں یہ دستہ بھیجنے سے یہ مقصد فوت ہو جاتا اور نہ یہ مہم ایسی تھی کہ امیر حسن بن قحطبہ کو سیکڑوں میل دور کے علاقے سے طلب کر کے وہاں بھیجنا ضروری ہوتا۔

طبری کا بیان بذیل وقائع ۱۴۵ھ۔۱۵۰ھ اور اس کی توثیق دوسرے مورخوں کے علاوہ یاقوت حموی کے بیان سے بھی ہوئی ہے جو انہوں نے تعمیر بغداد کے سلسلے میں لکھا ہے:

ان لمنصور وجه فی حشیر الصناع والفعلة من الشام والموصل والجبل والکوفة وواسط والبصرة فاحضروا وامر باختیار قوم من ذوی الفضل والعدالة والفقه و الامانة والمعرفة بالهندسیة فکان ممن حضر لذلک الحجاج بن ارطاة وابوحنیفة النعمان بن ثابت وامر بخط المدینة وحفر الاساسات وضرب اللبن وطبخ الاجر فبدی ذلک. واول مابتدی به فی عملها ۱۴۵ ھ.

[(امیر المومنین) المنصور نے حکم دیا کہ کاریگروں اور مستریوں کو شام، موصل،

جبال، کوفہ، واسط اور بصرے سے جمع کیا جائے چنانچہ یہ لوگ حاضر کر دیے گئے ایسے لوگوں کو متعین کرنے کا حکم دیا جو اپنی فضیلت، عدالت، دین کی سمجھ، امانت اور فن تعمیر میں مہارت رکھتے ہوں چنانچہ جو حضرات حاضر ہوئے ان میں حجاج بن ارطاۃ اور ابوحنیفہ نعمان بن ثابت بھی تھے۔ پھر آپ نے شہر کی داغ بیل ڈالنے، بنیادیں کھودنے اور اینٹیں بنانے اور چونا پکانے کا حکم دیا اور یہ کام شروع کر دیا گیا پہلے پہل اس کام کی ابتدا ۱۴۵ھ میں ہوئی۔] (معجم البلدان، جز ۴، ص ۴۶، طبع بیروت)

یعنی جس وقت محمد حسنی اور ان کے بھائی ابراہیم نے خروج و بغاوت کا اقدام کیا اس وقت امام صاحب بارگاہ خلافت میں حاضر تھے اور تعمیر کے کام کی نگرانی کے علاوہ امیر المومنین نے دوسری خدمات بھی ان کے سپرد کر دی تھیں جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

اس زمانے میں امیر حسن بن قحطبہ کی بابت حسب ذیل تصریحات ہیں:

۱۔ ۱۳۶ھ میں حسن بن قحطبہ آرمینیا میں متعین تھے اور ۱۳۷ھ میں امیر المومنین کے چچا عبداللہ بن علی السجاد کی بغاوت فرو کرنے کے لیے ابومسلم خراسانی کا ساتھ دینے موصل آئے اور یہ مہم سر کر کے پھر آرمینیا چلے گئے (طبری، ترجمہ، ج ۳، ص ۴۷۔۵۷) اسی مہم میں ابومسلم کی تخریبی اور باغیانہ عزائم کا کچھا چٹھا لکھ کر انہوں نے حضرت امیر المومنین کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔

۲۔ ۱۳۸ھ میں جب نصرانی بادشاہ نے شام کے علاقوں پر حملہ کیا تو امیر حسن بن قحطبہ کی مدد کے لیے امیر المومنین کے چچا امیر صالح بن السجاد اور ان کے بھتیجے امیر عباس بن محمد الامام ایک فوج گراں لے کر روانہ ہوئے اس جہاد کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خانوادۂ خلافت کی دو خاتون بھی شریک تھیں یعنی امام علی السجاد کی صاحبزادیاں سیدہ ام عیسیٰ اور سیدہ لبابہ۔

۳۔ ۱۳۹ھ۔۱۴۰ھ میں ابراہیم الامام کے فرزند امیر عبدالوہاب عباسی نے امیر حسن قحطبہ کے ساتھ دوبارہ رومیوں کے خلاف جہاد کیا۔ (البدایہ والنہایہ، ج ۱، ص ۴۷)

۴۔ ۱۴۹ھ میں امیر عباس بن محمد لا امام کی معیت میں حسن بن قحطبہ نے رومیوں کے خلاف ایک اور جہاد کیا۔ (طبری، ترجمہ، ج ۳، ص ۳۳۵)

۵۔ امیر المومنین محمد المہدی عباسی کے عہد میں جب رومیوں نے اسلامی شہروں پر یلغار کی تو امیر حسن بن قحطبہ کے تیس ہزار با قاعدہ سپاہ اور ہزاروں رضا کاروں کے ساتھ روم کے خلاف جہاد کیا۔ (طبری، ج ۳، ص ۴۷۶)

۶۔ اسی طرح خود امیر المومنین المہدی نے جب ۱۶۳ھ میں ولی عہد خلافت ابوجعفر ہارون الرشید کو ساتھ لے کر رومیوں کے خلاف جہاد کیا تو دوسرے فوجی افسروں کے ساتھ امیر حسن بن قحطبہ بھی اسی لشکر میں تھے۔ وکان فی ھذا الجیش الحسن بن قحطبہ۔ (البدایہ)

غرض یہ ہے کہ نہ محض امیر المومنین المنصور کے زمانے میں بلکہ ان کے فرزند کے عہد میں بھی حسن بن قحطبہ ایسے دور کے علاقوں اور ایسی مہموں میں مشغول رہے کہ نہ ۱۳۲ھ سے ۱۴۵ھ تک اور نہ ۱۴۵ سے ۱۵۰ھ تک اس کا کوئی موقعہ تھا کہ امام ابوحنیفہ اور امیر حسن بن قحطبہ یک جا ہوں اور نہ محمد حسنی کے خروج کے وقت امام صاحب کوفے میں تھے اور نہ حسن بن قحطبہ کبھی قید کیے گئے۔ اگر اللہ کی راہ میں جہاد خلفاء اسلام کا ظلم تھا اور اس میں شرکت معصیت تو بے شک امیر حسن بن قحطبہ نے بڑے گناہ کمائے اور ظلم ڈھائے جن سے ان پر توبہ لازم تھی۔

خدا سمجھے ان اہل قلم سے جو ہماری تاریخ کو اس طرح مسخ کرتے ہیں لیکن یہ کرامت صحابہ کرام اور خلفاء عظام کی ہے کہ ملت کے اندرونی دشمنوں نے جتنی داستانیں وضع کیں ان میں ان مجہولوں کو روایت وضع کرنے کے سلیقے سے اللہ تعالیٰ نے محروم رکھا کیونکہ یہ ایسی بے پر کی اڑاتے ہیں کہ تاریخ کے صفحات کا سرسری مطالعہ کرنے والا بھی ہنس پڑے۔

غرض یہ کہ امام ابوحنیفہ پر افترا کہ انہوں نے حکومت کے فوجی افسروں کو عدول حکمی پر ابھارا محض بے بنیاد اور من گھڑت ہے۔

امام ابوحنیفہ اور محمد الارقط حسنی

خلافت عباسیہ ۱۳۲ھ میں قائم ہوئی اندلس کے علاوہ تمام عالم اسلام اس کی بیعت میں داخل ہوگیا۔ امیر المومنین المنصور عباسی کو مسند خلافت پر متمکن ہوئے آٹھ برس ہو چکے تھے کہ محمد الارقط بن عبداللہ بن الحسن بن الحسن بن علیؓ بن ابی طالب نے بغاوت کر دی۔ کہتے ہیں کہ ان کے بھائی ابراہیم بھی اس سازش میں شریک تھے پھر کہتے ہیں کہ ان دونوں نے منصوبہ بنایا تھا کہ مدینے اور بصرے میں بیک وقت خروج کیا جائے۔ ان دونوں نے امیر المومنین سے بیعت نہیں کی تھی اور روپوش تھے مگر ان کے عزیز نیز ان کے والد عبداللہ المحض نے امیر المومنین السفاح اور امیر المومنین المنصور دونوں سے بیعت کی تھی۔ دونوں کے ہاں ان کا احترام تھا اور خصوصی تعلقات تھے اپنے بیٹوں کے انکار کو وہ غیر اہم بتا کر آیندہ بیعت کے لیے انہیں ہموار کرنے کا اطمینان دلایا کرتے تھے مگر تھیں یہ سب باتیں محض برائے گفتن وہ پوری طرح اپنے فرزندوں کے عزائم میں ان کے ہم نوا تھے۔

حصول حکومت کی تڑپ ان میں اس وقت پیدا ہوئی جب دعوت عباسیہ کامیاب ہوگئی اور بنو عباسیہ خلافت پر فائز ہوگئے اب انہوں نے بھی یہی ترکیب چلنی چاہی کہ خفیہ خفیہ اپنے ہم نوا پیدا کریں لیکن کام کرنے کا سلیقہ نہ تھا اور رامت میں خلافت عباسیہ اتنی مقبول تھی کہ انہیں اپنے حمایتی میسر نہ آسکے۔ امیر المومنین المنصور کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اپنے آدمیوں کو ان لوگوں کے پاس اس مقصد سے بھیجا کہ اپنے آپ کو ''شیعہ علی'' ظاہر کر کے سب معلومات حاصل کریں۔ چنانچہ بقول طبری حجت قائم کرنے کے لیے عقبہ ازدی کو ''شیعہ علی'' کی طرف ایک نیازمندانہ خط اور روپیہ دے کر عبداللہ المحض کے پاس بھیجا گیا اور ہدایت کی گئی کہ اپنا اعتبار قائم کر کے انہیں روپیہ دینا اور تحریری جواب بھی لانا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ المحض نے روپیہ لے لیا مگر خط کا جواب لکھنے کے بجائے کہا کہ ہم ان لوگوں کو جانتے نہیں۔ اس لیے تحریر نہیں دے سکتے۔ البتہ سلام انہیں پہنچا دینا۔

امیر المومنین المنصور جب حج کے موقعہ پر مدینے حاضر ہوئے تمام ہاشمی سادات نے خیر مقدم کی سعادت حاصل کی عبداللہ المحض بھی آئے خلیفہ المنصور نے ان کی خوب مدارت کی۔ بعد میں دریافت کیا تم اپنے عہد وفا پر قائم ہو،حکومت کے خلاف کوئی سازش تو نہیں کر رہے؟ انہوں نے جواب دیا بے شک میں اپنے عہد پر قائم ہوں۔امیر المومنین نے عقبہ کو سامنے آنے کا اشارہ کیا اسے دیکھتے ہی عبداللہ گھبرا گئے۔دوزانو ہوکر امیر المومنین سے معافی کی التجا کی مگر انہیں قید کر دیا گیا اور ان کے ساتھ ان کے دو عزیزوں کو بھی جو اس سازش میں ملوث تھے۔

اب سوچنا چاہیے کہ ان لوگوں کے عزائم تو تھے انقلاب لا کر علوی حکومت قائم کرنے کے لیکن جہاں تک اسباب فراہم کرنے، اپنے حق میں رائے عامہ استوار کرنے اور خروج کے لیے موزوں وقت متعین کرنے کا سوال ہے تو اس کی انہوں نے چنداں ضرورت نہیں سمجھی۔ روپیہ اور خط وصول کر لیا اور جن شیعوں کو جانتے تک نہ تھے انہیں سلام بھی کہلوا دیا مگر اس کی تحقیق کی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ شیعہ کہاں ہیں، کتنے ہیں ان کی وفاداری کس حد تک اطمینان بخش ہے اور ان کے وسائل سے انقلابی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں یا نہیں۔

یہ لوگ اس خیالی دنیا میں رہ کر خروج کر بیٹھتے۔ برخلاف ان کے دعوت عباسیہ نے تیس تیس برس کی ہمہ گیر کوششوں کے بعد تمام عالم اسلام کی حمایت حاصل کر کے دو براعظموں میں اپنا پرچم لہرایا۔کہاں دعوت عباسیہ کی ایک عوامی تحریک اور اس کی ہمہ گیر کامیابی اور کہاں محمد بن عبداللہ حسنی الملقب بہ الارقط کے دعوے کی محض یہ بنیاد کہ ''مجھے ہاشم نے دو دفعہ جنا ہے، عبدالمطلب نے دو دفعہ جنا ہے، رسول اللہ ﷺ نے دو دفعہ جنا ہے اور حضرت علی نے دو دفعہ جنا ہے اور میں اس کا بیٹا ہوں جو سب سے پہلے ایمان لایا (یعنی ان کے خیال میں حضرت علیؓ) اور میں اس کا پوتا ہوں جس پر سب سے کم عذاب ہے یعنی ابوطالب۔'' اس نسلی اور شخصی فضیلت جتانے کو انہوں نے خلافت کی اہلیت قرار دیا مگر یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ امت بھی ان تعلیوں پر کان دھرتی ہے یا نہیں۔حصول حکومت کے لیے جو سب سے اہم بلکہ واحد شرط ہے یعنی رائے عامہ کی اپنے حق میں استواری اس کی طرف سے یہ لوگ ہمیشہ غافل رہے۔اس لیے

پیہم ومتواتر ناکامی اور نامرادی ان کا مقدر رہی۔

محمد حسنی ملقب بہ الارقط نے جنہیں سبائیہ نے ''نفس الزکیہ'' کا خطاب دے رکھا ہے اور خود انہوں نے اپنے کو ''مہدی'' بھی کہلوایا تھا۔علم سیاست اور آداب جنگ سے قطعاً بے نیاز ہونے کا ثبوت یہ دیا کہ ان کے خیال میں ان کے شیعوں کی موہوم ہستیاں تو تھیں بلادعجم میں اور بغاوت کا جھنڈا بلند کر بیٹھے مدینے میں۔حالانکہ اہل مدینہ کی بھاری اکثریت ان کے خلاف تھی کچھ لوگ جو ان کے ساتھ ہو گئے تھے وہ اتنے نہ تھے کہ دو چار گھنٹے ہی عسکر خلافت کا مقابلہ کر سکیں۔

امیر المومنین المنصور نے یہ فتنہ فرو کرنے کے لیے جو فوجی دستہ مدینہ بھیجا تھا اس کی کمان اپنے سگے بھتیجے امیر عیسیٰ ابن موسیٰ بن محمد الامام عباسی کے سپرد کی تھی اور یہ اہتمام کیا تھا کہ کوئی ہاشمی گھرانا ایسا نہ رہے جس کے افراد اس دستے میں نہ ہوں۔ان میں سے طبری وغیرہ کے بیان کردہ چند طالبی حضرات کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ قاسم بن حسن بن زید بن حسن بن علی بن ابی طالب۔

۲۔ عبداللہ بن الحسین الاصغر بن علی بن حسین بن علی ابن ابی طالب۔

۳۔ عمر بن محمد بن عمر بن علی ابن ابی طالب۔

۴۔ عبداللہ بن محمد بن عمر بن علی بن ابی طالب۔

۵۔ عبداللہ بن اسماعیل بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب۔

۶۔ محمد ابوالکرام بن عبداللہ بن علی بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب۔

۷۔ قاسم بن عبداللہ بن محمد بن عقیل بن ابی طالب۔

۸۔ ابوعقیل محمد بن عبداللہ بن محمد بن عقیل بن ابی طالب۔وغیرہم

ان حضرات میں دلچسپ شرکت امیر محمد عباسی بن امیر المومنین ابوالعباس السفاح کی تھی جو انہی محمد بن الارقط عبداللہ حسنی کے داماد تھے۔

اس دستے کی ترتیب سے غرض یہ تھی کہ اپنے گھر والوں اور قریب ترین عزیزوں کے سمجھانے سے شاید محمد الارقط حسنی راہ راست پر آجائیں۔تین دن تک ان حضرات نے امان

پیش کی اور باغیوں کو ہر چند سمجھایا کہ اس غلط اور تباہ کن اقدام سے باز رہیں مگر وہ نہ مانے۔البتہ بعض حضرات ان کا ساتھ چھوڑ کر شہر کو واپس چلے گئے۔اب بھی وقت تھا کہ اپنی سو،تدبیر اور بے سروسامانی سے عبرت پکڑیں مگر تیراندازی شروع کر دی۔اس پر ان کے ابن عم قاسم بن حسن نے امیر عیسیٰ سے کہا کہ حجت پوری ہوگئی اور اب قوت سے جواب دینا چاہیے۔چنانچہ رن پڑا اور محمد الارقط بڑی بہادری سے لڑے۔حتیٰ کہ جب تنہا رہ گئے اور اپنے ساتھیوں نے ساتھ چھوڑ دیا تب بھی میدان سے نہ ہٹے۔گرفتار ہونے کے بجائے بے جگری سے جان دی۔عفی اللہ عنہ۔

ان کی فوج میں بھگڈر پہلے ہی مچ گئی تھی کیونکہ ادھر ہنگامہ بپا ہوا اور ادھر سیدہ اسما بنت حسن بن عبداللہ بن عبیداللہ ابن عباسؓ نے اپنی سیاہ چادر مسجد نبوی کے منارے پر لہرا دی۔ باغی سمجھے کہ شہر پر عسکر خلافت کا قبضہ ہوگیا اور مقاومت فضول ہے۔بہر حال یہ حادثہ فاجعہ ہوا اور بے وجہ قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ان کے قتل کے بعد ان کی ہمشیرہ سیدہ زینب اور صاحبزادی سیدہ فاطمہ نے امیر عیسیٰ کے پاس پیغام بھیجا کہ جو ہونا تھا وہ ہوگیا اب مقتول کی تدفین کی اجازت دی جائے۔چنانچہ حسب روایت طبری انہیں باحترام جنت البقیع میں سرکاری اہتمام سے دفن کر دیا گیا۔ان کا سر کاٹنے اور بغداد بھیجنے کی سب روایتیں باطل ہیں۔امیر المومنین نے فوجی دستہ روانہ کرتے وقت اپنے بھتیجے سے فرمایا تھا:''عیسیٰ! میں تمہیں اپنے پہلوؤں کے درمیان (برچھا مارنے) بھیج رہا ہوں۔اس شخص پر اگر قابو پالو تو تلوار میان میں کر کے امان کا اعلان کر دینا۔'' (طبری نیز البدایہ والنہایہ)

یعنی ان کی قرابت قریبہ اور شخصی احترام کا خیال رکھنا جہاں تک ممکن ہو خوں ریزی سے بچنا اور حرم کی حرمت پر حرف نہ آنے دینا ایسی صورت میں افترا پرداز لوگوں کے اس بیان میں کیا صداقت ہوسکتی ہے کہ ان کا سر کاٹا گیا اور جثہ یہود کے قبرستان میں پھینک دیا گیا۔ان کے داماد اور بھائی بھتیجوں کی موجودگی میں نہ ان کا سر کاٹا جاسکتا تھا اور نہ ان کی لاش کی بے حرمتی کا امکان تھا۔پھر اس وقت یہود کے مقابر ہی کہاں تھے۔ڈیڑھ سو برس پہلے ہی وہ برابر کر دیے گئے تھے اور ان کا نام ونشان بھی نہ تھا۔

عن ابی وائل ان علیا قال لابی الھیاج الاسدی ابعثک علی ما بعثنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان لاندع قبراً مشرقاً الاسویۃ ولۃ ثلا الاطمسۃ.

[حضرت ابووائل سے مروی ہے کہ حضرت علیؓ نے ابولہیاج اسدی سے فرمایا: میں تمہیں اس کام کے لیے بھیجتا ہوں جس کے لیے نبی ﷺ نے مجھے بھیجا تھا کہ کوئی نمایاں قبر ایسی نہ رہے جسے تم برابر نہ کرو اور نہ کوئی بت ایسا رہے جسے تم مسمار نہ کردو۔] (جامع ترمذی، ج۱، ص۱۲۵، باب تسویۃ القبور، طبع مجتبائی دہلی)

حضرت علیؓ کا مذہب ہی یہ ہے اور خود ان کی قبر کا تو صحیح طور سے کہیں نام ونشان نہیں۔ محمد الارقط حسنی کی لاش کی بابت سب باتیں کربلا کی داستانوں کی طرح عوام الناس کے جذبات بھڑکانے کے لیے وضع کی گئی ہیں۔ محمد حسنی کی بغاوت کو جہاد کی رفعت دینے کی کوشش بھی اسی لیے کی جاتی ہے۔

ایک اور افترا

شیعی راویوں اور تخریب پسند مصنفوں نے اس وضعی روایت کو بڑی شہرت دی ہے کہ امام مالک نے محمد الارقط بن عبداللہ حسنی کی حمایت میں فتویٰ دیا تھا۔ چنانچہ عمدۃ الطالب کے مصنف کہتے ہیں:

وکان مالک بن انس الفقیہ قدافتی الناس بالخروج مع محمد وبایعہ ولذلک تغیر المنصور علیہ.

[مالک بن انس فقیہ نے لوگوں کو محمد کے ساتھ ہوکر خروج کا فتویٰ دیا تھا اور ان سے بیعت کرلی تھی اسی لیے المنصور ان سے بگڑ گئے تھے۔]

یہ افترا محض ہے اور امام مالک کے کھلے ہوئے مذہب کے بالکل خلاف۔ پھر سوال ہے کہ انہوں نے اگر خروج دیا تھا اور بیعت کرلی تھی تو اس ''جہاد'' میں شریک کیوں نہیں ہوئے؟

اتنی بڑی بات کہ امت کے متفق علیہ امام کی بیعت توڑ دیں اور پھر جس سے بیعت کی ہے اس کا ساتھ بھی نہ دیں، ایسی ناشایستہ بات ہے کہ امام مالک جیسے عظیم المرتبت فقیہ کے متعلق سوچی بھی نہیں جاسکتی وہ تو اپنے مذہب میں اتنے سخت ہیں اور مسلمانوں کے باہمی نزاع سے اتنے متنفر کہ ایک شخص نے جب ان سے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی بابت پوچھا کہ ان میں افضل کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا ''جس شخص نے تلوار اٹھائی (یعنی حضرت علیؓ نے) میں اسے اس شخص سے افضل کیسے کہہ سکتا ہوں جس نے تلوار نہیں اٹھائی۔'' (یعنی حضرت عثمان ذی النورین نے)

طبری نے بھی اس ضمن میں دو متضاد روایتیں لکھی ہیں (ج ۳ ص ۲۰۰) ایک تو یہی جو اوپر گذری ذرا تفصیل کے ساتھ اور دوسری بالکل اس کے خلاف۔

اخبرنی غیر و احد ان مالک ابن انس استفتی فی الخروج مع محمد وقیل لہ ان فی اعناقنا بیعۃ لابی جعفر فقالا انما بایعتم مکرھین ولیس علی کل مکرہ یمین فاسرع الناس الی محمد و لزم مالک بیتہ.

[مجھ سے کئی آدمیوں نے بیان کیا ہے کہ مالک ابن انس سے محمد کے ساتھ خروج کی بابت فتویٰ پوچھا گیا اور ان سے کہا گیا کہ ہماری گردنوں میں ابوجعفر کی بیعت ہے تو انہوں نے فرمایا تم سے یہ بیعت زبردستی لی گئی ہے اور مجبوری کی حالت میں کسی پر کسی قسم کی ذمہ داری نہیں۔ لہذا لوگ محمد کی طرف دوڑ پڑے اور مالک اپنے گھر میں بیٹھے رہے۔]

کن لوگوں نے یہ بیان کیا اور وہ تھے کس حیثیت کے اس کا کچھ ذکر نہیں۔ پھر سوال ہے کہ خود امام مالک نے خلیفہ المنصور سے بیعت خوشی سے کی تھی یا مجبوراً اس کا بھی ذکر نہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ اہل مدینہ سے جبراً بیعت لینے کی صورت کیا تھی۔ یعنی ایک ایک آدمی کو گرفتار کرکے لایا جاتا تھا کہ بیعت کرے اور اس طرح سب بنوہاشم اور مہاجرین وانصار کی اولاد نے تلوار کے ڈر سے یہ بیعت کی تھی اور آٹھ برس سے اس جبر پر صابر وشاکر بیٹھے

تھے، غنیمت وفئی سے حصّے بھی لیتے تھے اور دیوان فاروقی کے مطابق وظیفہ بھی اور پھر کہتے تھے کہ ہم اس حکومت سے راضی نہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ بیعت جبراً لی گئی تھی نہ اہل مدینہ کی اکثریت نے بیعت توڑی۔ نہ امام مالک نے ایسا لغو فتویٰ دیا اور اگر دیتے تو گھر میں نہ جا بیٹھتے۔

اب طبری کی دوسری روایت ہے۔ (ص ۱۷۳)

لما حج ابو جعفر ارسل محمد بن عمران بن ابراهیم بن محمد بن طلحه ومالک بن انس الی اصحابنا فسأ لهم ان یدفعوا الیه محمدا وابراهیم ابنی عبدالله.........

[جب (امیر المومنین) ابوجعفر حج کے لیے آئے تو آپ نے محمد بن عمران بن ابراہیم بن محمد بن طلحہ اور امام مالک بن انس کو ہمارے آدمیوں کے پاس بھیجا اور ان سے مطالبہ کیا کہ عبداللہ کے دونوں فرزندوں محمد وابراہیم کو امیر المومنین کے حوالے کردیں۔]

گو اس روایت کے مطابق امام مالک نے محض یہی نہیں کہ امیر المومنین سے بخوشی دلی بیعت کی تھی بلکہ وہ ان کے معتمد کارکن بھی تھے اور چاہتے تھے کہ لوگ اس بیعت کی حرمت کو برقرار رکھ کر باغیوں کو اپنے متفق علیہ امام کے سپرد کردیں۔ امام مالک کے گھر میں بیٹھ رہنے سے بھی اسی کی توثیق ہوتی ہے کیونکہ عملاً محمد کا ساتھ نہ دینا آپ کے بارے میں متفق علیہ ہے۔

یہ ہے اہل تاریخ کی تضاد بیانی اور حیرت ان پر ہوتی ہے کہ جو روایت واقعات کے مطابق ہوا سے رد کرکے ایسی روایت کو شہرت دیتے ہیں جس کا کوئی عملی ثبوت نہ دے سکیں۔ امام مالک نے اگر فتویٰ دیا ہوتا اور اس کی پذیرائی میں لوگ محمد الارقط حسنی کا ساتھ دینے کے لیے دوڑ پڑتے تو کیا یہ نتیجہ نکلتا جو نکلا کہ دو تین گھنٹے بھی مقابلہ نہ کیا جائے گا۔ لہذا ناممکن ہے کہ انہوں نے ایسا کوئی فتویٰ دیا ہو یا اہل مدینہ کی اکثریت نے بیعت توڑی ہو۔ امام مالک تو اس وقت امیر المومنین المنصور کے مطابق موطا کی تدوین میں مشغول تھے۔ انہیں اس خالص تخریبی ہنگامے سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ جو نصوص صریحہ وثابتہ کے خلاف تھا اور خود ان کے کھلے

ہوئے مذہب کے بھی خلاف۔

عمدۃ الطالب کے مصنف کی یہ بھی صریح غلط بیانی ہے کہ امیرالمومنین المنصور کا دل امام مالک سے پھر گیا تھا۔ کیونکہ صفحات تاریخ پر دیکھا جا سکتا ہے کہ امیرالمومنین نے موطا شریف کی تدوین کی خدمت ان کے سپرد کی تھی اور جو فرمان انہیں بھیجا گیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:

یاابا عبدالله لم یبق علی وجه الارض اعلم منی و منک و انی قد شغلتنی الخلافه فضع انت للناس کتابا ینتفعون به تجنب فیه عن رخص ابن عباس و شدائد ابن عمر. و وطئه للناس توطأة.قال مالک فوالله لقد علمنی التصنیف یومئذ،ولذا اسمی کتابه المؤطاء.

[اے ابوعبداللہ اس وقت روئے زمین پر مجھ سے اور آپ سے بڑا کوئی عالم نہیں مجھے تو خلافت نے مشغول کر رکھا ہے لہٰذا آپ لوگوں کے لیے ایک کتاب مدّون کیجیے جس سے وہ نفع اٹھاتے رہیں اس میں حضرت ابن عباسؓ کی نرمی اور حضرت ابن عمر کی سختی سے پرہیز کیجیے اور اسے لوگوں کے لیے خوب خوب روندئے (یعنی بغایت تحقیق کیجیے) امام مالک فرماتے ہیں بخدا اس طرح انہوں نے مجھے تصنیف کا طریقہ سکھا دیا اور اسی لیے آپ نے کتاب کا نام موطاء رکھا۔ (خوب روندی ہوئی یعنی بغایت محقق)] (مقدمہ ابن خلدون،ص ۱۸،طبع مصر)

بعض مورخوں نے حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ کے ساتھ فرمان میں حضرت ابن مسعودؓ کا نام بھی لیا ہے کہ ان کے غرائب سے بچیں۔ یعنی ان کے مسائل سے جو دوسرے صحابہ کے یہاں معروف نہ ہوں۔ پھر فرمان میں یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں کہ اوسط امور کا خیال رکھیے اور صحابہ کے اجماعی مسائل مدّون کیجیے۔ اس انداز میں جس شخص کو مخاطب کیا جائے تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کاتب کے دل میں اس کی عظمت اور اہلیت کا احساس نہ تھا اور کیسے کہہ سکتے ہیں کہ امیرالمومنین کا دل ان سے پھر گیا تھا۔ ان کا دل بے وجہ کیوں پھرتا اور اگر پھرتا تو اس کے کچھ آثار تو ہوتے۔

جو امر عیاں ہے وہ یہ کہ موطاء شریف کو قرآن مجید کے بعد عالم اسلام میں دستور

اساسی کی حیثیت حاصل ہوئی اور مشرق و مغرب میں اسے مستند سمجھا گیا۔یعنی اس کی جو مقبولیت خلافت عباسیہ میں تھی وہی اندلس کی اموی امارت وخلافت میں اسے حاصل رہی۔امیر المومنین المنصور کی زندگی میں یہ کتاب مکمل نہ ہوسکی لیکن خلفاء اسلام میں سے پانچ نے اس کی سماعت خود امام مالک سے کی ہے یعنی خلیفہ المہدی، الہادی، الرشید، الامین اور المامون نے۔

امام مالک اور ان کی اس کتاب کی عظمت امیر المومنین ہارون الرشید کے ہاں اتنی تھی کہ خلیفہ ہونے کے بعد محض اس کی سماعت کے لیے اپنے دونوں فرزندوں کے ساتھ مدینے کا سفر کیا تھا۔پھر جب سلطان غازی صلاح الدین ایوبی کو معلوم ہوا۔امیر المومنین ہارون الرشید نے موطاء شریف کے جس خاص نسخے کی سماعت کی تھی وہ مصر کے خزانے میں محفوظ ہے تو ان کی پیروی کی برکت حاصل کرنے کے لیے آپ نے اس نسخہ سے سماعت کے لیے مصر کا سفر کیا ان دونوں شخصیتوں کے علاوہ غالباً کسی تیسرے کا نام نہیں لیا جاسکتا جس نے حکومت پر فائز ہونے کے بعد طلب علم کے لیے سفر کیا ہو۔(تاریخ الخلفاء، ص۲۹۴، طبع مصر)

امام مالک کا عمل اگر وہ ہوتا جو شیعی مصنفوں نے بیان کیا ہے اور دوسروں نے اسے شہرت دی تو نہ عالم اسلام میں ان کی یہ حیثیت تسلیم کی جاتی کہ لوگ ہجوم کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوں اور نہ خلفا کرام کے یہاں ان کا یہ احترام ہوتا، کیونکہ ان کا شمار پھر باغیوں میں ہو جاتا جن کے نہ قاضیوں کے فیصلے قانونی حیثیت رکھتے ہیں اور نہ گواہوں کی گواہی۔

اب دلچسپ بات یہ ہے کہ شیعی مصنفوں نے جعفر الصادق کے موقف کی اشاعت پر توجہ نہ کی جو اس وقت خاص مدینے میں موجود تھے لیکن امام مالک پر اس خیالی فتویٰ کا بہتان رکھ کر اسے خوب اچھالا اور اس طرح عملاً ثابت کر دیا کہ اہل مدینہ کے یہاں فتویٰ امام مالک کا چلتا تھا۔ہمارے نزدیک امام مالک نے فتویٰ ضرور دیا ہوگا مگر وہی جو ان کے کھلے مذہب کے مطابق ہے کہ گھروں میں بیٹھیں اور اس شورش میں شریک نہ ہوں اسی پر آپ نے خود بھی عمل کیا اور اہل مدینہ کی اکثریت نے بھی۔حتی کہ جو تھوڑے لوگ محمد الارقط کے ساتھ میدان میں نکلے تھے وہ بھی تائب ہو کر واپس ہو گئے اور اگر خود محمد الارقط تائب ہو جاتے تو یہ حادثہ کیوں رونما ہوتا۔

یعقوبی افسانہ

اموی اور عباسی خلافتوں کے غیر آئینی اور محمد الا رقط حسنی کی بغاوت کو قانونی حیثیت دینے کے لیے شیعہ مورخ یعقوبی نے یہ افسانہ گھڑا ہے کہ:

''بنو ہاشم کا ایک خفیہ اجلاس ہوا۔جس میں ابوجعفر المنصور بھی تشریف رکھتے تھے۔ وہاں اموی خلافت کے متوازی خلافت قائم کرنے کے لیے محمد حسنی کا انتخاب کیا گیا اور سب نے مع ابوجعفر المنصور ان سے بیعت کر لی۔اس اجلاس میں شرکت کے لیے ابوجعفر الصادق کو بھی بلایا گیا تھا۔مگر انہوں نے یہ صورت حال دیکھ کر فرمایا کہ یہ منصب آپ میں کسی کو نہ ملے گا یہ تو اس زرد قبا والے کا حق ہے یعنی ابوجعفر المنصور کا،اسی وقت سے المنصور کے دل میں حصول خلافت کا جذبہ پیدا ہوا۔'' یہ روایت از سرتا پا ہیچ محض ہے۔

ا۔سب بنو ہاشم ایسے بے اصول اور منافق نہ تھے کہ علانیہ تو خدا اور سول کے نام پر بیعت کریں ان کے جائز اور آئینی امام ہونے کا اقرار کریں اور خفیہ خفیہ حریف خلافت بھی قائم کر ڈالیں اور وہ بھی بغیر وسائل کے،قرآن حکیم نے ایسی خفیہ کاروائیوں پر سخت توبیخ کی ہے کیونکہ یہ امت کے ساتھ غداری ہے۔

۲۔جعفر الصادق اور ان کے والد ماجد خالص غیر سیاسی اور علمی زندگی بسر کرتے تھے اور صمیم قلب سے خلفا کی بیعت پر مستقیم رہے سیاسی ہنگامہ آرائی ان کے مسلک کے خلاف تھی۔ اس لیے ناممکن ہے کہ ایسے تخریبی اجلاس میں شرکت فرماتے۔

۳۔ابوجعفر المنصور کے گھرانے کی اپنی تحریک سالہا سال پہلے سے خالص تعمیراتی انداز میں چل رہی تھی۔جس میں قواعد شرعیہ کا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا۔اسی لیے اس کا امکان نہ تھا کہ وہ اپنے بزرگ،والد ماجد اور جد امجد کی عالم گیر عوامی تحریک کو نقصان پہنچانے اور اسے تخریبی رنگ دینے کے لیے ایسے باغیانہ اجلاس میں شریک ہوتے۔

۴۔اس روایت کے ہیچ محض ہونے کی عملی دلیل یہ ہے کہ امیر المومنین المنصور کی ولادت ۹۵ھ کی ہے (یعنی آپ عہد صحابہ میں پیدا ہوئے تھے) دعوت عباسیہ ۱۰۰ھ میں شروع کی گئی اس وقت آپ کی عمر صرف پانچ برس تھی ایسا بچہ کسی زبردست سیاسی اجلاس میں کیسے پہنچ جاتا۔

غرض یہ ہے کہ یعقوبی نے اس فرضی اور خیالی اجلاس کے انعقاد کا افسانہ نہایت بے عقلی سے گھڑا ہے جسے دیگر مورخین خصوصاً شیعہ مؤلفین نقل کرتے رہے ہیں۔نہ دعوت کی ابتدا سے پہلے ایسے کسی اجلاس کا امکان تھا کیونکہ حضرت امام محمد عباسی کی اپنی تحریک بالکل خفیہ تھی اور آل علی کے نام نہاد شیعہ کی فتنہ سامانیوں کے سبب انہیں اس میں شریک کرنے کی غلطی وہ نہیں کر سکتے تھے۔دعوت کے اجرا کے بعد تو ایسے کسی اجلاس میں شرکت کا سوال ہی نہ تھا جیسا کہ مذکور ہوا۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ ایسا کوئی اجلاس منعقد ہی نہیں ہوا۔بنو ہاشم خلافت قائمہ کے وفادار تھے اور جنہوں نے بغاوت کی انہیں خود اپنے گھر والوں کی بھی حمایت حاصل نہ ہوئی چہ جائیکہ یہ کہ امت ان کی طرف جھکتی۔چند سبائیوں کے علاوہ انہیں اپنے حمایتی نہ مل سکے اور سبائی وہ تھے جو یوں تو بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے اور عقیدت کا اظہار کرتے تھے مگر عین وقت پر بے یارو مددگار چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔

یعقوبی نے روایت اس انداز میں لکھی ہے کہ جیسے عبداللہ المنصور عباسی اور محمد الارقط حسنی پختگی عمر کو پہنچ چکے ہوں کہ بنو ہاشم کا ایسا اجلاس منعقد ہو تو اس میں ان کی شخصیتیں نمایاں ہوں۔حالانکہ ان دونوں کی عمر تو اس وقت اتنی ہوئی جب خلافت عباسیہ قائم ہو چکی تھی۔تو پھر اس کا امکان کہاں تھا کہ محمد الارقط بن عبداللہ حسنی کی صدارت میں اجلاس ہو اور ابو جعفر المنصور عباسی اس میں ایک عام فرد خاندان کی حیثیت سے جا بیٹھیں یعنی اپنے ہی خلاف ریشہ دوانیاں کرنے وہاں پہنچ جائیں۔

امام ابو حنیفہ اور ابراہیم حسنی

اوپر بیان ہوا کہ راویوں کے بقول محمد الارقط حسنی اور ان کے بھائی ابراہیم نے مدینے

اور بصرے میں بیک وقت خروج کا منصوبہ بنایا تھا۔راوی کہتے ہیں کہ ابراہیم حسنی چونکہ اچانک بیمار پڑ گئے اس لیے وقت موجود پر کھڑے نہ ہو سکے اور یوں ایک ساتھ دو محاذ کھول دینے کا موقع جاتا رہا۔بہر حال ابراہیم نے بعد میں خروج کیا۔اب سوال ہے کہ منصوبہ تو اتنا بڑا بنایا گیا تھا کہ حکومت قائمہ کا تختہ فوجی طاقت سے الٹ دیا جائے۔مگر محض ایک شخص کے بیمار پڑ جانے سے خروج ملتوی کر دیا گیا۔اگر واقعی تیاری مکمل تھی۔سامان حرب فراہم تھا۔خفیہ فوج تیار کر لی گئی تھی۔تمام تفصیلات طے تھیں اور یہ بھی معلوم تھا کہ مدینے اور بصرے کے درمیان کتنا فاصلہ ہے یعنی دونوں شہروں میں رابطہ کرنے اور فوری پیغام رسانی کے وسائل موجود تھے تو پھر وقت موعود پر خروج کیوں نہیں کیا گیا۔کیا ابراہیم حسنی کے علاوہ کوئی آدمی ایسا نہ تھا جو اس ''فوج'' کی قیادت کر سکے؟ یہ عجیب بات ہے کہ منصوبہ تو بنایا جائے انقلاب لانے کا لیکن جو ''فوج'' تیار کی جائے اس میں کوئی قابل اعتماد آدمی نہ ہو یا پھر یہ منصوبہ خود اپنے آدمیوں سے بھی پوشیدہ رکھا گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بعد کی وضع کردہ باتیں ہیں نہ یہ دونوں خروج کسی منصوبے کے تحت تھے اور نہ ان کے لیے کوئی موثر تیاری کی گئی تھی معمولی غور وفکر سے وہ سب داستانیں ہیچ ثابت ہوتی ہیں جو ان دونوں خروجوں کو اہمیت دینے کے لیے بیان کی گئی ہیں۔سوائے عقیم شخصی طالع آزمائی کے ان دونوں خروجوں کو کچھ اور نام نہیں دیا جا سکتا۔کہا جاتا ہے کہ محمد الارقط وغیرہ کی یہ ایک عظیم الشان تحریک تھی اور دعوت عباسیہ ہی کی طرح عالم گیر۔یعنی ان کے داعی بھی دنیا بھر میں عباسی داعیوں کے متوازی کام کر رہے تھے۔لیکن اس خیالی منظر کشی کی نمود کسی جگہ اور کسی موقع پر نظر نہیں آتی۔محمد الارقط یا ان کے بھائی ابراہیم یا اور کوئی علوی۔ان میں سے ہر ایک کا خروج بغیر کسی تنظیم کے ہوا اور بغیر کسی محکم اور تعمیری نصب العین کے ہوا۔اسی وجہ سے ان میں سے کسی کو اتنے مددگار نہ مل سکے جو واقعی کسی درجے میں انقلاب لا سکیں اور مرکز پر ان کا قبضہ ہو سکے۔

خلافت عباسیہ کے انحطاط کے وقت دور دراز علاقوں میں بعض علویہ کا قبضہ بے شک ہو گیا تھا لیکن اکثر وبیشتر وہ بھی عارضی ثابت ہوا۔

ابراہیم نے خروج بصرے میں کیا تھا اور کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ اتنی زبردست

جماعت تھی کہ امیر المومنین المنصور پریشان ہو گئے راویوں نے یہ خیالی گھوڑے تو دوڑائے مگر نتیجہ یہ نکلا کہ معمولی جھڑپ میں ابراہیم شکست کھا گئے اور سب قصّہ تمام ہوا۔

پھر کوئی سلیم العقل شخص کیا یہ باور کر سکتا ہے کہ ایک خاص منصوبے کے تحت خلافت عباسیہ کا تختہ الٹنے کے لیے یہ دونوں بھائی تیاریاں کر رہے تھے، سامان حرب جمع کیا جا رہا تھا اور فوجیوں کی تنظیم ہو رہی تھی لیکن نہ مدینے میں کوئی بے چینی تھی اور نہ بصرے میں دونوں شہروں کے والی خواب خرگوش میں محو تھے اور انہیں خبر نہ تھی کہ ان کے شہروں میں کن عزائم کے تحت کیا کام ہو رہا تھا۔ امیر المومنین کے فرمان کے مطابق کوفے اور بصرے سے اور دنیا جہان سے دار الخلافہ کی تعمیر کے لیے کارکن جمع کیے جا رہے تھے اور سب کام اطمینان سے ہو رہا تھا۔ مگر نہ امیر بصرہ کو خبر تھی کہ ان کے شہر میں ہزاروں افراد نے ابراہیم کی فوج میں نام لکھا دیا اور بیعت توڑ کر خروج کی تیاریاں کر رہے ہیں اور نہ امیر المومنین ہی کے جاسوس کوئی اطلاع آپ تک پہنچاتے تھے۔ اگر بصرے میں کوئی بے چینی ہوتی تو جیسے ایک فوجی دستہ مدینے بھیجا گیا تھا۔ ایسا ہی کچھ انتظام بصرے کے لیے بھی ہوتا کہ فتنہ سر اٹھاتے ہی ختم کر دیا جائے۔ یعنی ایک زبردست انقلابی تحریک کی موجودگی میں امیر المومنین کی توجہ اس تحریک کو کچلنے پر مرکوز ہوتی نہ کہ دار الخلافہ کی تعمیر پر۔ یہ کام نہایت امن وامان کے زمانے میں ہوتا ہے۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ ان دونوں علویوں کا خروج نہایت حقیر اور وقتی ہنگامہ تھا جو فرو ہو گیا اور ایسا ہنگامہ ایک عظیم الشان حکومت کے رقبے میں کہیں نہ کہیں ہوتا ہی رہتا ہے۔

اب دیکھنا ہے کہ امام اعظم حاضر ہیں بارگاہ خلافت میں اور اہم خدمات کی انجام دہی میں مشغول لیکن فتویٰ جاری کر رہے ہیں ابراہیم کے خروج کی حمایت میں یعنی نہ کتاب وسنت کی پروا ہے اور نہ خود اپنے اور اپنے مشائخ کے کھلے مذہب کی۔ اب سوال ہے امام صاحب کے اس خیالی فتوے کو اتنی شہرت کیوں دی جا رہی ہے۔ بقول ان مؤلفین کے جب ''ابنائے رسول اللہ'' ایک دینی اور ملی تقاضا پورا کرنے کھڑے ہوں تو انہیں ایک عجمی عالم کے فتوے کی کیا ضرورت تھی؟ دین تو بقول ان کے ان ہی کے گھر سے نکلا تھا نہ کہ بلاد عجم سے۔

وجہ یہ ہے کہ حضرت امام اعظم کے شاگردوں نے تمام عالم اسلام میں حنفی مذہب رائج کیا اور امت کی بھاری اکثریت نے اس دین کی پیروی کی اس لیے بعد کے مسلمانوں علویوں کے خروج کی اہمیت اور حقانیت ثابت کرنے کے لیے اس فرضی اور اختراعی فتویٰ کا سہارا لینا پڑا، ورنہ مسلمان جو امام اعظم کے متبع ہیں وہ مذہب حنفی کے مطابق ایسے خروجوں کو صریح بغاوت اور ملت اسلامیہ سے غداری تصوّر کرتے ہیں۔اس لیے انہیں دھوکہ دینے کے لیے یہ بات وضع کی گئی کہ امام صاحب نے ابراہیم کے حق میں فتویٰ دیا تھا اس سے بحث نہیں کہ حضرت امام اس وقت کہاں تھے کن فرائض کی بجا آوری میں مشغول تھے اور ابراہیم سے ان کا رابطہ ہو بھی سکتا تھا یا نہیں۔

پھر یہ سوچا گیا کہ فتویٰ کی بات اس وقت تک وزنی نہیں ہوسکتی تھی جب تک امام کے قید ہونے اور ان پر کوڑے پڑنے کی داستانیں بیان نہ کی جائیں اس لیے ان روایتوں کا تانا بانا بنایا گیا۔لیکن اتنا پھر بھی خیال نہیں کیا گیا کہ امام صاحب کی موجودہ عظمت وشان تو دنیائے اسلام میں ان کے شاگردوں کے سبب قائم ہوئی۔جنہوں نے اپنے امام کے آثر علمیہ اور فقہی آرا کو کتابی شکل دے کر اہل عالم کو اس عظیم شخصیت کے افکار سے روشناس کیا۔ورنہ ۱۴۵ھ۔ ۱۵۰ھ میں ان کی حیثیت ایسی نمایاں کہاں تھی کہ امیر المومنین پر امت میں ان کی مقبولیت کا رعب پڑے۔وہ بھی ہزار علما کی طرح ایک بڑے عالم تھے۔مجتہد مطلق اور مقتدائے عالم تو انہیں بعد میں تسلیم کیا گیا، امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں۔(البدایۃ والنہایہ، ج۱، ص۱۱۶) العلما اربعۃ الثوری وابوحنیفہ ومالک والاوزاعی (عالم چار ہیں سفیان ثوری، ابوحنیفہ، مالک اور اوزاعی) ان میں سے دو کے شاگرد اتنے بڑے تھے کہ اہل عالم میں وہی مشہور ہوئے اور ان کے افکار دنیا میں پھیلے یعنی امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالک۔امام اوزاعی کے افکار بھی امام اعظم کے شاگردوں ہی کے طفیل سے مشہور ہیں۔مگر کتابوں کی حد تک عامۃ المسلمین تو ان کے نام بھی نہیں جانتے حالانکہ اپنے علم وفضل میں وہ ان دونوں بزرگواروں سے کچھ کم نہ تھے۔غرض یہ ہے کہ دنیائے اسلام میں جو عظمت امام اعظم کی تسلیم کی جاتی ہے وہ اس

وقت انہیں حاصل نہ تھی۔

امیر المومنین المنصور نے جس طرح محمد الارقط حسنی اور ان کے بھائی ابراہیم کی بغاوتوں کا قصّہ پاک کیا اور ان کے دوسرے چند عزیزوں کو جرم بغاوت کی اعانت میں قید و بند کی سزا دی اسی طرح وہ امام اعظم کو بھی شہادت کے درجے پر فائز کر سکتے تھے کیونکہ یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ نہ محمد و ابراہیم کی بغاوت فرو کرنے کے نتیجے میں امت کے اندر کوئی ہیجان پیدا ہوا اور نہ دوسرے ''ابناء رسول اللہ'' کے قید ہونے پر۔ کیونکہ ہم عصر امت صورت حال جانتی تھی۔ اسی طرح امام صاحب کے قید کیے جانے، کوڑے لگائے جانے اور زہر سے قید خانے میں ختم کیے جانے کی داستانوں کے باوجود کوئی شخص ثابت نہیں کر سکتا کہ اہل بغداد نے یا دنیائے اسلام کے کسی دوسرے گوشے میں مسلمانوں نے امام اعظم کی بابت کسی واقعی یا موہوم سانحے کا کوئی اثر نہیں لیا ہو، امام صاحب کو علانیہ قتل کر دیا جاتا تب بھی ''آل رسول'' کے مقابلے میں ان کی کیا اہمیت ہوتی۔

امام ابوحنیفہ صاحب کے متعلق یہ سب لغو باتیں بعد کے لوگوں کی تراشی ہوئی ہیں اور ان کی وفات کے تین سو برس بعد اس وقت وضع کی گئیں جب سبائی پروپیگنڈا اپنے عروج پر تھا اور حضرت امام کو امت نے مجتہد مطلق اور مقتدائے عالم تسلیم کر لیا تھا تاکہ وہ مسلمان جو علویوں کے خروج اور ان کے انجام پر برافروختہ نہیں ہوئے انہیں امام اعظم اور امام مالک پر خلافت قائمہ کے مظالم کی فرضی داستان ہی سے متاثر کیا جائے۔ افسوس ہے کہ خطیب بغدادی نے بے سوچے سمجھے یا امام صاحب سے تعصب کے تحت یہ وضعی روایتیں اپنی کتاب تاریخ بغداد میں لکھ ماریں۔ بعد کے لوگ ان خرافات کو ایسے لے اڑے کہ آج اسے حقیقت ثابتہ باور کرایا جاتا ہے۔ تاریخ بغداد یا مناقب نعمان کی کتابوں میں ان روایتوں سے سب نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں جن سے صحیح احوال کا پتہ چلایا جا سکتا ہے ان واقعات ثابتہ کے مطابق ہیں۔ مگر جن کے دلوں میں بیماری ہے انہیں صاف اور دل کو لگتی روایات کے مقابلے میں وہ واہی روایتیں مرغوب ہیں جن کے ذریعے خلفائے اسلام پر طعن کی گنجائش نکلے۔ کیونکہ ان کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ اموی اور عباسی

خلافتوں کی شرعی حجت پر حرف لا کر یہ ثابت کریں کہ آنحضرت ﷺ کے اصحاب اوران کا اتباع نے ان خلافتوں پر اجماع کر کے دین مبین کو غارت کر دیا تھا اور بزعم خویش "ایک عظیم مفکر اسلام" کے قول کے مطابق اپنی قیادت جاہلیت کے ہاتھ میں دے دی تھی۔

تاریخی حقیقت یہ ہے امام اعظم کو نہ کبھی قید کیا گیا نہ ان پر کوڑے برسائے گئے نہ انہیں زہر دیا گیا اور نہ انہوں نے زید و محمد وابراہیم کی حمایت میں فتویٰ دیا اور نہ حسن بن قحطبہ سے ان کی کبھی ایسی ملاقات ہوئی کہ وہ انہیں خلافت قائمہ سے برگشتہ کرنے کی کوشش کریں۔وہ پوری طرح امیر المومنین کی بیعت پر قائم تھے اور قواعد شرعیہ کے مطابق ان کے مطیع ومنقاد رہے۔منصب خلافت کی عظمت ان کے دل میں تھی اور امیر المومنین کی خدمات جلیلہ انجام دینا وہ اپنا دینی وملّی فریضہ جانتے تھے اسی لیے ان کے نقشِ قدم پر ان کے عظیم المرتبت شاگرد چلے اور دنیا کو نور وحکمت سے بھر دیا۔

اگر امام اعظم عیاذاً باللہ خلافت قائمہ کے خلاف ہوتے اور باغیوں کے ہم نوا تو لازم تھا کہ امیر المومنین کی نگاہوں سے گر جائیں اور ان کے شاگردوں کو بھی وہ مقام حاصل نہ ہوتا جو ہوا بلکہ یہ عظیم المرتبت ائمہ بھی اپنے شیخ وامام کے مسلک کے خلاف حکومت قائمہ کے مناصب قبول نہ کرتے اور یہ ایک ایسا ثقافتی سانحہ نہ ہوتا کہ اس سے امت کا پورا مستقبل تباہ ہو جاتا اور وہ درخشانی ہرگز نہ آتی جس کی آب وتاب سے اہل عالم کی نگاہیں خیرہ ہیں۔محمد الارقط وابراہیم کے خروجوں میں امام اعظم وامام مالک کے موقف کی صفائی کے بعد ہم اب اس افترا پر متوجہ کرنا چاہتے ہیں جو امام ابوحنیفہ اور مکتبۂ حنفیہ پر کیا گیا ہے۔تدوین فقہ حنفیہ کے متعلق جو غلط بیانیاں رسوائے عالم کتاب خلافت وملوکیت میں کی گئی ہیں اس کی تنقیح وتردید تو پہلے بھی کتاب حقیقت خلافت وملوکیت میں کی جا چکی ہے۔

حوالہ جات

۱؎ فقہاء صحابہ میں عبادلہ اربعہ ہیں یعنی خلفہ اربعہ کے بعد اپنے زمانے میں شیخ الصحابہ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاس، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم اور مدینے کے فقہاء اربعہ زمانہ تابعین چار بزرگوار ہیں۔ حضرت سعید بن مسیّب، حضرت عروہ بن الزبیر، حضرت عبدالملک بن مروان اور قبصیہ بن الذویب۔ ان کے بعد جن حضرات کو فقہاء سبعہ کہا جاتا ہے تو مراد ہوتے ہیں حضرت سعید بن مسیّب، حضرت عروہ بن زبیر، حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر، حضرت خارجہ بن زید بن ثابت، حضرت عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود، حضرت سلمان بن یسار اور ساتویں کے بارے میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر ہیں اور بعض کے نزدیک حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحارث بن ہشام ہیں۔ یہاں حضرت عبدالملک بن مروان کا نام نہیں لیا جاتا کیونکہ ان کا شمار پھر خلفاء اسلام اور امراء المومنین میں ہوگیا اور حضرت قبیصہ کا نام اس لیے نہیں کہ وہ شام تشریف لے گئے تھے اور اموی خلافت کے عدلیہ کا انتظام سنبھال لیا تھا جن حضرات کے نزدیک ساتویں فقیہہ مدینہ حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰن ہیں ان میں سے ایک صاحب نے ساتوں کے نام اس طرح نظم کر دیے ہیں:

الا مــن لا یــقتــدی بــائــمة فقسمة ضنیریٰ من الحق خارجه

[یاد رکھو جو شخص ان اماموں کی اقتدا نہیں کرتا۔ اس کی قسمت کھوٹی ہے اور وہ حق سے باہر ہوگیا۔]

فـخــذ هــم عبیـداللــه عـروـة قاسـم سـعـیـد ابـوبـکـر سلیمان خارجه

[تو انہیں گن لو وہ عبیداللہ (بن عبداللہ بن عتبہ) ہیں، عروہ (بن الزبیر) ہیں، قاسم (بن محمد بن ابی بکر) ہیں، سعید بن المسیب ہیں۔ ابوبکر (بن عبدالرحمٰن) ہیں سلیمان (بن یسار) ہیں اور خارجہ بن زید ہیں۔]

انہی حضرات سے تمام فقہاء ائمہ حدیث استناد کرتے ہیں صحاح ستہ کے سب مصنفوں نے ان کی روایات لی ہیں ان میں عروہ بن الزبیر حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کے سگے بھانجے اور

تربیت دادہ تھے،حضرت قاسم بن محمد اورحضرت سالم بن عبداللہ دونوں حضرات ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کے بھتیجے اورتربیت دادہ تھے۔حضرت سلیمان بن یسارام المومنین سیدہ میمونہ کے مولیٰ اورتربیت دادہ تھے،حضرت خارجہ اپنے والدسیدنا زید بن ثابتؓ کے تربیت دادہ تھے ان حضرات نے بکثرت صحابہ کی صحبت اٹھائی تھی ان میں سے چھ سے امام ابن شہاب زہری نے فیض اٹھایا اوران سے امام مالکؒ نے ،حضرت سلیمان بن یسار سے حضرت یحییٰ بن سعید اور ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن نے اوران سے امام مالکؒ نے۔

۲؎ حجاز کے متعلق حضرت محمد الامام عباسی کا حکم تھا کہ عباسی داعی وہاں کچھ کام نہ کریں اس لیے حرمین شریفین میں اختلال کی کوئی صورت پیدا نہ ہونے پائی اورکامل امن رہا حرمین پر قبضہ سب سے آخر میں کیا گیا اور یہ قبضہ بغیر کسی خونریزی کے ہوگیا کیونکہ عباسی امامت پرامت متحد ہوچکی تھی۔

امیر المومنین المنصور امام ابوحنیفہ اور مکتبۂ حنفیہ

امیر المومنین ابوجعفر عبداللہ الامام المنصور بن محمد الامام بن علی السجاد بن عبداللہ حبر الامتہ بن عباسؓ عم رسول اللہ ﷺ کا عہد مبارک ثقافت اسلامیہ کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔آپ اس امت کے عظیم ترین ائمہ میں ہیں،حدیث وفقہ ولغت وادب میں ایسے بلند پایہ تھے کہ اگر حلقۂ درس قائم کرتے تو ان کے جد بزرگوار سیدنا عبداللہ بن عباسؓ کی یاد تازہ ہوجاتی دور دور سے لوگ طلب علم کے لیے حاضر ہوتے امام ابن کثیر فرماتے ہیں:

وكان المنصور في شبيته يطلب العلم من مظانه والحديث والفقه فنال جانبا جيداً وطرفاً صالحاً

[اپنی جوانی میں المنصور نے ہر صاحب کمال سے علم حاصل کیا۔نیز حدیث وفقہ اس طرح آپ کو رتبۂ بلند اور درک قوی نصیب ہوا۔] (البدایہ والنہایہ ، ج١، ص١٢٦)

محدثوں کا جو طریقہ تھا کہ طلب حدیث کے لیے دور دور کا سفر کرتے تھے ایک شہر کے علما سے فیض اٹھا کر دوسرے شہر کا رُخ کرتے تھے ایسے سفر کو رحلۃ کہتے ہیں۔امام المنصور کی رحلۃ کا یہی عالم تھا۔مشرق کا شاید ہی کوئی اہم شہر ایسا چھوڑا ہو جہاں طلب علم کے لیے نہ پہنچے ہوں۔ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے: **وقد كان ابو جعفر بمكان من العلم قبل الخلافة وبعدها** (ص١٨،طبع مصر)" (امیر المومنین) ابوجعفر علمی اور دینی اعتبار سے

خلافت سے پہلے بھی بلند رتبہ تھے اور بعد میں بھی۔" یعنی امور خلافت میں انہماک سے آپ کے علم کی تازگی اور زہد وتقویٰ کی کیفیت ماند نہیں پڑی تھی۔ ہمعصر علما نے آپ کی علمی شان اور دینی عظمت کا اعتراف کیا ہے جیسا کہ آگے معلوم ہوگا اور یہ آپ ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا کہ علوم وفنون کی تدوین ونشر واشاعت کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس نے امت مسلمہ کو اہل عالم کے لیے نمونہ بنایا اور دلوں میں اس کی پیروی کی لگن پیدا کردی۔

حرکت علمی

اموی عہد مبارک میں متمدن دنیا کا بہت بڑا رقبہ خلافت اسلامیہ کے تحت آچکا تھا۔ تین براعظموں میں امت پھیل چکی تھی اور ایسے مختلف النوع عناصر ملت میں داخل ہو گئے تھے کہ دین مبین کو خالص شکل میں محفوظ ومدّون کرنے کا مسئلہ پیدا ہوگیا چنانچہ خلافت عباسیہ کے قیام کے ساتھ ہی امیر المومنین المنصور نے یہ محسوس کرلیا کہ اب فتوحات کے بجائے وقت اس کا آگیا کہ ثقافت اسلامیہ کے تحفظ وارتقا کی سبیل نکالی جائے تاکہ دین کے تمام کلّیات و جزئیات کتابی صورت میں مدّون ہوجائیں اور خلافت کا ایسا آئین ودستور مرتب کرلیا جائے کہ جو آیندہ کے لیے مشعل راہ ہو۔ مسلمان اس قابل ہوجائیں کہ انہی اصول وقواعد کے مطابق احوال حاضرہ کے ساتھ چل سکیں یعنی انسانی ارتقا کے نتیجے میں جو مسائل سامنے آتے جائیں ان کا حل دریافت کرنے کی قدرت وصلاحیت رکھیں، غیر عرب عناصر کے قوت پکڑ لینے سے اس اقدام کی ضرورت اور بھی واضح ہوگئی تاکہ ثقافتوں کے تصادم کا نتیجہ تخریبی نہ ہونے پائے اور کسر وانکار کا انجام تعمیری رہے۔

یوں حکومت کے استحکام کے بعد، دارالخلافہ کی تعمیر سے بھی پہلے آپ نے بڑے بڑے علمائے مصر کو اس طرف متوجہ کیا اور ۱۴۳ھ میں فرامین نافذ کیے چنانچہ امام ذہبی فرماتے ہیں:

فی سنہ ثلاث واربعین شرع علما الاسلام فی ھذاالعصر تدوین الحدیث و الفقہ والتفسیر فصنف ابن جریج بمکۃ. ومالک المؤطا

بالمدینة والاوزاعی بالشام وابن ابی عروبة و حماد بن سلمةوغیرهما بالبصرة،ومعمر وسفیان الثوری بالکوفة،وصنف ابن اسحق المغازی وصنف ابوحنیفه رحمه الله الفقه والرائی.

ثم بعد یسیر صنف هشیم واللیث وابن لهیعته ثم ابن المبارک وابویوسف وابن وهب وکثر تدوین العلم و تبوییبه وذونت کتب العربیة واللغة و التاریخ وایام الناس و قبل هذا العصر کان الائمة یتکلمون من حفظهم اویرون العلم من صحف صحیحة غیر مرتبة

[۱۴۳ھ میں اس زمانے کے علمائے اسلام نے حدیث وفقہ اورتفسیر کی تدوین شروع کی،چنانچہ ابن جریج نے مکے میں تصنیف کی اور(امام) مالک نے مدینے میں موطالکھی ۔(امام)اوزعی نے شام میں،ابن ابی عروبہ اورحماد بن سلمہ وغیرہما نے بصرے میں،معمر نے یمن میں،سفیان ثوری نے کوفے میں،کتابیں لکھیں اور (امام)ابوحنیفہ نے فقہ اوررائے مدّون کی۔پھر کچھ دن بعد ھُشَیم، اللیث نے ابن لہیعہ اورپھر ابن المبارک، ابویوسف اورابن وہب نے کتابیں لکھیں۔یوں علم کی تدوین وترتیب کی کثرت ہوگئی عربی،لغت،تاریخ اورایام الناس پر کتابیں لکھی گئیں۔ اس سے پہلے ائمہ یاتو اپنے حفظ سے تعلیم دیا کرتے تھے یاایسے صحیح نوشتوں سے جوغیرمرتب تھے۔] (تاریخ الخلفا،طبع مصر)

اموی عہد میں اس کی ضرورت نہ تھی کہ تحریری کام ہو کیونکہ وہ زمانہ اصحاب رسول اللہ ﷺ کا تھا جوتمام عالم اسلام میں پھیلے ہوئے تھے اور ہرجگہ ان کا فیض جاری تھااوران کے صحبت یافتہ حضرات ان کے علوم کی اشاعت کررہے تھے۔جگہ جگہ علما وفقہا کے حلقہ ہائے درس قائم تھے اوراہل عرب کے طرز پرتمام تدریس زبانی ہوتی تھی۔یعنی علم سینہ بہ سینہ چلتا تھا مسلمانوں کی زیادہ توجہ جہاد فی سبیل اللہ پر تھی۔وہ جدھر رخ کرتے تھے ان کی فطری تعلیمات کی سادگی اوران کے کردار کی رفعت دلوں کوموہ لیتی تھی۔فقہی موشگافیوں کے بجائے مدار سادگی عمل پر تھا۔اموی خلیفہ

عمر الثانی نے اگرچہ علمائے وقت کو تصنیف وتالیف پر متوجہ کیا تھا اور بعض رسائل اور نوشتے مرتب بھی ہوئے تھے لیکن یہ کام ابتدائی تھا اور نوشتوں کی نوعیت ایسی نہ تھی کہ انہیں مدّ ون اور مبسوط تصنیفات کا درجہ دیا جائے جیسا کہ امام ذہبی نے وضاحت فرما دی ہے۔ ویسے تحریری کام آنحضرت ﷺ کے دور ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ آپ نے متعدد فرامین کے ذریعے مسائل پر رسالے مختلف مقامات پر بھجوائے تھے اور سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کا یہ بیان محفوظ ہے۔

وامن اصحاب النبی ﷺ احد اکثر حدیثاً عنه منی الاما کان من عبدالله بن عمرو فانه کان یکتب ولااکتب.

[نبی ﷺ کے اصحاب میں سے کوئی صاحب آپ کی احادیث بیان کرنے میں مجھ سے زیادہ نہیں سوائے عبداللہ ابن عمروؓ (بن العاص) کے کیونکہ وہ لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا۔] (ج، ص ۳۲، طبع مصر)

لیکن آخر عہد اموی تک علما وفقہا کا عام طریقۂ کار یہی تھا کہ حفظ سے درس دیا کرتے تھے۔ شاگرد جو سنتے اسے دماغوں میں محفوظ رکھتے تھے اگر کسی نے کچھ لکھا بھی تو حفظ کرنے کے لیے۔ چنانچہ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں امام مالک کا یہ قول نقل کیا ہے: **لم یکن القوم یکتبون انما کانو یحفظون فمن کتب منهم شیاً فانما یکتبه لحفظهُ فاذاحفظهُ محاه** [(لوگ لکھا) نہیں کرتے تھے بلکہ صرف یاد کیا کرتے تھے اور اگر ان میں سے کسی نے کچھ لکھا تو یہ تحریر محض حفظ کرنے کے لیے ہوتی تھی۔ جب وہ حفظ کر لیتا تو مٹا دیتا۔]

یہ عرب کا خاصہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں حفظ کی خاص صفت سے نوازا تھا۔ ایک دفعہ کی بات سنی ہوئی ان کے دماغوں میں محفوظ رہتی تھی۔ اسی لیے وہ اپنی قوت حافظہ قائم رکھنے کے لیے کتابت سے گریز کرتے تھے اور یہ نفسیاتی مسئلہ ہے کہ جو شخص ظاہر پر تکیہ کرتا ہے اس کی باطنی قوت گھٹ جاتی ہے۔ ابن عبدالبر نے ان علما کے اقوال نقل کر کے جو کتابت پسند نہیں کرتے تھے لکھا ہے:

من ذکرناقوله فی هذا لالباب فانما ذهب فی ذلک مذهب العرب

لانهم كانوا مطبوعين على الحفظ مخصوصين بذلك والذين كرهوا الكتاب كابن عباس، والشعبي وابن شهاب والنخعي وقتادة ومن ذهب مذهبم وجبل جبلتهم كانوا قدطبعوا على الحفظ.

[اس موضوع پر جس جس کا قول ہم نے دہرایا ہے تو ان کا طریقہ وہی تھا جو عربوں کا ہوتا ہے وہ فطری طور پر یاد رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور یہ ان کی خصوصیت ہے جو حضرات لکھائی پسند نہیں کرتے جیسے حضرت ابن عباسؓ، امام شعبیؒ اور امام ابراہیم نخعی اور حضرت قتادہؒ اور وہ سب لوگ جن کا یہی طریقہ تھا اور ایسی ہی ذہنیت تھی انہیں طبعی طور پر حفظ کرنے کا ملکہ تھا۔]

چنانچہ امام شعبی فرماتے ہیں **ماكتبت سوادًا في بياض ولا استعدت حديثا من انسان** (میں نے کوئی بات کاغذ پر نہیں لکھی اور نہ کسی شخص سے اپنی بات دوبارہ کہنے کو کہا) حضرت ابن عباسؓ نے عمرو بن ربیعہ کا قصیدہ ایک دفعہ سن کر اسی طرح سنا دیا تھا۔[1] یہ تھا عرب کا حال اور وہ ماحول جب تک قائم رہا غیر عرب بھی اسی طرز پر چلے لیکن خلافت عباسیہ کے قیام کے بعد صورت حال بدل گئی اور معاشرے کا تقاضا یہی ہوا کہ اب حفظ پر مدار نہیں ہوسکتا اور نہ ایک منظّم اور آئینی حکومت اس طرح چل سکتی ہے کہ اس کا قانون کتابی صورت میں مدّون نہ ہو۔

اس بارے میں امیر المومنین المنصور کی لگن اور عزیمت کا یہ عالم تھا کہ فرامین بھیجنے کے علاوہ اکابر میں سے بعض کو بالمشافہ گفتگو کرنے کے لیے طلب فرمایا جیسے امام اعظم اور امام اوزاعی کو۔ چونکہ امام مالک کسی طرح مدینے سے باہر جانے پر تیار نہ تھے۔ اس لیے ان کے پاس خود جا کر گفتگو کی۔ اس وقت عالم اسلام میں تین فقہی مکتب تھے: حجازی، عراقی اور شامی اور ہر مکتبے میں استخراج مسائل کے لیے منجملہ منقولات کے مقامی ''عرف'' کا بھی لحاظ رکھا جاتا تھا۔

عرف

فقہی امور میں کتاب وسنت کے صریح احکام کے علاوہ عرف بھی ایک دلیل شرعی

ہے۔یعنی امور معاشرت اور معاملات میں مقامی رسم ورواج کے مطابق طریقۂ کار۔ ہر دستور جو احکام شرعیہ کے خلاف نہ ہو اور اس میں لوگوں کے لیے آسانی نظر آئے اور عمومی منفعت معلوم ہو اسے باقی رکھا جاتا ہے۔دعوت محمدیہ کا منشا یہ نہیں ہے کہ اقوام عالم کے ثقافتی اور تہذیبی شعائر و رسوم کو منسوخ ومردود قرار دے وہ تو ایک ارتقائی تحریک ہے اور عظیم ترین جو نوع انسانی پر اتمام نعمت کے لیے اللہ تعالیٰ نے جاری کیا اسی لیے مسلمانوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ قوموں کا ثقافتی سرمایہ محفوظ کریں ان کے علوم وفنون کو ترقی دیں اور ان کے تمام امور کو عربی قالب دے کر ارتقائی انداز میں سب کا مشترک سرمایۂ حیات بنا دیں،یعنی ان کے اختلافات کی تعدیل کر کے وجہ ائتلاف پیدا کریں۔اسی لیے فقہا کے ہاں عرف کی بڑی اہمیت ہے۔ ہر علاقے کی اپنی خصوصیات اور ہر ملک کے اپنے دستور ہوتے ہیں،سیاست ،معاشرت معاملات،قوانین مملکت اور آداب نظم ونسق وغیرہ امور سے وہاں کے لوگوں کو انس ہوتا ہے اور مناسبت ہوتی ہے۔اب فقہا کا کام ہے کہ اقوام عالم کے تجربات سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور جو امور کتاب وسنت کے صریح احکام سے متعارض نہ ہوں، انہیں باقی رہنے دیں اور جہاں تعارض ہو وہاں ان کی اصلاح کر کے قواعد و دینیہ کے تحت لے آئیں۔

جیسا کہ مذکور ہوا اس وقت عالم اسلام میں تین فقہی مکتب تھے ایک فقہ حجاز جس کے علمبردار امام مالک تھے یہاں کا عرف عربی تھا اور عموماً صحابہ کرام کے قبائلی ماحول پر مبنی ۔دوسرا مکتب فقہی عراق کا تھا جس کی نمائندگی امام اعظم کرتے تھے۔یہاں کی معاشرت وماحول میں عجمیت کا امتزاج تھا،تیسرا مکتب فقہ شام کا تھا جس کے مرجع امام اوزاعی تھے۔یہاں کی معاشرت اور آداب معیشت میں رومی تمدن کا امتزاج تھا،گویا ان تین مکتبہائے فقہ کے ذریعے حجاز وعراق وشام کے عرف مستند قرار پائے اور یوں عرف کو عالم گیری ملی اور آیندہ کے لیے بھی طے ہوا کہ مسلمان جہاں جائیں وہاں کے عرف کی افادیت دیکھ کر اپنے اصول وقواعد کے تحت لے آئیں۔اس طرح ثقافت اسلامیہ کا ارتقا ہوا۔

خلافت عباسیہ کے قیام میں بلاد عجم کی تائید کو زیادہ دخل تھا اس لیے امیرالمومنین

المنصور کی توجہ امام ابوحنیفہ کے طریقۂ استدلال اورطرز استنباط پر مرکوز ہوگئی آپ نے امام صاحب کی یہ حیثیت پہچانی کہ انہیں اپنے حضور طلب کریں اوران کے ذریعے ایک وسیع فقہی مکتبے کی بنیاد رکھیں جوتمام عالم اسلام میں مقبول ہوسکے۔اسی لیے امام اعظم کواپنے پاس رکھا۔ پھرآپ ہی کے فاضل شاگردوں کوخلافت عباسیہ میں اعلیٰ ترین مناصب پرفائز کیا گیا۔

امیر المومنین المنصور کواس کا خاص اہتمام تھا کہ جس شخص کے سپرد جوکام کریں اس کے بارے میں تحقیق کرلیں کہ اپنے فقہی اصول میں وہ صحابہ کرامؓ کے منہاج سے ہٹا ہوا نہ ہو۔یہ غلط اطلاع آپ کوملی تھی کہ امام ابوحنیفہ کے ہاں مدار قیاس پر ہے اوروہ حدیث پراسے مقدم رکھتے ہیں اس لیے اس بارے میں ان سے وضاحت طلب کی امام صاحب کا یہ جواب شیخ ابوزہرہ نے اپنی کتاب ابوحنیفہ میں بھی نقل کیا ہے۔(ص۲۷۰)

یروی ان ابا جعفر المنصور کتب الیه بلغنی انک تقدم القیاس علی الحدیث فرد علیه ابوحنیفة برسالة جاء فیها ولیس الامر کما بلغک یا امیرالمومنین انما اعمل اولاً بکتاب الله ثم بسنة رسول الله ﷺ ثم باقضیة ابی بکر و عمرو عثمان و علی رضی الله عنهم ثم باقضیة یقیة الصحابة ثم اقیس بعد ذلک اذا اختلفوا.

[روایت ہے کہ (امیر المومنین) ابوجعفر المنصور نے انہیں لکھا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ قیاس کوحدیث پرمقدم رکھتے ہیں۔توامام ابوحنیفہ نے انہیں مراسلہ بھیجا جس میں لکھا تھا۔امیر المومنین بات وہ نہیں ہے جوآپ کوپہنچی ہے میں اوّل کتاب اللہ پرعمل کرتا ہوں پھر سنت رسول ﷺ پر پھر حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اورحضرت علیؓ کے فیصلوں پر پھر باقی صحابہ کے فتاویٰ پراس کے بعد جب ان میں اختلاف پاتا ہوں تو قیاس کرتا ہوں۔]

امیر المومنین المنصور کوسنت کی حفاظت کا اتنا اہتمام تھا کہ اس بارے میں تمام امور کی نگرانی آپ خود فرماتے اور ہدایات دیتے تھے جیسا کہ تدوین آثار کے سلسلے میں امام مالک کو

آپ نے فرمان بھیجا جو ہم دوسری جگہ نقل کر چکے ہیں یعنی محمد الارقط بن عبداللہ حسنی کے سلسلے میں، امیر المومنین موصوف کی اس سعی مشکور کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وھکذا اسس المنصور لحیوۃ علمیۃ ادبیۃ فی بغداد وکان اول ما انشأ بھا مدارس الطب والعلوم الدینیۃ انفق فی سبیلھا اموالا طائلۃ.

[اس طرح (امیر المومنین) المنصور نے بغداد میں علمی ادبی زندگی کی بنیاد ڈالی اور سب سے پہلے آپ نے وہاں طبی اور دینی علوم کی درسگاہیں قائم کیں اور اس راہ پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔]

یہی بات کتاب المعارف کے مقدمہ نویس ثروۃ عکاشہ نے لکھی ہے کہ عباسی خلفا کس طرح علوم وفنون کی تدوین ونشر اشاعت پر حریص تھے وہ کہتے ہیں:

کانوا من الخلفا العلما فرغبوا فی العلم واحسنوا وفادۃ اھلہ و شجعوھم علیہ وانتعشت بیغدادیمن فیھا وبمن وفدالیھاو اصبحت میداناً لحرکۃ علمیۃ فکریۃ واسعۃ.

[یہ خلفا چونکہ علما تھے اس لیے انہوں نے تحصیل علم پر لوگوں کو متوجہ کیا اہل علم کی قدردانی کی اور اس پر ان کی ہمت بندھائی۔اس طرح بغداد (علمی اور ثقافتی) حیثیت سے پروان چڑھا اور خود ان کے لیے جو وہاں رہتے ہوں اور ان کے لیے بھی جو باہر سے وہاں آئیں، فکری اور علمی حرکت کے لیے ایک وسیع میدان بن گیا۔]

امام ذہبی نے اپنے بیان میں یہ تصریح نہیں کی کہ ۱۴۳ھ سے تصنیف و تالیف کا جو کام شروع کیا گیا وہ امیر المومنین المنصور کے فرامین کی پذیرائی میں تھا لیکن یہ بات خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے ورنہ سب جگہ ایک ہی سال سے کام کیوں شروع ہوتا۔ جب تک مرکز کی طرف سے سب کو بیک وقت ہدایت نہ پہنچتی۔اس زمانے میں رسل ورسائل کے وسائل ایسے نہ تھے کہ ایک کام سن کر دوسرا بھی اسی وقت شروع کر دے۔

علاوہ ازیں چند حضرات کے اسمائے گرامی یہاں نقل کیے جاتے ہیں جن کے متعلق

صراحتاً معلوم ہے کہ ان کی تصنیف وتالیف کی ابتدا امیر المومنین المنصور کے فرمان پر ہوئی۔

ا۔امام مالک

محمد الارقط بن عبداللہ حسنی کی بغاوت کے احوال میں وہ فرمان ہم نقل کر چکے ہیں جو امیر المومنین المنصور نے آثار سلف کی تدوین کے سلسلے میں انہیں بھیجا اور ساتھ ہی تالیف کا طریقہ بھی بتادیا۔اسی فرمان کے آخری فقرے سے متاثر ہوکر انہوں نے اپنی کتاب کا نام ہی الموطا رکھا۔

۲۔محمد بن اسحٰق

یہ ایک ایرانی الاصل شخص تھے۔انہوں نے مغازی پر کتاب لکھی جس میں بے سروپا حکایات بھی لکھ دیں۔بہر حال یہ ابتدائی کام تھا۔امیر المومنین نے ملاحظہ فرما کر اسے قبول بھی کرلیا مگر اس ہدایت کے ساتھ کہ اس کی تدوین دوبارہ کریں۔چنانچہ سیرۃ ابن ہشام کے مقدمے میں ہے کہ امیر المومنین موصوف نے فرمایا تھا:**لقد طولته یاابن اسحق اذهب فاختصره والقی الکتب الکبیر فی خزانة امیر المومنین** [ابن اسحاق تم نے اسے بہت طویل کردیا۔جاؤ اور اسے مختصر کرو پھر وہ طویل کتاب امیر المومنین کے کتاب خانے میں داخل کردی گئی۔]

ابن اسحاق نے اسے مختصر کردیا جوامت میں متداول ہے انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ ہوگیا ہے مگر اہل قلم نے اس پر نظر ثانی ضروری سمجھی چنانچہ ابن ہشام نے اسی سے اپنی مشہور ومقبول سیرۃ مرتب کی اگر چہ پھر بھی بہت سی باتیں اس میں محل نظر ہیں اور اہل تحقیق ان کی نشاندہی کرتے رہتے ہیں۔

۳۔امام اعظم ابوحنیفہ

امام صاحب کا طریقۂ تدریس وہی تھا جس کی پابندی اموی عہد کے تمام علما وفقہا

کرتے تھے۔یعنی تعلیم زبانی ہوتی تھی اور علم سینہ بہ سینہ چلتا تھا۔آپ کے باون برس عہد اموی میں گزرے اور اسی نہج پر جو آپ کے اساتذہ کرام اور ہم عصر علما کا تھا۔یعنی تقریر پر مدار تھا اور شاگرد سب ارشادات اپنے ذہن میں محفوظ رکھتے تھے۔اگر کسی نے کچھ لکھا بھی تو یاد کرنے کے لیے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔عباسی عہد میں بھی ۱۴۲ھ تک آپ نے یہی طریقہ قائم رکھا۔

لیکن جب ۱۴۳ھ میں آپ نے کتابی صورت میں علم مدّون کرنا چاہا اور اس کے لیے خاکہ مرتب کیا تو دو برس بعد آپ کو بغداد طلب کرلیا گیا اور آخری پانچ برس آپ کے وہیں گزرے۔ان پانچ برسوں میں آپ کے متعلق تین کام تھے۔ایک دارالخلافہ کی تعمیر کی نگرانی، دوسرے یہ کہ بارگاہ خلافت میں امیرالمومنین کی فقہی آرا معلوم کرنے کے لیے دیار وامصار سے جو استفنا آئیں ان کے مناسب جواب دینا اور تیسرے یہ کہ خلافت اسلامیہ کے دفاعی امور پر منضبط ومدّون کتاب مرتب کرنا۔گویا امام صاحب کی زندگی کے یہ آخری پانچ سال انتہائی مشغولیت کے گزرے چنانچہ خود الملکی نے اپنی متضاد روایات کے انبار میں یہ سچی بات لکھ دی۔

ان ابا جعفر كان نقل اباحنيفة من الكوفة الىٰ بغداد وحبسه عند نفسه واراد على القضأ غير مرة فاعتذر واستعفىٰ واحتال بكل حيلة فى رفق ومداراة حتى عفاعنه وامره بالا قامة على يابه حتى يعرض عليه ما ورد من المسائل و القضايا من الامصار فينظر فيها ويا مرما يحب به ان يؤمر .فلم يزل مقيما عنده ببغداد لايأذن له فى الا نصراف الى الكوفة حتى مات بها. (مناقب النعمان،ج۲،ص۱۰۸)

[(امیرالمومنین)ابوجعفر نے (امام ابوحنیفہ) کو کوفے سے بغداد بلایا تھا اور اپنے ہی پاس انہیں ٹھہرایا۔کئی مرتبہ انہیں قاضی بنانا چاہا مگر وہ نرمی اور ادب کے ساتھ قسم قسم کے حیلوں سے اس منصب سے معاف رکھے جانے کے خواستگار ہوئے جب تک کہ انھوں نے انہیں معاف رکھا مگر حکم دیا کہ بارگاہ میں حاضر رہیں تا کہ مختلف شہروں سے جو حل طلب مسائل اور معاملات آئیں ان پر نگاہ ڈالیں

اورمناسب احکام صادر کریں چنانچہ انہی کی خدمت میں وہ مستقل طور پر بغداد رہے آپ انہیں کوفے واپس ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے جب تک کہ وہیں انہوں نے (یعنی حضرت امام نے) وفات پائی۔]۲

ایک سیدھی سادی بات کوان صاحب نے ہیرپھیر سے بیان کیا ہے کہ گویا یہ جبر تھا حالانکہ یہ ان پر امیرالمومنین کے بغایت اعتماد کے سبب تھا اور اس خاص اہم دینی ضرورت کے لیے وہ امام اعظم کو موزوں ترین شخص سمجھتے تھے کیونکہ خود امیرالمومنین کو اپنے مسلکی مسائل کے سبب اس طرف توجہ کی فرصت نہ تھی۔

۳۔تحریری کام

حضرت امام کے سب سے چھوٹے شاگرد امام محمد بن حسن آپ کے قیام بغداد کے زمانے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے یہیں آپ نے امور دفاع پر اپنی دونوں کتابیں سِیَـــــر کی املا کرائیں۔حکومت اسلامیہ کے لیے ایسی ایک منضبط تالیف کی سخت ضرورت تھی۔ چنانچہ سلطان الملک المعظم نے السہم المصیب میں بیان کیا ہے۔(ص۶۶ طبع دیوبند):

فان ابا حنیفة رضی اللہ تعالیٰ عنه املیٰ محمد ارحمه الله تعالیٰ کتابی السیر و ذکر فیها من امور الجهاد ووصایا الامراء وما ینبغی لهم فعله وما ینبغی ان یفعله اهل الثغور وقسمة الغنائم مالم سیبقه الیٰ جمعه' احد ولم یجمع مثله بعده احد.

[(امام) ابوحنیفہ نے (امام) محمد کو سیر کی دو کتابیں املا کرائیں ان دونوں میں آپ نے جہاد کے مسائل بتائے اور امرا کے وہ فرائض جن پر عمل ان کے لیے ضروری ہوتا ہے نیز وہ باتیں جو سرحدی علاقوں کے لوگوں پر واجب ہیں اور غنیمتوں کی تقسیم کے طریقے بتائے اس انداز میں کہ نہ ان سے پہلے کسی نے اس طرح جمع کیے تھے اور نہ ان کے بعد کوئی اس طرح جمع کرسکا۔]

امام محمد، امام اعظم کے سب سے چھوٹے شاگرد ہیں آپ کے بعد انہوں نے بقیہ علوم کی تکمیل امام ابو یوسف اور امام اوزاعی۔ امام مالک سے کی۔ امام محمد کی پیدائش ۱۳۵ھ کی ہے یعنی تعمیر بغداد کے وقت ۱۴۵ھ میں آپ دس برس کے تھے۔ امام اعظم کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی اور اس وقت شہر کی فصیلیں تیار ہوچکی تھیں۔ اگر بارہ چودہ برس کی عمر میں امام محمد نے یہ دونوں کتابیں اپنے شیخ کی املا سے لکھیں تو یہ بات ۱۴۷ھ سے ۱۵۰ھ کے درمیان کی ہوگی۔ اس زمانے میں اعلیٰ تعلیم کے لیے بارہ چودہ برس ہی کی عمر کافی ہوا کرتی تھی اور سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں رسمی تعلیم مکمل ہو جاتی تھی۔

کتاب الآثار

ظاہر ہے کہ جب ۱۴۳ھ میں فقہ اسلامی کو قید کتابت میں لانے کا کام شروع ہوا تو اس کے لیے بنیادی طریقہ یہی تھا کہ ارشادات نبویہ اور آثار صحابہ کو فقہی ابواب کے مطابق مرتب کیا جائے اور پھر مسائل کا استخراج ہو، چنانچہ امام اعظم نے اسی کی طرح ڈالی۔ سیوطی کا بیان ہے۔ (**تبييض الصحيفة في مناقب ابي حنيفه**)

> **من مناقب ابی حنيفة التی انفرد بها انه اوّل من دون علم الشريعة ورتبه ابواباً ثم تبعه مالک بن انس فی ترتيب الموطا ولم يسبق ابا حنيفة احد.**
>
> [ابوحنیفہ کے مناقب میں یہ اچھوتی بات ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے علم شریعت مدّون کیا اور (فقہی مسائل) کے مطابق اس کے باب متعین کیے پھر انہی کی پیروی میں موطا کی ترتیب مالک بن انس نے کی۔ یہ کام ابوحنیفہ سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔]

سیوطی کا یہ بیان محل نظر ہے۔ جب سب نے ایک ہی سال کام شروع کیا اور ایک دوسرے سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر رہتے تھے تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ایک نے دوسرے کی

پیروی کی۔امیر المومنین المنصور نے امام مالک کوجس انداز کا فرمان بھیجا تھا۔اس کا یہ قدرتی تقاضا تھا کہ وہ آثار کوفقہی ابواب میں مرتب فرمائیں اور جوبھی ذہین شخص فقہ کی کتابی تدوین کرے گا اسے لازماً سب سے پہلے احادیث کوفقہی ابواب پر مرتب کرنا ہوگا۔امام اعظم کا یہ ذہن رسا تھا کہ یہی طریقہ آپ نے اختیار کیا اور عجب نہیں کہ خود امیر المومنین موصوف نے انہیں بھی ایسی ہدایت بھیجی ہو جیسی امام مالک کو بھیجی۔قیاس کو حدیث پر مقدم نہ رکھنے کی ہدایت میں ایسے ایک فرمان کا اشارہ ملتا ہے اگرچہ تاریخ میں مذکور نہیں لیکن یہ بات سمجھ میں خود بخود آجاتی ہے کہ سینکڑوں میل کے فاصلے پر رہنے والے دوایک آدمی بیک وقت یہ کام شروع کریں اور ان دونوں کا طریقہ ایک ہی ہو،یہ تو ہو ہی نہیں سکتا جب تک دونوں کواوپر سے یکساں ہدایات بیک وقت نہ ملی ہوں۔

امام صاحب کی کتابیں

امام صاحب کوتحریری کام کرنے کے لیے کوفے میں صرف دو برس ملے اس لیے آپ نے کتاب الآثار کا خاکہ ہی مرتب کیا ہوگا۔بعض لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو مغالطہ سیوطی کولگا اسے سچ کر دکھائیں اور یہ باور کرانا چاہیں کہ کتاب الآثار امام اعظم کی زندگی ہی میں اورخود انہی کے ہاتھوں کتابی صورت اختیار کرچکی تھی۔حالانکہ یہ تصور قابل قبول نہیں۔

صحیح صورت حال یہ ہے کہ کتاب السیر ہو یا کتاب الآثار یاامام صاحب کی طرف منسوب کوئی دوسری کتاب ہوان میں سے کسی ایک کو مدّون کتاب کی صورت میں ان کی زندگی میں نہیں دی جاسکتی تھی۔تدوین وتالیف وتصنیف کا سب کام آپ کے بعد آپ کے عظیم المرتبت شاگردوں کے ہاتھوں انجام پایا اوراس وقت جب وہ خلافت اسلامیہ کے اہم مناصب پرفائز ہوئے الملک المعظم رحمہ اللہ نے کتاب السیر کی جوتصنیف کی ہے یاسیوطی نے کتاب الآثار کی۔یہ دراصل تعریف وتوصیف امام محمد کی سعی مشکور کی ہے جیسا کہ ہم آگے تصریح کریں گے۔یہاں ہم ایک اور مغالطے پرمتوجہ کرتے ہیں۔امام طحاوی نے بسند متصل اسد بن فرات کا یہ بیان نقل کیا ہے:

کان اصحاب ابی حنیفة الذین دونوا الکتب اربعین رجلاً وکان فی العشرة المتقدمین ابویوسف،زفر وداود الطّائی واسد بن عمرو،ویوسف بن خالد السمتی ویحیٰی بن زکریا بن ابی زائدہ وھو الذی کان یکتبھا الھم ثلاثین سنة.

[ابوحنیفہؒ کے وہ اصحاب جنہوں نے کتابیں مدّون کیں چالیس حضرات تھے ان میں اولین درجہ دس کا ہے ان میں یہ ہیں:ابو یوسف،زفر،داؤدالطائی،اسد بن عمرو،یوسف بن خالد السمتی،یحیٰی بن زکریا بن ابی زائدہ اوریہی یحیٰی ہیں جو ان کتابوں کوان کے لیےتیس برس تک لکھتے رہے۔]

اس بیان میں کئی حضرات کے اسماگرامی رہ گئے ہیں مثلاً عبداللہ بن المبارک (م۱۸۱ھ)امام حفص بن غیاث(م۱۵۰ھ)اورامام وکیع بن الجراح(۱۹۸ھ)جوامام شافعی اور امام احمد کے استاد ہیں۔علامہ شبلی نے مذکورہ بالا روایت نقل کرکے اعتراض کیا ہے کہ یحیٰی بن زکریا جو۱۲۰ھ میں پیداہوئے وہ۱۵۰ھ تک جوامام اعظم کاسال وفات ہے یہ کام تیس برس کیسے انجام دے سکتے تھے،علامہ شبلی جیسے فرزانہ شخص کو یہ مغالطہ کیوں ہوااوراس روایت سے انہوں نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ یہ سب تحریری کام ان حضرات نے امام اعظم کےحضورانجام دیا تھا۔یہاں تو یہ بیان کیا گیاہے کہ امام صاحب کے اصحاب میں جن حضرات نے تالیف وتصنیف کا کام کیا وہ یہ ہیں۔ہمارے زمانے کے بزعم خودایک 'بڑےمفکر اسلام' صاحب نےبھی امت کو یہی مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے کہ امام صاحب نے ایک غیرسرکاری مجلس قانون ساز بنائی تھی۔اورتیس برس کے اندرانہوں نے قانون اسلام مدوّن کرکے رکھ دیا جو پچاس برس کے اندرخلافت عباسیہ میں سرکاری حیثیت حاصل کرگیا ایک سیدھی بات کواس طرح کج کرکے غلط تاثر دینے کی کوشش کی گئی۔روایت میں یہ کہاں ہے کہ امام صاحب کے سامنے بیٹھ کر یہ حضرات آپ کے ارشادات مدّون کیا کرتے تھے۔بیان تو صرف اتنا ہے کہ امام اعظم کے اجّلہ تلامذہ جنہوں نے فقہ اسلام پر کتابیں لکھیں وہ یہ حضرات تھےاورظاہر ہے کہ یہ سب کام امام صاحب کی وفات کے بعد ہوا

اور پھر کچھ استبعاد نہیں رہتا کہ یحییٰ بن زکریا نے تیس برس تک ان حضرات کی خدمت میں حاضر رہ کر تصنیف و تالیف میں کتابت کے ذریعے ان کا ہاتھ بٹایا۔امام صاحب کی طرف منسوب کتابوں کے کئی کئی نسخے ہیں۔ان میں امام صاحب کے علاوہ دوسرے بزرگوں کے اقوال کا مذکور ہونا اور روایات کی کمی بیشی خود دلیل ہے کہ یہ تصانیف بعد کی ہیں۔

کتاب الا ثار کے نسخوں میں امام زفر،امام یوسف،امام محمد،امام حسن بن زیاد لؤلؤی کے نسخے زیادہ مشہور ہیں۔ان کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر بزرگوار نے اپنے حفظ اپنے درک اور اپنے فقہی رجحان کے مطابق امام اعظم کی مرویات مدّون فرمائی ہیں۔اس طرح یہ تصانیف ان بزرگواروں کی ہیں نہ کہ امام صاحب کی۔ان میں سب سے اہم امام محمد کی کتاب الا ثار ہے۔اسی طرح سیر کی دونوں کتابیں جو امام اعظم نے ،امام محمد کو بغداد میں املا کرائیں تھیں ان کی تالیف امام محمد نے اپنی تمام تصانیف کے بعد کی اور یہ امر متفق علیہ ہے۔گویا وہ ہیں تو امام صاحب کے املا پر مبنی مگر انہیں کسی حیثیت سے امام صاحب کی تصنیف نہیں کہا جا سکتا۔وہ امام محمد ہی کی تصنیف کردہ تسلیم کی جائیں گی۔

امام محمد کی شان یہ ہے کہ کتاب الا ثار کی طرح انہوں نے امام مالک سے المو طا کی بھی روایت کی ہے اور اس کا باقاعدہ درس دیتے تھے لیکن اس کتاب کو موطا،امام مالک بروایت امام محمد نہیں کہا جاتا بلکہ موطا ،امام محمد کہتے ہیں۔وجہ یہ ہے کہ اس میں محض امام مالک ہی کی مرویات نہیں ہیں بلکہ امام اعظم کا مذہب بھی برابر بیان کیا ہے اور اگر اپنے مذہب کے مطابق امام مالک کی کوئی روایت معمول بہا نہ ہو تو حنفی زاویہ نگاہ سے اس کے دلائل دیتے ہیں۔یہ حال کتاب الا ثار کا ہے کہ اس میں امام اعظم کے علاوہ دوسرے شیوخ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے یعنی صحیح بات یہ ہے کہ دونوں کتابیں امام اعظم یا امام مالک کی مرویات پر مبنی خود امام محمد کی اپنی فقہ کی کتابیں ہیں۔اسی لیے ان کی نسبت انہی کی طرف ہے اور ہونی بھی چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ موطا امام مالک اس کتاب کو کہتے ہیں جو یحییٰ المصمودی کی روایت پر مبنی امت میں متداوّل ہے اور اس میں امام مالک کے علاوہ کسی دوسرے کی روایت نہیں۔

یوں اہل تحقیق کا قول بالکل صحیح ہے۔امام اعظم کی اپنی کوئی تصنیف دنیا میں نہیں۔ آپ کی فقہی آرا اور آپ کی روایت کردہ احادیث سب کی تدوین آپ کے شاگردوں نے اس وقت کی جب وہ خلافت عباسیہ کے اہم کارکن بن چکے تھے۔

فقہ حنفی

امام یوسف اور امام محمد کی کتابیں بتاتی ہیں کہ وہ مقلد نہیں تھے بلکہ مجتہد مطلق تھے۔یہ اور بات ہے کہ ان کا بنیادی علم چونکہ امام اعظم کے فیوض پر مبنی تھا۔اس لیے لازماً اس کا رنگ حنفی رہا۔لیکن انہوں نے جگہ جگہ اپنے شیخ سے اختلاف بھی کیا ہے کیونکہ ان کے پیش نظر کوئی خاص مکتبہ نہ تھا بلکہ وہ عالم گیر فقہی نظام مرتب کرر ہے تھے۔امام ابن القیم رحمہ اللہ نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے:

الدين والفقه والعلم انتشر فى الامة عن اصحاب ابن مسعود واصحاب زيد بن ثابت،واصحاب عبدالله بن عمرو اصحاب عبدالله بن عباس.فعلم الناس عامة عن اصحاب هولاء الاربعة فاوا اهل المدينة فعلمهم عن اصحاب زيد بن ثابت وعبدالله بن عمرو اما اهل مكه فعلمهم عن اصحاب عبدالله بن عباس واما اهل العراق فعلمهم عن اصحاب عبدالله بن مسعود.

[دین ،فقہ اور علم اس امت میں اصحاب ابن مسعودؓ،اصحاب زید بن ثابت ، اصحاب عبداللہ بن عمرؓ اور اصحاب عبداللہ بن عباسؓ کے ذریعے پھیلا۔ عام طور پر لوگوں کا علم انہی چاروں کے اصحاب کے فیوض پر مبنی ہے۔اہل مدینہ کو علم حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی اصحاب سے ملا۔اہل مکہ کو علم حضرت عبداللہ بن عباس کے اصحاب سے ملا اور اہل عراق کو علم حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اصحاب سے ملا۔]

پچھلے صفحات میں گزر چکا کہ علما کوفہ اور حضرت ابن مسعودؓ کے تلامذہ نے ان اصحاب

سے بھی پورا فیض لیا جو کوفے میں تشریف لائے اور پھر یہ حضرات مدینے بھی حاضر ہوتے رہتے تھے تاکہ حضرت امیر المومنین عمر الفارق الاعظمؓ اور حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ الکبریٰؓ سے بھی اکتساب علم کریں۔اسی طرح امام اعظم نے اپنے کوفی اساتذہ کے علاوہ حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے خاص شاگرد حضرت عطا بن ابی رباح سے بھی استفادہ کیا۔علاوہ ازیں قاضی شریح (۸۰ھ) کے سلسلے میں آپ کو امام اہل الرائی سیدنا معاذ بن جبلؓ سے بھی فیض پہنچا۔

اپنے امام اور شیخ کے اسی منہاج پر ان کے شاگرد بھی چلے۔چنانچہ امام ابو یوسف نے امام اوزاعی سے فقہ شام پر عبور حاصل کیا اور امام محمد نے امام ابو یوسف کے علاوہ حضرت امام مالک اور امام اوزاعی سے پورا پورا فیض لیا غرض یہ ہے کہ عرف عام میں جسے فقہ حنفی کہا جاتا ہے وہ دراصل فقہ حجاز،فقہ شام اور فقہ عراق پر مبنی اسلام کا اولین فقہی نظام ہے جو امام اعظم کے تلامذہ نے اپنے امام کے طریقے پر مدّون کیا،مقلدانہ نہیں بلکہ مجتہدانہ۔اسی لیے امت میں فقہ حنفی سب سے زیادہ مقبول ہوئی اور چونکہ یہ عظیم الشان کام خلفائے عباسیہ کی امامت میں انجام دیا گیا اس لیے تمام عالم اسلام کا مقبول ترین فقہی نظام قرار پایا۔

یہ ہے امیر المومنین عبداللہ المنصور کا وہ کارنامہ جس کے سبب یہ امت ان کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی اور قیامت تک جتنے فقہا،علما وصلحا اور عوام اس فقہ پر عمل کریں گے ان کے اعمال کے ثمرات وانوار سے امیر المومنین موصوف کے درجات بلند تر ہوتے چلے جائیں گے۔من سن سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها ر''جس نے کسی نیک کام کی نہاد رکھی اسے اس کا ثواب ملے گا اور ان لوگوں کا ثواب بھی جو اس پر عمل پیرا ہوں گے۔''

مودودی صاحب جیسے لوگوں نے یہاں یہ خلاف واقعہ بات کہی ہے کہ فقہ حنفی کی تدوین خود امام اعظم نے ایک غیر سرکاری مجلس آئین ساز بنا کر اپنے شاگردوں کے تعاون سے اپنی زندگی ہی میں کر دی تھی وہاں انہوں نے یہ لغوبات بھی کہی ہے کہ یہ فقہ اپنی پشت پر کسی سرکاری قوت کے بغیر امت میں مقبول ہو گئی۔جو لوگ صحابہؓ کے اجماع سے منہ موڑ کر اپنے خود ساختہ اصول وقواعد کے تحت اموی اور عباسی خلافتوں کی حجیت پر حرف لانا چاہتے ہیں اور

واقعات سے آنکھ بند کر کے یہ خیالی فضا قائم کرنا چاہتے ہیں کہ خلفائے اسلام، علما اور فقہا امت کے مابین تعاون واحترام و یک جہتی کا فقدان تھا وہ دعوت محمدیہ کے فروغ اور ملّت اسلامیہ کے ارتقا کو غلط رنگ میں پیش کر کے یوں امت کے قلوب واذہان کو اسلاف کرام کی طرف سے مکدر کرنے کی سعی نامشکور کی معصیت میں مبتلا ہیں ان کی سمجھ میں اتنی بات نہیں آتی کہ کوئی تشریعی نظام اس وقت تک نافذ نہیں ہوسکتا جب تک اس کے عملاً نافذ کیے جانے کی خاطر اس کی پشت پر سیاسی قوت نہ ہو اور وہ قوت ایسی ہونی چاہیے کہ قوم اس پر صمیم قلب سے اعتماد کرتی ہو۔ قرآن مجید میں بھی احکام اسی وقت نازل ہوئے جب مدینے میں اسلامی حکومت قائم ہوگئی اور آنحضرت ﷺ کو نفاذ شریعت کی سیاسی طاقت حاصل ہوئی۔ جو سیاسی نظام قوم میں نامقبول ہوگا اور ملت اسلامیہ مجموعی حیثیت سے اس سیاسی نظام کو دل کی گہرائی سے اپنا ملی نظام نہیں سمجھے گی تو ناممکن ہے کہ اس حکومت کے جاری کردہ قوانین دائمی طور پر رائج ہوسکیں جونہی حکومت ہٹے گی اس کے قوانین بھی منسوخ ہو جائیں گے۔ پوری تاریخ انسانیت اس پر گواہ ہے۔

لیکن ہم دیکھتے یہ ہیں کہ حکومتیں بدلیں اور قسم قسم کے سیاسی مدّ وجزر سے یہ امت دوچار ہوئی مگر وہ فقہی نظام جو امیر المومنین المنصور اور ان کے اخلاف کرام کی نگرانی اور سرپرستی میں مدوّن ہوا۔ وہ آج تک اسی طرح مقبول چلا آرہا ہے۔ یہ کیسی کھلی دلیل ہے کہ اموی اور عباسی خلافتیں ہم عصر حکومت کے نزدیک صحیح معنی میں دعوت محمدیہ کی نمائندہ حکومتیں تھیں اور امت کی اطاعت اور ان سے دلی وابستگی کو تقاضائے ایمان جانتی تھی۔ اسی لیے وہ تمام تحریکیں ناکام ہوئیں جو ان خلافتوں کی دینی اور آئینی حیثیت ختم کرنے کے لیے جاری کی گئیں اور وہ سب افراد فنا کے گھاٹ اتر گئے جو اپنے تخریبی عزائم کے تحت کسی متفق علیہ خلیفہ کے خلاف بغاوت میں کھڑے ہوئے۔ لوگ اپنی تخریبی عزائم کے تحت کچھ بھی کہتے رہیں مگر تاریخی حقیقت یہی ہے کہ دین مبین اپنے تمام (کلیات) وجزئیات کے ساتھ عہد بہ عہد نظام خلافت ہی کے تحت علما وفقہا امت نے مدّون کیا اور یہ اسی باہمی تعاون واعتماد واحترام کا نتیجہ تھا جو حکومت قائمہ اور فقہا امت کے مابین ہمیشہ قائم رہا۔

مکتبۂ حنفیہ

چونکہ ہمارے پیش نظر صرف امام ابوحنیفہ کے مواقف ہیں اوران کے ذیل میں آپ کے تلامذہ کے،اس لیے دوسرے ائمہ کا ذکر آ گیا ہے یا آگے آئے تو محض ضمناً ہوگا۔سطور بالا سے واضح ہو گیا ہوگا کہ:

ا۔امام ابوحنیفہ پوری طرح جماعت سے وابستہ تھے اورفرقہ وارانہ تصورات کی ان کے ہاں کوئی گنجائش نہ تھی۔وہ اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ وحدت امت برقرار رکھنے کے لیے حکومت قائمہ سے اپنے تعلقات یگانگت پر ہمیشہ ثابت قدم رہے۔کیونکہ ان کے نزدیک اموی اورعباسی خلافتیں صحیح بنیاد پر قائم تھیں اور یہ ان کا فرض تھا کہ امام جماعت سے پوری طرح وابستہ رہیں اور ان تمام حرکتوں سے اپنا دامن بچائے رکھیں جن سے وحدت پاش پاش ہوتی ہو اورامت کا کلمہ متفرق ہوتا نظر آئے ان کا یہ مذہب شروع سے تھا اورآخر تک رہا۔یہی مذہب انہیں اپنے اساتذہ سے ملا تھا اوراسی کی تلقین انہوں نے اپنے تلامذہ کو کی۔جس پرانہوں نے عمل کیا اورخلافت قائمہ کے دست وبازو بنے۔

۲۔حضرت امام اعظم کے بارے میں زید بن علی بن الحسنؒ وغیرہ نے اموی خلافت میں اورمحمد الارقط بن عبداللہ حسنی وغیرہ نے عباسی خلافت میں جوخروج کیا۔امام صاحب اور دوسرے ہم عصر ائمہ نے ان خروجوں اور بغاوتوں سے قطعاً کوئی تعلق نہیں رکھااوروہ سب روایتیں عقلاً ونقلاً باطل ہیں جوہواپرست لوگوں نے اس ضمن میں بیان کی ہیں۔

۳۔حکومت قائمہ اموی ہویاعباسی قواعد دینیہ کے تحت تمام علماء وفقہاءعصر کا پورا احترام کرتی تھیں۔ایسی تمام روایات صدیوں بعد کے لوگوں کی خودساختہ ہیں جن سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خلفاء اورعلماء کے مابین دوئی تھی،اوروہ ایک دوسرے کے خلاف حریفانہ اورمعاندانہ جذبات رکھتے تھے،یہ کرامت ان خلفاء کی ہے کہ ہرایسی روایت اپنا بطلان خودثابت کردیتی ہے۔

تلامذۂ امام

امام ابوحنیفہ نے جس طرح ہدایات ربانیہ اور فرمودات نبویہ کے مطابق خلیفۂ عصر سے اپنے تعلقات یگانگت استوار رکھنا اوران کی اطاعت کرنا اپنا فریضۂ ملّی جانا اسی طرح ان کی اجلّہ تلامذہ کا طریقہ کار تھا، اوراسی باہمی ربط وصفاء کی برکت تھی کہ امت مسلمہ نے اپنے ارتقائی منازل طے کیے۔

۱۔امام زفر: امام صاحب کے سب سے بڑے شاگرد اور جانشین امام زفر ہیں۔جو امام صاحب کی زندگی میں بصرے کے قاضی مقرر ہوئے تھے اوراس خدمت سے وہ اس وقت مستعفی ہوئے جب اپنے شیخ کی وفات پران کی جانشینی کی ذمہ داری ان پر آپڑی۔جس کے فرائض انھوں نے اپنی وفات تک آٹھ برس انجام دیے۔ابن عبدالبر نے الانتقاء میں ان کے قاضی بننے کی دلچسپ روئداد نقل کی ہے:

> ''جب حکومت نے انھیں بصرے کا قاضی مقرر کیا (یعنی امیرالمومنین المنصور نے) توامام ابوحنیفہ نے ان سے فرمایا: 'ہمارے اوراہلِ بصرہ کے مابین جو اختلافات ہیں اور وہ لوگ جو ہم سے حسد کرتے ہیں،اس کے پیش نظر مجھے امید نہیں کہ تم اپنے فرائض کامیابی سے انجام دے سکو گے۔' لیکن امام زفر توکلاً علی اللہ وہاں گئے اوراپنا عہدہ سنبھال لیا۔بصری علماء ان کے پاس آنے لگے اور مناظرے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔جب امام زفر مخاطب کوفقہی مسائل میں قائل کر لیتے تو فرماتے: یہ ہے ابوحنیفہ کا قول۔لوگ تعجب سے کہتے: ابوحنیفہ کے علم میں اتنی گہرائی ہے؟ تو آپ فرماتے: اس سے بھی زیادہ۔'' (ابوزہرہ،ابوحنیفہ،ص۲۱۸)

یوں رفتہ رفتہ وہ تعصب جاتا رہا۔اب حکومت کے ساتھ تعاون اور امیرالمومنین موصوف کی فرماں برداری کی سب سے بڑی دلیل کیا ہوسکتی ہے کہ امام زفر نے اس علاقے کا قاضی بننا منظور کرلیا۔جہاں کا ماحول ان کے خلاف تھا۔یعنی انھوں نے اسے اپنا دینی فریضہ جانا

کہ حالات موافق ہوں یا مخالف امیر المومنین کا فرمان بجالانا چاہیے۔

۲۔امام ابو یوسف: امام زفر کے بعد درجہ امام یوسف کا ہے امیر المومنین المہدی عباسی نے آپ کو شرقی بغداد کا قاضی مقرر کیا۔پھر یہی عہدہ ان کے بعد امیر المومنین الہادی کے زمانے میں رہا۔امیر المومنین ہارون الرشید کے عہد زریں میں آپ کو قاضی القضاۃ بنادیا گیا۔شیخ ابوزہرہ کہتے ہیں:

ولقد ولی القضاء لثلاثة من الخلفاء للمهدی ثم للهادی ثم للرشید ویقول ابن عبدالبر کان الرشید یکرمه ویجلّه وکان عنده خطیبا مکینا۔ (ابوحنیفہ،ص ۱۹۶)

[وہ تین خلفاء کی طرف سے قاضی رہے یعنی المہدی، الہادی اور الرشید کے ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ الرشید ان کا بہت عزت واحترام کرتے تھے اور وہ ان کے ہاں بہت مقتدرا اور صاحبِ اختیار تھے۔]

اس سے پہلے اسلام میں قاضی القضاۃ کا کوئی عہدہ نہ تھا اور یہ شرف امام ابو یوسف کا ہے کہ آپ ہی سب سے پہلے قاضی القضاۃ بنے۔اسی عہدے کی برکت تھی کہ تمام عالم اسلام میں امام اعظم کے تلامذہ نے اسلام کا عدلیہ فقہ حنفی منظّم کیا۔کیونکہ صحابہ کرام سے لے کر اپنے عصر تک کے تمام فقہی مکتبۂ ہائے فکر سے اس کی تدوین میں پورا پورا استفادہ کیا گیا تھا۔اسی لیے ہر علاقے کے لوگوں نے خوش دلی کے ساتھ اس اجماعی فقہ پر عمل درآمد کرلیا۔اسی دوران آپ نے وہ معرکۃ الارا کتاب لکھی جو آپ کی کتاب الخراج کے نام سے مشہور ہے۔اس کی تالیف امیر المومنین ہارون الرشید کی فرمائش پر تھی۔اس کے مقدمے میں خود فرماتے ہیں:

ان امیر المومنین ایده الله تعالیٰ سأ لنی ان اضع کتاباً جامعاً

[امیر المومنین نے،اللہ تعالیٰ ان کا حامی وناصر ہو،مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں ایک جامع کتاب لکھوں۔]

گویا جس طرح امیر المومنین المنصور کی فرمائش پر امام مالک نے موطاً کی تدوین کی

اورامام اعظم نے سِیَر کی کتاب املا کرائی اسی طرح امیرالمومنین ہارون الرشید کے فرمان کی پذیرائی میں امام ابویوسف نے کتاب الخراج لکھی۔اسی عہد مبارک میں امام محمد نے اپنی عظیم الشان کتابیں لکھیں امام یوسف کی وفات ۱۸۲ھ میں ہوئی نام یعقوب تھا سلسلۂ نسب یوں ہے: یعقوب ابویوسف بن ابراہیم بن حبیب بن سعد بن حبتہ بجیلی امام ابویوسف کے فرزند یوسف اپنے والد ماجد کی حیات ہی میں عہدہ قضا پر مقرر تھے۔

۳۔امام محمد: امام محمد نے اپنے شیخ امام اعظم کے بعد امام ابویوسف ،امام مالک اور امام اوزاعی سے علوم کی تکمیل کی۔پھر امیر المومنین ہارون الرشید کے ایک قاضی مقرر ہوئے اور اسی منصب پر فائز ہونے کے بعد اپنی کتابیں لکھیں اور بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ عرف عام میں جسے فقہ حنفی کہتے ہیں اس کی تکمیل کا سہرا آپ کے سر ہے امام محمد اورامام کسائی نے ۱۸۹ھ میں ایک ہی دن وفات پائی۔امیر المومنین ہارون الرشید نے دونوں کی نماز جنازہ پڑھائی اور سرکاری اعزاز کے ساتھ ان دونوں عظیم ہستیوں کی تدفین کے بعد حسرت سے فرمایا: ''آج میرے ہاتھوں فقہ اور نحو دونوں زیر زمین ہیں۔'' امام محمد کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔شیبان سے نسب ولا کی بنا پر محمد الشیبانی کہلائے۔

۴۔ابن المبارک: امام اعظم کے خاص شاگرد ہیں۔صاحب تصنیف ہونے کے علاوہ ایسے جامع الکمالات تھے کہ رہتی دنیا تک یہ امت آپ پر فخر کرے گی۔امیر المومنین ہارون الرشید کے ساتھ آپ کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ایک مرتبہ ۱۷۹ھ میں آپ نے طرطوس کے جہاد میں شرکت کی۔جہاد بالقلم اور جہاد بالنفس سے آگے بڑھ کر جب اپنی امام کی معیت میں جہاد بالسیف کیا اور اس کی عظمت و برکت اور انوار آپ پر منکشف ہوئے تو اپنے اور امیر المومنین کے عزیز ترین دوست حضرت فُضیل بن عیاض کو حسب ذیل اشعار لکھ کر بھیجے:

یاعابد الحرمین لو ابصرتنا — لعلمت انک فی العبادۃ تلعب

من کان یخضب خدہ بد موعہٖ — فنحو رنابد مائنا نتخضب

اؤ کان یتعب حیلہ فی باطل — فخیولنا یوم الکریھۃ تتعب

ریح العبیر لکم ونحن عبیرنا　　رھج السنابک والغبار الاطیب

ولقد اتانا عن مقال نبینا　　قول صحیح صادق لایکذب

لایستوی وغبار خیل اللہ فی　　انف امراءِ ودخان نار تلھب

ھذا کتاب اللہ ینطق بیننا　　لیس الشھید بمیت لایکذب

[اے حرمین میں عبادت کرنے والے اگر آپ ہمیں دیکھتے تو جان لیتے کہ آپ کی عبادت ایک کھیل ہے۔اگر کوئی اپنے رخسار آنسوؤں سے رنگتا ہے۔تو ہم اپنے خون سے اپنے گلے رنگتے ہیں۔یا اپنے گھوڑوں کو فضول کاموں میں تھکاتا ہو۔تو ہمارے گھوڑے میدانِ کارزار میں تھکائے جاتے ہیں۔تمھارے لیے خوشبو گلال کی ہے اور ہمارا گلال اڑتی ہوئی مٹی اور پاک غبار۔ہمیں ہمارے نبی ﷺ کے ارشادات میں یہ صحیح اور سچا قول پہنچا ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔اللہ کی راہ میں گھوڑوں سے اٹھتا ہوا،غبار جو ایک آدمی کی ناک میں جائے گا اور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کا دھواں دونوں یک جا نہیں ہوسکتے۔یہ اللہ کی کتاب ہے جو فیصلہ سناتی ہے کہ شہید مرتا نہیں اور یہ بات جھٹلائی نہیں جاسکتی۔] (امام سبکی،طبقات الشافیۃ الکبریٰ،ج ۱۱،ص ۱۵۱)

امیر المومنین موصوف کو ان سے اتنی محبت تھی کہ ان کی وفات پر مجلس عزا منعقد کی، لوگ آکر امام ابن المبارک کی وفات پر تعزیت پیش کرتے تھے۔امام ابن المبارک کا ایک مشہور قصیدہ ہے جس میں آپ نے فرقہ بازوں کے عقائد واعمال سے بیزاری ظاہر کرکے جماعت اور اس کے امام سے وابستگی کو ضرورت دین میں بتایا ہے اور یہ کہ خلافت ہی کے ذریعے دین مبین کی حفاظت ہوسکتی ہے۔اس طویل قصیدے کے دو شعر یہ ہیں:

اللہ یدفع بالسلطان معضلہ　　عن دیننا رحمۃ منہ ورضوانا

لولا الائمۃ لم تامن لنا سبل　　وکان اضعفنا ھبا لا قوانا

[اللہ تعالیٰ خلیفۂ وقت کے ذریعے اپنی رحمت اور رضا سے ہمارے دین کی ہر مشکل

رفع فرماتا ہے۔ اگر خلفاء اسلام نہ ہوتے تو ہمارے لیے ہمارے راستے محفوظ نہ رہ
سکتے اور ہمارے کمزور لوگ ہمارے زبردستوں کا شکار بن جاتے۔]

یعنی ہماری دینی اور دینوی تمام ترقیاں، ملّت کا تحفظ وارتقاء اور ظاہری و باطنی فتنوں کے شر سے محفوظ رہنے کی سبیل نظام خلافت کے استحکام پر مبنی ہے۔

۵۔قاسم بن معن: یہ امام اعظم کے اجلّہ تلامذہ میں ہیں حضرت ابن مسعودؓ کی اولاد میں تھے۔ امام صاحب کی زندگی ہی میں امیر المومنین المنصور کی طرف سے کوفے کے قاضی رہے۔ مگر منصب کی تنخواہ قبول نہیں کی اور رضا کارانہ فرائض انجام دیے۔ امام اعظم ان کے متعلق فرمایا کرتے تھے: **انتم مسار قلبی وجلاء حزنی** (تم میرے دل کے سرور ہو اور دوائے قلب محزون) تمام اصحاب السنن کے مشائخ میں ہیں بعض کے نزدیک ۱۷۵ھ میں وفات پائی اور بعض نے سال وفات ۱۵۵ھ بتایا ہے۔ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے اور صحیح سال وفات ۱۵۵ھ ہی ہے۔

۶۔حماد بن ابی حنیفہ: امام اعظم کے یہ فرزند جلیل القاسم بن معن کے بعد کوفے کے قاضی ہوئے۔ (م ۱۷۰ھ) **الفوائد البھیه فی تراجم الحنفیه.**

۷۔اسماعیل بن حماد: امام صاحب کے یہ پوتے اوّل مشرقی بغداد کے قاضی رہے اور پھر بصرے اور رقّے کے (م ۲۱۲ھ) **الفوائد البھیه فی تراجم الحنفیه.**

۸۔حفص بن غیاث: یہ امام اعظم کے تلامذہ میں ہیں، سفیان ثوری اور یوسف سے بھی استفادہ کیا۔ ان سے جن حضرات نے استفادہ کیا، ان میں امام احمد، امام یحیٰی بن معین، امام علی المدینی جیسے بزرگوار ہیں۔ امیر المومنین ہارون الرشید کے عہد مبارک میں کوفے کے قاضی تھے۔ (م ۱۹۴ھ)

۹۔حسن بن زیاد لولوی: یہ امام اعظم کے شاگرد ہیں۔ کچھ دن کوفے کے قاضی رہے پھر مستعفی ہو گئے۔ (م ۲۰۴ھ)

۱۰۔امام اسد بن عمرو: یہ بھی امام اعظم کے اجلّہ تلامذہ میں ہیں۔ ان کے متعلق امام ذہبی

فرماتے ہیں:صحب اباحنیفة وتفقه علیه من اهل الکوفه فقدم بغداد وتولیٰ قضاء الشرقیه (اہل کوفہ میں سے انھوں نے ابوحنیفہ کی صحبت اختیار کی اور فقہ پر عبور حاصل کیا پھر بغداد آئے اور شرقی بغداد کے قاضی بنے۔)بعد عہد امیر المومنین ہارون الرشید ۱۹۰ھ میں وفات پائی۔

اصحاب امام مالک

خلفائے کرام کے ساتھ امام اعظم کے باہمی روابط اوپر بیان ہوئے۔ان کے عظیم المرتبت تلامذہ کا خلافت عباسیہ کے اہم مناصب پر فائز ہوکرفقہ اسلامی کی تدوین کرنا بھی بیان ہو چکا۔اسی طرح امام مالک اورخلفاء عباسیہ کے گہرے روابط کا حال بھی لکھا جاچکا۔اب ہم یہاں صرف چند مالکی حضرات کے اسمائے گرامی لکھتے ہیں۔

۱۔**ابومصعب زہری احمد بن ابی العوفی المدنی**:امام مالک کے خاص شاگرد ہیں۔امام نسائی کے علاوہ صحاح کے تمام مصنفوں کوآپ سے بلاواسطہ فیض ہے۔۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۴۲ھ میں وفات پائی۔مدینے کے قاضی تھے۔امام ذہبی ان کے متعلق فرماتے ہیں:احد الاثبات وشیخ اهل المدینة وقاضیهم ومحد ثهم۔[مسلم الثبوت حفاظ میں ہیں۔اہل مدینہ کے استاد تھے ان کے قاضی تھے اوران کے سب سے بڑے محدث تھے۔]

۲۔**حارث بن سکین**:امام مالک کے شاگرد،امیر المومنین المتوکل علی اللہ کے عہد میں مصر کے عہدۂ قضا پر فائز تھے۔

۳۔**عبداللہ بن الحکم**:یہ بھی امام مالک کے شاگرد ہیں۔مصر میں انتظامیہ کے اہم عہدے پر تھے۔بعد عہد امیر المومنین المتوکل علی اللہ۔

۴۔**امام شافعی**:آپ مجتہد مطلق ہیں۔امام مالک کے شاگرد،امام اعظم کے تلمیذ خاص اور وکیع بن الجراح کے بھی۔امام محمد سے آپ نے بہت استفادہ کیا ہے۔امام ذہبی فرماتے ہیں: اما الشافعی فاحتج بمحمد بن الحسن فی الحدیث (امام شافعی حدیث کے بارے میں امام محمد کی روایات کوحجت سمجھتے ہیں)۔(مناقب ابی حنیفه وصاحبیه)خطیب بغدادی

نے امام شافعی کا قول نقل کیا ہے (تاریخ بغداد، ج ۲، ص ۱۷۶): امن الناس علی فی الفقه محمد بن الحسن (تحصیل فی الفقہ میں مجھ پر سب سے زیادہ احسان محمد بن الحسن کا ہے)۔ حافظ سمعانی نے بلوغ الارمانی میں آپ کا یہ قول نقل کیا ہے: اعاننی الله بر جلین بابن عینیه فی الحدیث و بمجمد فی الفقه (اللہ تعالیٰ نے دو بزرگوں کے ذریعے میری مدد فرمائی حدیث میں ابن عینیہ کے ذریعے اور فقہ میں محمد کے ذریعے)۔

امیر المومنین ہارون الرشید کے قاضیوں میں امام شافعی بھی ہیں اور آپ کے شاگردوں اور ان کے شاگردوں کے سلسلے کے سیکڑوں حضرات صدیوں تک خلافت عباسیہ کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ اگر ان سب کی فہرست مرتب کی جائے تو ایک مجلد ہو۔ امیر المومنین المتوکل علی اللہ کو آپ سے خاص عقیدت تھی اور اتنی کہ بعض لوگ انھیں شافعی المذہب کہتے ہیں جو صحیح نہیں۔ کیونکہ اس وقت تک خلفاء کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے البتہ امیر المومنین القادر باللہ شافعی المذہب تھے اور شوافع کے صاحب تصنیف ائمہ میں ہیں (طبقات الشافیعہ الکبریٰ، ج ۳، ص ۱) اسی طرح امیر المومنین المستر شد باللہ بھی شافعی المسلک تھے۔ نیز بعض دوسرے خلفاء امیر المومنین المستضی باللہ اور امیر المومنین الناصر لدین اللہ حنبلی تھے۔

۵۔ امام احمد: آپ بھی مجتہد مطلق تھے۔ امام ابو یوسف اور امام وکیع ابن جراح سے رشتہ تلمذ تھا۔ امام ذہبی نے مناقب میں آپ کا یہ بیان نقل کیا ہے: اول ما کتبت الحدیث اختلفت الیٰ ابی یوسف القاضوا فکتبت عنه ثم اختلفت بعد الی الناس [سب سے پہلے میں نے جو احادیث لکھیں تو ان کے لیے قاضی ابو یوسف کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا اور ان سے احادیث نقل کی پھر دوسرے حضرات کے پاس گیا۔] اسی طرح امام محمد اور امام شافعی سے آپ نے اکتساب فیض کیا ہے۔ امیر المومنین المعتصم باللہ سے خلق قرآن کے سلسلے میں آپ کا اختلاف ہوا تھا۔ اور اس سلسلے میں لوگوں نے روایات کا ایک انبار لگا دیا ہے جن پر تنقید سے فی الحال ہمیں غرض نہیں۔ البتہ یہ واقعہ ہے کہ اس اختلاف کے بعد آپ سات برس امیر المومنین المتوکل علی اللہ کے عہد میں زندہ رہے اور اپنے مذہب کی تلقین کی اور وہ مذہب وہ نہیں تھا جو

لوگوں نے آپ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ آپ کا مذہب یہ تھا کہ کلامی مسائل میں گفتگو بے ضرورت اور بدعت۔ یعنی آپ کے نزدیک قرآن مجید کو غیر مخلوق کہنا بھی بدعت تھا اور مخلوق کہنا بھی آپ اس اعتقاد کو کافی وشافی بتاتے تھے کہ قرآن کلام اللہ ہے اور بس۔ یہ موضوع بھی طویل ہے اور ہمارے ائمہ نے اس پر کافی بحث کی ہے اور ان لوگوں کا قول غلط بتایا ہے جو کہتے ہیں کہ امام احمد قرآن مجید کو غیر مخلوق کہتے تھے اور کہنے والے کو کافر جانتے تھے۔ ملاحظہ ہو طبقات الشافعیۃ الکبری، ج ۵، ص ۸۰ بذیل مادہ امام عزالدین عبدالعزیز بن عبدالسلام قدس سرہٗ۔

فرماتے ہیں: **واحمد بن حنبل وفضلاء اصحابه و سائر علماء السلف براء الی الله مما نسبوه الیهم واختلفوه علیهم.** [احمد بن حنبل اور ان کے فاضل اصحاب اور تمام علماء سلف اس چیز سے بری ہیں جو لوگوں نے ان کی طرف منسوب کر دی ہیں۔ اور ان پر بہتان باندھے ہیں....]

بہر حال یہ امر مسلّم ہے کہ امیر المومنین المتوکل علی اللہ سے امام احمد کے تعلقات بہت خصوصی تھے اور اکثر امور میں وہ آپ کی رائے لیے بغیر کوئی حکم نافذ نہیں کرتے تھے۔ آپ ہی کی رائے کے مطابق امیر المومنین موصوف نے کربلاء کی مصنوعی قبریں جو عرصہ دراز کے بعد اٹکل پچو بنائی گئی تھیں وہاں کی بدعات اور مشرکانہ رسوم کی بنا پر منہدم کرادی تھیں۔ اسی مذہب کے مطابق سلطان ابن مسعود نے حرمین شریفین کی قبریں مسمار کرادیں۔ یہی مذہب امیر المومنین علیؓ کا تھا جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ اور یہی مذہب سیدنا عمرو بن العاصؓ کا تھا آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ آپ کی قبر پر نرم کنکریاں ڈال دی جائیں کہ رفتہ رفتہ قبر معدوم ہو جائے۔ دنیا دار الفنا ہے یہاں ثبات کی کوشش سعی لاحاصل ہی رہے گی۔

دیگر ائمہ

امام اعظم ان کے تلامذہ اور پھر ان کے وہ تلامذہ جو خود صاحب مذہب اور خود مجتہد ہیں ان کے اور خلافت قائمہ کے مابین روابط اور باہم تعاون واحترام کا یہ مختصر تبصرہ یوں تو بالکل

کافی ہے اور اس کا بین ثبوت کہ خلافت قائمہ اور ائمہ مذاہب کے مابین دوئی نہ تھی بلکہ امام المسلمین کی قیادت میں امت کا وحدانی نظام تھا جس کے تحت ہر مومن اپنی جگہ اپنے اپنے دائرے عمل میں حضور اکرم ﷺ کی دعوت کی آب یاری میں مصروف رہتا تھا اور وحدت امت کا تصّور دل سے محو نہیں ہونے دیتا تھا۔ اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجموعی حیثیت سے بھی سب باطل فرقے اتنی حیثیت نہ بنا سکے کہ عددی اعتبار سے امت کے سواد اعظم کے حریف ہو سکیں۔

اب ہم چند اور اکابر امت کا ذکر تازہ کرتے ہیں۔ جنھوں نے نظام خلافت کی دینی حجّیت اور خلفائے اسلام سے روابط کا استحکام ایک فریضۂ ملّیہ جانا۔

ا۔ **حضرت فضیل بن عیاض:** مشاہیر اولیاء اللہ میں ہیں۔ اکابر عبّاد اور زہّاد میں آپ کا شمار ہے۔ اہل حدیث کے ہاں آپ کو ثقفۃ ثبت امام (ثقہ اور قابل استناد امام) کہا جاتا ہے۔ آپ امیر المومنین ہارون الرشید کے خاص احباب میں تھے اور ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تھا۔ ایک مرتبہ حج کے موقعہ پر آپ نے امیر المومنین کو تشریف لاتے دیکھا تو عبدالرزاق سے فرمایا: (تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۴، طبع مصر)

> قال عبدالرزاق کنت مع الفضیل بکمة فمر هارون فقال فضیل الناس یکرهون هذا ومافی الارض اعزّ علیّ منه.
>
> [عبدالرزاق کہتے ہیں، میں فضیل کے ساتھ مکے میں تھا کہ ادھر سے ہارون کا گزر ہوا تو فضیل نے فرمایا لوگ انھیں پسند نہیں کرتے۔ مگر میرے نزدیک روئے زمین پر ان سے زیادہ لائق تعظیم و محبت کوئی نہیں۔]

عبدالرزاق سے یہ آپ نے اس لیے فرمایا کہ وہ شیعی خیال کے شخص تھے اگرچہ روایات ان کی بعض شرائط کے ساتھ قبول کر لی جاتی ہیں۔ مگر اپنے مخصوص تصورات کی بنا پر امام جماعت کی ان کی نگاہوں میں چنداں حرمت نہ تھی ممکن ہے حضرت فضیل کے اس ارشاد سے ان کی کچھ اصلاح ہو گئی ہو۔

۲۔ **حافظ اسحٰق بن موسیٰ الانصاری:** امیر المومنین المتوکل علی اللہ کے زمانے میں نیشا پور

کے قاضی تھے۔امام مسلم،امام ترمذی اورامام ابن ماجہ کے استادامام ذہبی فرماتے ہیں: کان من ائمة الحدیث و صاحب سنة. (وہ حدیث کے ائمہ میں ہیں اور عالم سنت)۔(م۲۴۴ھ)

۳۔حافظ ابوبکر بن ابی الدنیا: بالولا اموی قریشی ہیں،امام بخاری اورامام داؤد کے شاگرد اورامام ابن ماجہ کے استاد ہیں(م۲۸۱ھ)امیرالمومنین المعتضد باللہ عباسی اور دوسرے نونہالان خانوادۂ خلافت کے اتالیق رہے اوران کی تربیت کی۔

۴۔امام اوزاعی: ابونُعیم اصفہانی نے حلیۃ الاولیاء میں بڑی تفصیل سے مرجع اہل شام امام اوزاعی اورامیرالمومنین المنصور کی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔(ج۶ص۱۳۵)مگر اس تفصیل میں جواحادیث حضرت اوزاعی نے بیان کی ہیں ان کی صحت مشکوک ہےاوربعض بالکل بے پایہ ہیں۔غالباًکسی راوی نےتصرف کیاہے۔بہرحال امام اوزاعی فرماتے ہیں:

بعث الی ابوجعفر امیرالمومنین وانا بالساحل فاتیته فلما وصلت الیه وسلمت علیه بالخلافه رد علی و استجلسنی ثم قال ماالذی ابطاع بک عنایا اوزاعی؟قلت وما الذی ترید یا امیرالمومنین قال ارید الاخذ عنکم و الاقتباس منکم.قلت یا امیرالمومنین انظرولا تجهل شیئاً مما اقولک قال وکیف اجهله وانا اسالک عنه وقد وجهت فیه الیک واقد متک له؟قلت ان تسمعه ولا تعمل به ،قال فصاح بی الربیع واهوی بیده الی السیف فانتهره المنصور وقال هذا مجلس مثوبة عقوبة.فطابت نفسی و انبسطت فی الکلام.

[مجھے ابوجعفر المنصور نے طلب کیا میں اس وقت ساحل پر تھا،چنانچہ ان کے پاس گیا جب قریب پہنچا اورخلافت کے آداب بجالایا تو انھوں نے مجھے سلام کا جواب دیا،اپنے پاس بیٹھایا اورفرمایا اوزاعی آپ کو ہمارے پاس آنے سے کس چیز نے روکا تھا؟میں نے عرض کیا امیرالمومنین آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں فرمایا میں آپ سے کچھ حاصل کرنا اورفیض اٹھانا چاہتاہوں۔میں نے کہا امیرالمومنین غورکیجیے اور

جو کچھ میں آپ سے کہوں اس سے غافل مت ہو جایے۔فرمایا میں غافل کیسے ہوں گا جب کہ میں آپ سے پوچھ رہا ہوں آپ کے پاس قاصد بھیجا اور آپ کو یہاں بلایا۔ میں نے کہا ''یوں کہ آپ جو سنیں اس پر عمل نہ کریں'' اس پر ربیع نے مجھے ڈانٹا اور تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھا تو المنصور نے انھیں جھڑکا ''یہ محفل جزا کی ہے سزا کی نہیں'' تو مجھے اطمینان ہوا اور کھل کر بات کی۔]

جب مجلس ختم ہوگئی اور میں رخصت ہونے لگا تو امیر المومنین نے فرمایا:

شکرت لک نصیحتک و قبلتھا بقبول واللہ الموفق للخیر والمعین علیه وبه استعین وعلیه اتوکل و ھو حسبی ونعم الوکیل فلا تخلنی عن مطالعتک ایای بمثلھا فانک المقبول غیر التھم فی الضیحة .قلت افعل ان شاء الله.

[میں آپ کی نصیحت کا شکرگزار ہوں اور میں نے اسے دل سے قبول کیا اللہ تعالیٰ ہی بھلائی کی توفیق دینے والا ہے اور وہ اس پر مدد کرنے والا۔ میں اسی سے مدد طلب کرتا ہوں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور وہی میرے لیے کافی ہے اور بہترین کارساز ہے آپ اپنی توجہات سے مجھے محروم مت رکھیے گا کیونکہ خیرخواہی میں آپ مقبول ہیں اور متہم نہیں۔ میں نے کہا ان شاءاللہ ایسا ہی کرتا رہوں گا۔]

چنانچہ دونوں بزرگوں میں مراسلت ہوتی رہتی تھی اور امیر المومنین موصوف ان کی سفارشات قبول فرماتے تھے۔ یہاں اس کی تصریح نہیں کی کہ امیر المومنین نے دینی کتابیں لکھنے پر انھیں متوجہ کیا لیکن یہ کام آپ نے اسی ملاقات کے بعد کیا تھا۔جیسا کہ امام ذہبی نے ۱۴۳ھ میں ان کے کام کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔مذہب اوزاعی کے ایک جلیل القدر عالم تھے حافظ رحیم عبدالرحمان بن ابراہیم بن عمرو بن میمون (م ۲۴۵ھ) امام ذہبی نے ان کے متعلق لکھا ہے: ''حافظ حدیث،فقیہ کبیر ابوسعید اموی بطریق ولاءً دمشق کے رہنے والے تھے۔مذہب اوزاعی کے متبع اور شام کے محدث،امام ترمذی کے علاوہ صحاح کے تمام مؤلف ان کے شاگرد

ہیں۔ یہ اموی امام پہلے اردن اور فلسطین میں عرصہ دراز تک قاضی رہے۔اس کے بعد آپ کو امیر المومنین المتوکل علی اللہ نے مصر کا قاضی القضاۃ بنایا۔لیکن یہ عہدہ سنبھالنے سے پہلے آپ وفات پا گئے۔

غرض یہ ہے کہ اہل ہوا نے خلافت اسلامیہ اور علماء وفقہاء امت کے مابین منصب خلافت کے استخفاف کے لیے جو روایتیں وضع کی ہیں۔اکابر علماء وخلفاء پر بہتان باندھے ہیں اور صدیوں بعد کے مصنفوں نے ان روایات کو بے احتیاطی یا تعصب کے سبب اپنی کتابوں میں نقل کر دیا ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہمارے تمام ائمہ خلیفہ عصر کے ساتھ تعاون اور ان کے فرامین کی پذیرائی کو ضرورتِ دین میں سمجھتے تھے جیسا کہ حضور ﷺ نے امت کو وصیت کی ہے۔اور آپ کے بیسوں ارشادات صحاح میں مروی ہیں۔مجملہ ازاں یہ ارشاد مبارک ہے (صحیح بخاری، کتاب الفتن) حضرت حذیفہؓ نے حضور اکرم ﷺ سے فتنوں کے بارے میں کچھ سوال کیے:

> ''یا رسول اللہ ﷺ ہم جاہلیت اور شر میں تھے۔پھر اللہ تعالیٰ ہمارے پاس یہ خیر لے آیا (یعنی اسلام) تو کیا اس خیر کے بعد کچھ شر آ جائے گا؟ فرمایا: ہاں (یعنی ارتداد عرب) پھر میں نے عرض کیا: اس شر کے بعد خیر ہوگی؟ فرمایا: ہاں مگر اس میں کمزوری رہے گی۔میں نے عرض کیا: کمزوری کیا ہوگی؟ فرمایا: ایسے لوگ ہوں گے جو میری راہ سے ہٹ کر عمل کریں گے،ان کی کوئی بات تمھیں پسند ہوگی اور کوئی ناپسند۔میں نے عرض کیا: اس خیر کے بعد تو شر نہیں آئے گا؟ فرمایا: ہاں جہنم کے دراز ے پر بلانے والے کھڑے ہوں گے اور جو بھی ان کی طرف جھکے گا وہ اسے جہنم میں دھکیل دیں گے۔میں نے عرض کیا: ان کی کچھ نشانیاں تو بتایئے۔ فرمایا: ہمیں میں سے ہوں گے اور ہماری زبان بولیں گے (یعنی کہیں گے اپنے آپ کو مسلمان،مگر عقائد واعمال میں کتاب وسنت اور اجماع صحابہ کے خلاف ہوں گے) میں نے عرض کیا: اگر ایسا وقت آ جائے تو میرے لیے آپ کا کیا حکم ہے؟ فرمایا: مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام سے وابستہ رہنا۔''

علماء اور خلفاء کے باہمی تعاون اور احترام ہی کی یہ برکت تھی کہ دین اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دنیا میں پھیلا۔فتوحات اسلامیہ کا دائرہ بڑھا اور اقوام عالم میں ثقافت اسلامیہ کی عظمت ومقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ویسے ہمارے اسلاف کرام اور خلفائے عظام کے درمیان غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئیں اور بعض بعض کے مابین تو تلخی بھی پیدا ہوئی۔کشت وخون بھی ہوا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ پوری تاریخ پر خط نسخ پھیر کر کوئی یہ کہہ دے کہ ''چند قدم راہ راست چل کر جو یہ امت ہٹی تو ہٹتی ہی چلی گئی'' یا بقول ان مودودی صاحب کے ۴۰ھ کے بعد امت کی قیادت جاہلیت کے ہاتھ میں چلی گئی گویا تمام صحابہ جو ۴۰ھ کے بعد زندہ رہے اور تمام ائمہ وعلماء فقہاء امت سب جاہلیت کے پیرو چلے آتے ہیں نعوذ باللہ من شرّ الوسواس الخناس۔

وفات امام

امام اعظم کی وفات کے سلسلے میں ایک مکروہ بات کو بڑی شہرت دی گئی ہے۔یعنی امیر المومنین المنصور نے امام اعظم کو قاضی بنانا چاہا وہ تیار نہیں ہوئے تو قید کر دیا گیا۔تازیانے لگائے گئے اور بالآخر زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ امام صاحب کے نزدیک نظام خلافت باطل تھا اور آپ چاہتے تھے کہ خلافت علویوں میں آئے۔یعنی آپ کے نزدیک دین اور ملّت اور دعوت تو کوئی چیز نہ تھی ایک مخصوص خاندان کی حاکمیت پر عقائد واعمال کی صحت کا مدار تھا۔صفحات گزشتہ میں ان خرافات کی تنقیح کی جا چکی ہے۔یہاں ہم صرف آپ کی وفات کے بارے میں صحیح واقعہ لکھنا چاہتے ہیں۔اس سے اندازہ ہوگا کہ قید وتازیانہ اور زہر دینے یا باہمی بے حرمتی کی تمام داستان از سرتا پا باطل ہے اور قریب العہد مصنفوں نے ایسی کوئی بات نہیں لکھی۔

قریبی زمانہ طبری کا ہے (م ۳۱۰ھ) انھوں نے امام صاحب کے بارے میں تین روایتیں لکھی ہیں اور ان میں اس کا اشارہ تک نہیں کہ امام صاحب کو قید کیا گیا، کوڑے برسائے گئے یا زہر دیا گیا۔پہلی روایت تو وہ ہے جو تعمیر بغداد کے سلسلے میں ہم نقل کر چکے کہ امیر المومنین المنصور نے انھیں صاحب فضل وعدالت وتفقہ وامانت سمجھ کر بغداد طلب کیا اور آپ نے خدمت

مفوضہ انجام دی۔ دوسری روایت یوں ہے:

ان المنصور ارادبا حنیفه النعمان بن ثابت علی القضا فامتنع عن ذلک فحلف المنصوران یتولی له وحلف ابوحنیفه الایفعل فولاه القیام ببناء المدینة وضرب الذین وعده واخذا الرجال بالعمل قال وانما فعل المنصور ذلک لیخرج عن یمینه،قال و کان ابوحنیفة المتولی لذلک حتی فرع من استتمام بناء حائط ممایلی الخندق وکان استتمامه فی ۱۴۹ھ.

[المنصور نے ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کو قاضی بنانا چاہا مگر انھوں نے اس سے انکار کردیا اس پر المنصور نے قسم کھائی کہ انھیں ان کی خدمت انجام دینی ہوگی اور ابوحنیفہ نے قسم کھائی کہ وہ ایسا نہیں کریں گے اس لیے انھیں شہر کی تعمیر کے لیے اینٹیں بنوانے اور گننے اور لوگوں کو اس کام پر لگانے کی خدمت سپرد ہوئی۔ راوی کہتا ہے کہ المنصور نے یہ محض اپنی قسم پوری کرنے کے لیے کیا۔ پھر کہتا ہے کہا ابوحنیفہ اس کام کے متولی رہے یہاں تک کہ اس شہر کی وہ فصیل مکمل ہوگئی جو خندق سے ملحق تھی اور یہ تکمیل ۱۴۹ھ میں ہوئی۔]

تیسری روایت ہے:

ان المنصور عرض علی ابی حنیفة القضاء والمظالم فامتنع فحلف ان لایقطع عنه حتی یعمل. فاخبر بذلک ابوحنیفة فدعا بقصبة فعذ اللبن علی رجل قدلبنه و کان ابوحنیفة اول من عداللبن بالقصب فاخرج ایا جعفر عن یمینه واعتل و مات ببغداد.

[المنصور نے ابوحنیفہ کو قضاء اور مظالم کی دادرسی کی خدمت پیش کی مگر انھوں نے انکار کردیا اس پر المنصور نے قسم کھائی کہ انھیں اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک وہ کوئی خدمت انجام نہ دیں۔ ابوحنیفہ کو جب اس کی خبر دی گئی تو انھوں

نے ایک چھڑی منگوائی اور جس شخص نے اینٹیں بنائی تھیں اور اس کی اینٹیں گنیں ابو حنیفہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے چھڑی سے اینٹیں گنیں۔اس طرح انھوں نے ابو جعفر کی قسم پوری کر دی پھر وہ بیمار پڑ گئے اور بغداد میں وفات پائی۔]

صرف یہ تین روایتیں ہیں جو طبری نے اس سلسلے میں بیان کیں اس کا اشارہ بھی نہیں کہ ان دونوں بزرگواروں کے مابین کوئی تلخی تھی اور امام صاحب پر وہ تشدد کیا گیا جو بعد کے لوگوں نے بیان کیا ہے ،راعی اور رعایا کے مابین اس قسم کی باتیں کبھی نہ کبھی ہوتی رہتی ہیں۔ آخری روایت میں امام صاحب کی وفات بیماری کے سبب بیان کی گئی ہے نہ کہ کوڑوں کی ضرب یا زہر خورانی کے ذریعے۔یعنی ان کی وفات طبعی تھی۔

روایتیں اگر چہ تین ہیں لیکن صحیح روایت وہی ہے کہ جن حضرات کو ان کے علم وتقوی اور دیانت کے علاوہ فن تعمیر میں مہارت کی بنا پر طلب کیا گیا تھا ان میں امام صاحب بھی تھے۔اس خدمت کو مندرجہ بالا روایت میں خشت شماری سے تعبیر کر دیا گیا۔بر بنائے دیانت وتقویٰ نگرانی تعمیر کی اس خدمت کے علاوہ جو دوسری دو علمی خدمتیں تھیں جنھیں آپ نے بخوبی انجام دیا وہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔تعجب یہ ہے کہ حضرت حجاج بن ارطاۃ بھی فقیہ اور عالم تھے۔بغداد کی جامع مسجد انھی کی نگرانی میں تیار ہوئی تھی لیکن ان کے یا کسی دوسرے بزرگ کے متعلق خطیب نے ایسی کوئی بات نہیں لکھی صرف امام صاحب کو ان فضولیات کے لیے خاص کیا ہے۔یہ محض اس تعصب کے سبب ہے جو انھیں امام صاحب سے تھا اور مقصد ان کی توہین ہے اور یہ دکھانا کہ امیر المومنین المنصور کے نزدیک ان کی کوئی حرمت نہ تھی۔حتی کہ انھوں نے لغو روایت بھی لکھ دی:(السہم المصیب ،ص۱۲۳۔۱۲۴،طبع دیوبند)

''.....راوی بیان کرتا ہے کہ اس نے ابو مسہر کو یہ کہتے سنا کہ فلاں کے باپ پر ائمہ مساجد اس منبر سے لعنت کیا کرتے تھے اور اشارہ دمشق کے منبر کی طرف کیا۔ فرہیانی کہتے ہیں کہ فلاں کے باپ سے مراد ابو حنیفہ تھے۔''

یہ روایت نقل کر کے سلطان المعظم فرماتے ہیں:

لـم يـكـن غـرض الخطيب ان يذكر هذا عن ابى حنيفة انما جعل ابا حـنـيـفة ذريـعة واراد يـذكـر الناس بما نقل مما كان على منبر دمشق ولم اتتبع رجال هذا السند بالكشف لعلم الناس بمن اراد بالحكايته وشهرة الخبر اغنث عن ذكره. لانه احدًا الابلغى على المنير الا باذن الامـام و ابـو حـنـيـفة كان فى دولة بنى العباس فى زمن المنصور فلو لـعـن عـلـى مـنـبـر دمشـق لـكـان لـعـن عـلـى مـنـا برالعراق اذ هى دارالخلافه. ولم ينقل هذا الخطيب ولاغيره.

[خطیب کی غرض یہاں یہ نہیں ہے کہ ابوحنیفہ کا ذکر کریں۔انھوں نے تو ابوحنیفہ کو ذریعہ بنایا ہے کہ منبر دمشق پر جو کچھ ہوتا تھا اسے لوگ ذہن میں رکھیں میں نے اس سند کے راویوں کی تحقیق نہیں کی کہ اس حکایت میں جس شخص کا ذکر مقصود ہے اسے لوگوں کی معلومات کے لیے دریافت کروں کہ اس خبر کو مشہور کر کے کس کے ذکر کو ناپاک کیا گیا ہے، کیونکہ کوئی شخص خلیفۂ وقت کی اجازت کے بغیر منبر پر ایسی لغوبات نہیں کر سکتا۔ابوحنیفہ، المنصور کے عہد میں خلافت عباسیہ کے شہری تھے اگر ان پر دمشق کے منبر سے لعنت ہوتی تھی تو عراق کے منبروں پر بھی ہوتی ہوگی کیونکہ وہ دارالخلافہ تھا۔]

لیکن ایسی بات نہ خطیب نے کہی ہے اور نہ کسی دوسرے شخص نے۔

خطیب کو امیرالمومنین المنصور سے تعصب نہ تھا لیکن امام صاحب سے تھا اور اپنے تعصب میں وہ اتنے بہہ گئے کہ لوگوں کی نگاہوں سے انھیں گرانے کے لیے یہ ثابت کرنا چاہا کہ وہ بے حیثیت شخص تھے اور امام المسلمین کے ہاں ان کی کوئی حرمت نہ تھی۔ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں خطیب کی اس حرکت پر نکتہ چینی کی ہے کہ ان جیسے صاحب علم کو اس قسم کی ذہنیت سے بلند ہونا چاہیے تھا لیکن یہاں دیکھنا چاہیے طبری کو جنھیں اپنے مخصوص شیعی عقائد کی بنا پر نہ امیرالمومنین سے کوئی دلی تعلق تھا اور نہ امام صاحب سے۔اور وہ خطیب سے بہت پہلے

گزرے ہیں انھوں نے اس قسم کی کوئی بات کیوں نہیں بیان کی۔حالانکہ ایسی کوئی روایت انھیں پہنچی ہوتی تو اسے بخوشی نقل کرتے۔

طبری کے بعد قریب ترین عہد کا مورخ مسعودی ہے۔اسے بھی اپنے مخصوص عقائد کے تحت ان دونوں بزرگواروں سے کوئی دلی تعلق نہیں ہوسکتا تھا،اس نے تو کبار صحابہ پر طعن کی بہت سی باتیں لکھی ہیں۔لیکن امام صاحب کی وفات کے سلسلے میں صرف اتنا لکھا ہے:

وفی سنته خمسین ومائة مات ابوحنیفه النعمان بن ثابت مولیٰ تیم اللات بن بکر بن وائل فی ایام المنصور ببغداد وتوفی وهو ساجد فی صلونه وهو ابن سبعین سنه.

[۱۵۰ھ میں ابوحنیفہ نعمان بن ثابت جو تیم اللات بن بکر بن وائل کے موالی میں تھے،انھوں نے بعد عہد امیرالمومنین المنصور بغداد میں وفات پائی۔نماز پڑھتے وقت سجدے کی حالت میں ان کا انتقال ہوا اور وہ اس وقت ستر برس کے تھے۔]

تدفین

امام صاحب کو امیرالمومنین المنصور نے سرکاری اعزاز کے ساتھ اپنے خاندانی قبرستان میں دفن کروایا۔ابن قتیبہ (م ۲۸۶ھ) جو طبری سے بھی پہلے گزرے ہیں انھوں نے المعارف میں امام صاحب کا تذکرہ اس عنوان سے کیا ہے ''ابوحنیفۃ صاحب الرائی رضی اللہ عنہ'' اور فرماتے ہیں:

ومات ببغداد فی رجب سنة خمسین ومائة وهویو میذ ابن سبعین سنة ودفن فی مقابر الخیزران.

[آپ کی وفات بغداد میں ہوئی رجب ۱۵۰ھ میں۔اس وقت آپ ستر برس کے تھے اور مقابر خیزران میں دفن کیے گئے۔]

امیرالمومنین نے جن حضرات سے خدمات ملّیہ لیں اور جن حضرات کی ان کی دل

میں قدر تھی ان کی وفات پر اعزازاً اپنے خاندانی قبرستان میں جگہ دی۔سیدہ خیزران امیر المومنین ہارون الرشید کی والدۂ ماجدہ تھیں۔بعد میں یہ قبرستان انھی کے نام سے مشہور ہوگیا۔چنانچہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

واول من دفن فیها الباقونه بنت المهدی ثم الخیزران ودفن فیها محمد بن اسحٰق صاحب المغازی ،والحسن بن زید،ونعمان بن ثابت وقیل هشام بن عروة.

[سب سے پہلے وہاں امیر المومنین المہدی کی صاحبزادی یاقونہ دفن ہوئیں پھر سیدہ خیزران۔اور وہیں محمد بن اسحاق صاحب المغازی دفن ہوئے نیز حسن بن زید اور نعمان بن ثابت اور کہتے ہیں ہشام بن عروہ بھی۔]

یہ حضرت حسن بن زید بن حسن بن علی بن ابی طالب،امیر المومنین کے ہاں نہایت مقرب تھے اور ان کی طرف سے مدینے کے والی بھی رہے ہیں پھر آپ نے انھیں اپنا ندیم بنالیا اور وفات پر اپنے قبرستان میں انھیں دفن کیا۔

ہشام بن عروۃ بن الزبیر،سیدنا زبیرؓ کے پوتے تھے اور انھیں علم الانساب اور تاریخ کا علم اپنے والد ماجد حضرت عروہؓ سے ملا جو حضرت ام المومنین عائشہؓ کے سگے بھانجے اور شاگرد رشید تھے۔

اسی طرح ابوعبداللہ الحاکم نے (معرفۃ علوم الحدیث،ص۱۹۴) میں لکھا ہے:

قال ابوعبدالله فاما مدینۃ السلام فانی لااعلم صحابیاً توفی بها.الا ان جماعته من التابعین واتباع التابعین نزلو اها وماتوا یها.منهم هشام بن عروةبن الزبیر ومحمد بن اسحاق بن یسار،و اسماعیل بن سالم الاسدی وابوحنیفة الفقیه و شیبان بن عبدالرحمن النحوی وابراهیم بن سعد الزهری جماعته هولاء فی مقبرة الخیزران.

[ابوعبداللہ کہتے ہیں:مدینہ السلام بغداد کے متعلق مجھے علم نہیں کہ وہاں کسی صحابی کی

وفات ہوئی ہو مگر یہ ہے کہ تابعین اور اتباع تابعین میں سے ایک جماعت وہاں آئی اور وہ حضرات یہیں دفن ہوئے۔ان میں ہشام بن عروۃ بن الزبیرؓ ہیں اور محمد بن اسحاق بن یسار اسماعیل بن سالم الاسدی، ابوحنیفہ الفقیہ، شیبان بن عبدالرحمٰن النحوی اور ابراہیم بن سعد زہری ہیں۔ یہ سب حضرات مقبرہ خیزران میں دفن ہیں۔]

اس تدفین کے عمل سے ہی ثابت ہوتا ہے کہ امیر المومنین المنصور کے ہاں امام اعظم کا کتنا احترام تھا مگر ہوا پرست لوگوں نے امت کے ان عظیم المرتبت اماموں کے بارے میں کیسی لغو اور فضول باتوں کو شہرت دی ہے۔

علمائے امت دین کی بنیاد پر خلفائے اسلام کے ساتھ اپنے روابط مضبوط رکھتے تھے اور خلفاء کے ہاں بھی علمائے امت کا بغایت احترام تھا۔اسی وجہ سے علوم وفنون کی ترویج ہوئی اور ثقافت اسلامیہ کو فروغ ہوا۔ کتنے بزرگوں کے احوال ہیں جنھوں نے اگر خلفائے اسلام کے ہاں وفات پائی تو ان کی تدفین سرکاری اعزاز سے ہوئی اور امیر المومنین نے خود ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ابوعبداللہ الحاکم لکھتے ہیں (معرفۃ علوم الحدیث، ص۱۹۴) کہ: ''عبدالعزیز بن عبداللہ بن ابی سلمۃ الماجشون جو اکابر علماء میں ہیں وہ بغداد تشریف لائے اور وہیں وفات پائی تو امیر المومنین المہدی عباسی ان کی دفن میں شریک ہوئے خود نماز پڑھائی اور مقابر قریش میں انھیں دفن کیا، اسی طرح عبدالملک بن محمد بن ابی بکر بن حزم کو امیر المومنین الرشید نے قاضی بنایا۔ان کی وفات پر خود نماز پڑھائی اور مقابر قریش میں انھیں دفن کیا اور ایسے ہی سیکڑوں واقعات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوا پرست لوگوں نے خلافت قائمہ اور علماء وفضلاء امت کے مابین اختلافات کے جو فرضی واقعات بیان کر کے نظام خلافت کو باطل قرار دینا چاہا ہے وہ اپنے بیان میں کاذب ہیں اور افترا پرداز۔

حوالہ جات

۱۔ امیرالمومنین المامون کا حافظہ بھی عجوبۂ روزگار تھا۔عبداللہ بن ادریس کی خدمت میں حاضر ہوئے جو امام اعظم کے اکابر تلامذہ میں ہیں۔انہوں نے سو حدیثیں بیان کیں بعد میں المامون نے عرض کیا عم محترم اجازت ہو تو یہ احادیث سناؤں۔ابن ادریس نے فرمایا سناؤ تو انہوں نے من وعن سب سنادیں۔ابن ادریس دنگ رہ گئے۔یہ زمانہ مامون کی ولایت عہد اور طالب علمی کا تھا۔(تذکرۃ الحفاظ)

۲۔ عہدۂ قضا قبول کرنا آسان کام نہیں اسی لیے ہمارے بہت سے ائمہ قاضی بننے سے گریز کرتے تھے دو آدمیوں کے مابین فیصلہ کرنا اتنا سخت کام ہے کہ حسب روایت احمد وابی داؤد وترمذی وابن ماجہ من جعل قاضیا بین الناس فقد ذبح بغیر سکین (جس شخص کو لوگوں کے مابین قاضی بنایا گیا تو گویا اسے چھری کے بغیر ذبح کردیا گیا) وقائع تاریخی میں ہمارے بعض ائمہ کا قاضی بننے سے انکار اسی خوف وخشیت کی بنا پر تھا نہ کہ اس لیے جو ہوا پرست لوگوں نے بیان کیا ہے کہ وہ حکومت سے تعاون کرنا نہیں چاہتے تھے اور جنہیں اپنے اوپر اعتماد تھا انہوں نے یہ عہدہ قبول کیا ورنہ ہمارا عدلیہ اہل عالم کے لیے نمونہ کیسے بنتا۔

امام اعظم ابوحنیفہ اور شیعیت

امیر المومنین سیدنا عثمان ذوالنورین صلوٰت اللہ وسلامہ علیہ، روئے زمین کے عظیم ترین حکمراں تھے۔ جن کے ایک اشارے پر ملک کے ملک فتح کر ڈالے جاتے تھے۔ جن کے احکام سے سرتابی کو خدا اور رسول کی نافرمانی سمجھا جاتا تھا اور جن کی شخصیت صحابہ کرام کی نگاہ میں محبوب ترین تھی۔ شاعر اپنی محبوبہ سے کہتا ہے:

احبک والرحمن

حب قریش عثمان

[بخدا میں تجھ سے ایسی محبت کرتا ہوں جیسی محبت قریش کو عثمان سے ہے۔]

اس سرآمد محبوبان بارگاہ احدیت ورسالت کو چند بے ننگ ونام لوگوں نے خاص دار الخلافہ میں شہید کر ڈالا اور سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ یہ سانحہ امام برحق کے محض اس اصرار کے سبب ہوا کہ کسی کلمہ گو پر تلوار نہ اٹھائی جائے۔ ورنہ ایسا کرنے والے کو میں اپنی بیعت سے خارج کردوں گا۔ اس منظر کا نقشہ حضرت کعب بن مالک انصاریؓ نے یوں کھینچا ہے:

فکف یدیہ واغلق بابہ	وایقن ان اللہ لیس بغافل
وقال لاھل الدار لا تقتلوھم	عفا اللہ عن کل امری لم یقاتل
فکیف رأیت اللہ صب علیھم	السعداوۃ والبغضاء بعد التواصل
وکیف رأیت الخیر ادبر بعدہ	عن الناس ادبار الریاح الجوافل

[انھوں نے اپنے ہاتھ روک لیے اور پھر گھر کا دروازہ بند کرلیا۔اور یقین رکھا کہ اللہ تعالیٰ غافل نہیں اور وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔جولوگ گھر کی حفاظت کے لیے جمع تھے ان سے فرمادیا،انھیں قتل مت کرنا خدا ہراس شخص کوبخش دے جوتلوار نہ اٹھائے۔تو دیکھو اللہ نے ان لوگوں کو یک جہتی کے بعدان کے مابین کس طرح عداوت وبغض کومسلط کردیا۔اور دیکھو کہ ان کی شہادت کے بعد بھلائی نے لوگوں سے کیسے منہ موڑ لیا۔جیسے تیز وتند ہوا اسے اڑا لے گئی ہو۔]

خواجہ حسن بصری اس وقت چھ برس کے تھے مگر یہ منظر جوبچپن میں خود بھی دیکھا اور بزرگوں سے سنا انھیں خوب یاد تھا۔فرماتے ہیں: (تفسیر المنار ج،۸)

خرج علینا عثمان بن عفان رضی اللہ عنه یوما یخطبنا فقطعوا علیه کلامه فترامو ابالبطحاء حتی جعلت مابصر ادیم السماء قال و سمعنا صوتا من احدیٰ حجرازواج النبی صلی اللہ علیه وسلم فقیل ھذا صوت ام المومنین قال سمعتھا وھی تقول الا ان نبیکم قدبری ممن فرق دینه واحتزاب وقالت: ان الذین فرقوا دینھم و کانوا شیعاً لست منھم فی شئ.

[امیر المومنین عثمانؓ ایک دن خطبے کے لیے تشریف لائے تولوگوں نے آپ کی بات کاٹ دی اوراتنی کنکریاں پھینکیں کہ فضا پر چھا گئیں اور مجھے آسمان نظر نہیں آتا تھا اتنے میں ازواج مطہرات کے ایک حجرے سے آواز بلند ہوئی اور کہا گیا کہ یہ ام المومنین عائشہ صلوٰت اللہ علیہا کی آواز ہے۔آپ فرمارہی تھیں یادرکھو تمھارے نبی اس شخص سے بری ہیں جس نے اپنے دین کوٹکڑے ٹکڑے کرکے گروہ بندی کی پھر یہ آیت پڑھی ''جن لوگوں نے اپنے دین کوٹکڑے ٹکڑے کردیا اورگروہ گروہ بن گئے (اے نبی) ان سے کسی بارے میں کوئی تعلق نہیں۔'']

یہ تھی اس مظہر جمال خلیل اللہ اور پرتو کمال ذبیح اللہ کی شہادت عظمیٰ جس کی نظیر از آدم

تا ایندم کہیں نہیں ملتی کہ پوری طاقت رکھنے اور اپنے فدائیوں کی جمعیت کے باوجود آدمی تلوار نہ اٹھانے دے اور جان اِلے جان آفریں کے سپرد کردے۔ پھر انھی قاتلوں کے ہاتھ حضرت علیؓ کی خلافت کا اعلان کردیا گیا اور اس سبب سے اس وقت مسلمانوں کے دو سیاسی گروہ پیدا ہوگئے اور حالات ایسے بگڑے کہ کشت وخون تک نوبت پہنچی۔

جس گروہ نے حضرت علیؓ کی خلافت تسلیم کر لی تھی اور ان میں بعض صحابی بھی تھے، یہ لوگ شیعہ علی کہلائے۔ ان کا موقف تھا کہ اوّلین مسئلہ حضرت علیؓ کی بیعت کی تکمیل کا ہے۔ اس کے بعد دوسرے مسائل ہیں۔

ان کے مقابلے میں وہ صحابہ اور دیگر حضرات تھے جن کے نزدیک اوّلین مسئلہ خون عثمانؓ کے قصاص کا تھا۔ اس کے بعد حضرت علیؓ کی خلافت تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا، کیونکہ وہ اس بیعت کے انعقاد کا طریقہ درست نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ یہ نئی خلافت شہید مظلوم کے قاتلوں نے برپا کی تھی۔ اور وہی اس کے کرتا دھرتا بنے ہوئے تھے۔ یہ حضرات شیعہ عثمان کہلائے ان میں بھی اجلّہ صحابہ تھے۔ یعنی عشرہ مبشرہ میں حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور سب سے بڑھ کر ام المومنین عائشہ صدیقہ صلوات اللہ علیہا۔ نیز حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ وغیرھم۔

اسی اختلاف کے سبب جمل وصفین کے معرکے ہوئے۔ لیکن شیعہ علی اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہوسکے اور حضرت علیؓ کی خلافت کی آئینی حیثیت آخر وقت تک معرض بحث رہی جب تک کہ آپ ہی کے ایک باغی نے آپ کو شہید کردیا۔ یہ اختلاف خالص سیاسی تھا اور اجتہاد پر مبنی۔ اسے پُرامن طریقے پر طے کیا جاسکتا تھا اور اس کے مواقع بھی بار بار پیدا ہوئے مگر امت کے اندرونی دشمنوں کے سبب ایسا نہ ہوسکا اور مفت میں خونریزی ہوئی، اس نزاع کے سیاسی اور اجتہادی ہونے کی سب سے بڑی دلیل کیا ہوگی کہ اگر ایک طرف حضرت علیؓ ہیں تو دوسری طرف ان کے سگے بڑے بھائی حضرت عقیلؓ۔ اگر حضرت علیؓ کی طرف مہاجر بن خالدؓ بن ولید ہیں تو حضرت معاویہؓ کی طرف ان کے بھائی عبدالرحمان بن خالدؓ بن ولید۔ اگر حضرت علی کے ساتھ محمد بن ابی بکرؓ ہیں۔ تو حضرت معاویہؓ کے ساتھ ان کے بڑے بھائی حضرت عبدالرحمان بن ابی بکرؓ۔

اگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ غیر جانبدار ہیں تو ان کے بھائی حضرت عبیداللہ بن عمرؓ حضرت معاویہؓ کے ساتھ ہیں۔معلوم ہوا کہ شیعہ علیؓ اور شیعہ عثمانؓ میں نہ کوئی دینی اختلاف تھا اور نہ خاندانی چپقلش، بلکہ یہ دو سیاسی گروہ تھے جو فلاح امت کے لیے اپنے اپنے موقف کو صحیح سمجھتے تھے اور انھیں اپنی حقانیت وعزائم کے تعمیری ہونے کا ایسا یقین تھا کہ ایک دوسرے کے خلاف تلوار اٹھانے سے بھی وہ باز نہ رہ سکے۔

لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص اگرچہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ ہیں لیکن جنگ میں حصّہ نہیں لیتے اور اسے مفادِ ملّت کے خلاف جانتے ہیں اسی طرح حضرت حسنؓ ہیں تو اپنے والد ماجد کے ساتھ مگر قتال سے انھیں بھی گریز ہے اور چاہتے ہیں کہ امت کا کلمہ متحدر ہے اور خوں ریزی نہ ہو۔۲ حضرت معاویہؓ کو حضرت علیؓ کی بیعت سے انکار نہیں بشرطیکہ وہ قاتلان عثمانؓ سے بے تعلق ہو جائیں حضرت علیؓ کو قصاص عثمانؓ کے وجوب سے انکار نہیں ،مگر چاہتے ہیں کہ اوّل ان کی بیعت کی تکمیل ہو۔

ساری پیچیدگی ان قاتلوں نے پیدا کر دی ہے جو حضرت علیؓ کی خلافت پر حاوی ہیں اور کوئی مسئلہ خوش اسلوبی سے طے نہیں ہونے دیتے کیونکہ انھیں اپنی خیر نظر نہیں آتی،ان کا نصب العین ہے کہ امت میں فساد ہو۔اور انتشار پھیلے،ان کے عزائم کے بارور ہونے کی سبیل ہی یہ تھی کہ امت کا کلمہ متفرق رہے اور ائتلاف کی صورت پیدا نہ ہونے پائے۔اسی لیے اس سیاسی خلفشار کو وہ مذہبی اور خاندانی رنگ دے کر فرقہ بازی کے درپے ہیں۔تا کہ امت کا مستقبل تباہ ہو۔حضرت علیؓ کی خواہش بھی تھی کہ اس چپقلش کو صرف سیاسی سمجھا جائے۔اور فرقہ بازی پیدا نہ ہونے پائے۔چنانچہ یہی مسئلہ صاف کرنے کے لیے آپ نے صفین کے بعد ثالثی نامہ ہونے پر اپنے اور اہل شام کے بارے میں ایک گشتی مراسلہ جاری کیا اور اپنی وضاحت کر دی کہ ان جنگوں کو سیاسی کے علاوہ کوئی دوسرا رنگ نہ دیا جائے۔یہ مراسلہ کتب تاریخ کے علاوہ نہج البلاغۃ کے مصنف نے بھی نقل کیا ہے۔(نہج البلاغۃ،جز۲،ص۱۵۹)

''یہ گشتی مراسلہ ہے۔جو (علی) علیہ السلام نے تمام شہروں میں بھیجا۔اس میں آپ

نے وہ صورت حال بیان کی ہے۔جو آپ کے اور اہلِ شام کے مابین پیدا ہوگئی تھی،اس میں فرماتے ہیں:....ہمارے معاملے کی ابتدا یہ ہوئی کہ ہم میں اور اہل شام میں مقابلہ ہوا۔ظاہر ہے کہ ہمارا اوران کا خدا ایک،ہمارا اور ان کا نبی ایک،ہماری اور ان کی دعوت اسلام ایک،اللہ پر ایمان رکھنے اور اس کے رسول کی تصدیق کرنے میں نہ ہم ان سے زیادہ ہیں اور نہ وہ ہم سے۔پس معاملہ واحد ہے سوائے اس کے کہ ہم میں اور ان میں خون عثمانؓ کی بابت اختلاف ہوا اور ہم اس سے بری ہیں....''

ان شیعۂ علی اور شیعۂ عثمان کے علاوہ امت کا سواد اعظم تھا اور صحابہ کرام کا جم غفیر،ان کا موقف تھا کہ حضرت علیؓ کی بیعت کی تکمیل ہو جانی چاہیے۔لیکن خونِ عثمانؓ کا قصاص بھی سب سے زیادہ مقدم ہے۔البتہ یہ ضروری ہے کہ ان دونوں مسئلوں کو جنگ کے بغیر باہمی گفت وشنید سے طے کیا جائے۔ان حضرات کی کوشش تھی کہ ان کی طرح تمام امت کو جنگوں میں فریق بننے سے گریز کرنا چاہیے۔تاکہ پُرامن ماحول میں تصفیہ کرلیا جائے،اس سواد اعظم کے نزدیک یہی وہ فتنہ ہے جس سے حضور اکرم ﷺ نے ڈرایا ہے۔عشرہ مبشرہ میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت سعید بن زیدؓ،حضرت اسامہ بن زیدؓ بن حارثہ،حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ،حضرت عبداللہ بن عمرؓ،حضرت عمران بن حصینؓ،حضرت ابومسعودؓ،حضرت سلمہ بن الاکوعؓ وغیرہم تھے۔امت کے ان عظیم رہنماؤں نے جس طرح لوگوں کو ان جنگوں سے محترز رہنے کی تلقین کی،اس کی تفصیلات صحاح میں موجود ہیں،جنھیں نقل کرنا موجب طوالت ہوگا۔مختصراً شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے تبصرے پر یہاں اکتفا کیا جاتا ہے۔(منہاج السنۃ،ج۲،ص۲۱۹۔۲۲۰)

وكان ترك القتال خيراً للطائفتين مع ان عليا كان اولىٰ بالحق هذا قول احمد واكثر اهل الحديث واكثر ائمة الفقهاء وهو قول اكابر الصحابة والتابعين لهم باحسان وهوقول عمران بن حصين رضى الله عنه وكان ينهى عن بيع السلاح فى ذلك القتال و يقول هو بيع السلاح فى الفتنة وهو قول اسامة بن زيد ومحمد بن مسلمة و ابن

عمر وسعد بن ابی وقاص واکثر من بقی من السابقین الاولین من المهاجرین و الا نصار رضی الله عنهم ولهذا کان مذهب اهل السنة الا مساک عما شجر بین الصحابة فانه قدثبت فضائلهم ووجبت موالاتهم ومحبتهم.

[دونوں فریقوں کے لیے بہتر تھا کہ نہ لڑیں اگر چہ حق حضرت علیؓ کے زیادہ قریب تھا۔ یہ قول ہے امام احمد کا۔ اکثر اہل حدیث کا اور فقہا کے اکثر ائمہ کا اور یہی قول ہے اکابر صحابہ کا، اور خوبی کے ساتھ ان کا اتباع کرنے والوں کا اور یہی قول ہے عمران بن حصینؓ کا وہ ان جنگوں میں ہتھیاروں کی خرید وفروخت سے روکتے تھے اور فرماتے تھے کہ ہتھیاروں کا یہ کاروبار موجب فتنہ ہے، اور یہی قول ہے اسامہ بن زید کا، محمد بن مسلمہؓ کا ابن عمرؓ کا، سعد بن ابی وقاصؓ اور اکثر ان حضرات کا جو مہاجرین وانصار کے اوّلین طبقے کے اس وقت موجود تھے اسی لیے اہل السنۃ کا مذہب ہے کہ صحابہ کے اختلاف کے ذکر پر اپنی زبان روکیں، کیونکہ ان کے فضائل ثابت ہیں۔ اور ان سے تعلق خاطر رکھنا اور محبت رکھنا امت پر واجب ہے۔]

صفین کا معرکہ جنگ بندی اور ثالثی پر منتج ہوا اور یوں فریقین خوں ریزی سے کنارہ کش ہوگئے۔ ثالثوں نے فیصلہ وہی کیا جو غیر جانب دار اور جنگوں سے محترز رہنے والے حضرات چاہتے تھے۔ یعنی پُر امن ماحول میں صرف اصحاب رسول اللہ ﷺ کے شوریٰ سے حضرت عثمانؓ کے قصاص اور حضرت علیؓ کی خلافت کی آئینی حیثیت کا تصفیہ کیا جائے ابھی آخری اجتماع نہیں ہوا تھا کہ حضرت علیؓ کو ایک خارجی نے شہید کر دیا اور حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ سے صلح کر کے بیعت کر لی۔ (صحیح البخاری، کتاب الصلح) پھر تمام صحابہ اور جمہور امت نے حضرت معاویہؓ کی خلافت پر اجماع کر لیا۔ اہل حق کے باہمی نزاع کا جب ایک فریق نہ رہا تو یہ قدرتی بات تھی کہ زمام امّت فریق ثانی کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ سب امت جیسے پہلے ایک تھی پھر ایک ہوگئی اور پرانی باتیں سب بھلا کر اسی ارتقاء کی راہ پر رواں دواں ہوگئی جو شروع سے اس کا طریقہ کار تھا۔

لیکن ایک گروہ ابھی موجود تھا جسے وحدت امت گوارا نہ تھی اور جس نے یہ سب فتنے اٹھائے تھے۔ ۳۲ صحابہ کرام اور بنی ہاشم (آل بیت نبوی) کے طریقے اور عمل کے خلاف اس گروہ نے اپنا جتھا زیر زمین برقرار رکھا اور پھر عقائد و اعمال کے اعتبار سے ایک مستقل فرقہ بن گیا اور اپنا نام شیعہ علی باقی رکھا، اسی گروہ میں سے خوارج پیدا ہوئے تھے اور اسی گروہ کی پھر ذیلی شاخیں بنیں جو سب ایک دوسرے کی مکذب ہیں اور اپنے علاوہ دوسرے کو گم راہ، غلط رو اور باطل پرست کہتے ہیں۔

جو شیعہ علیؓ اور شیعہ عثمان ایک ہو گئے تھے اور اپنے یہ امتیازی نام چھوڑ دیئے تھے وہ اور جو گروہ عظیم غیر جانب دار تھا، انھوں نے باہم ربط مستحکم کر کے فرقوں کے مقابلوں میں اپنے آپ کو اہل سنت والجماعت کہا اور یہی امت کا سواد اعظم ہے۔ اسی نے حضرت معاویہؓ کی بیعت کے سال کا نام 'عام الجماعت' رکھا کیونکہ صحیح العقیدہ تمام امت ایک مرکز کے تحت منظم ہو گئی تھی۔ یہی سواد اعظم ہے۔ جو شروع سے آج تک سواد اعظم ہی چلا آ رہا ہے، وحدت امت کا داعی ہے اور دعوت محمدیہ کا واحد علمبردار۔ مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ غیر مسلموں میں بھی امت کے اسی سواد اعظم کو حضور اکرم ﷺ کی دعوت کا نمائندہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہی مذہب حضرت علیؓ اور آپ کی صحیح النسب اولاد کا ہمیشہ رہا۔ ان میں سے بعض نے اپنی حکومت حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی لیکن عقائد و اعمال اسلامیہ پر سب متفق رہے۔ ان میں سے کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ نبی ﷺ کی خلافت کا شرعی حق حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کا ہے اور نہ کسی نے اپنے آپ کو معصوم کہا اور حجۃ اللہ جانا ان کا جم غفیر جو عملی سیاست سے کنارہ کش رہا مثلاً حضرت علی بن الحسین (زین العابدین) ان کے فرزند محمد (الباقر) اور ان کے فرزند جعفر (صادق) یا دوسرے حسنی اور حسینی حضرات سب کے سب اپنے اپنے وقت کے خلفاء کی بیعت پر مستقیم رہے۔ اس نظام خلافت کو صحیح اسلامی نظام سمجھا اور کوئی کام ایسا نہ کیا جو سیاسی اختلال کا سبب بنے۔

ان میں زیدیہ کے نام سے ایک فرقہ البتہ بنا، ان کے اخلاف نے اپنی حکومت قائم بھی کی، لیکن ان کے ہاں یہ امر عقائد میں ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت کی کوئی شرعی دلیل نہ تھی

اور خلفاء کرام کی خلافت حق تھی البتہ یہ انھوں نے ضرور کہا کہ نبی ﷺ سے رشتے کے سبب ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ خلافت پر فائز ہوں۔اور یہ بات ایسی ہی ہے جیسے مختلف خاندانوں کے لوگ اپنی اپنی حکومت قائم کرنے کی تدبیریں کیا کرتے ہیں۔حصول حکومت کو شرعی حیثیت سے عقیدہ بنانا یا کسی خاص شخص کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق خلیفہ مقرر ہونے کا تصور نہ زیدیہ کا تھا اور نہ کسی دوسرے علوی یا ہاشمی کا۔

ہاشمیوں کی سیاسی اور عمرانی واحد تحریک دعوت عباسیہ تھی لیکن اس دعوت کی بنا پوری طرح سیاسی اور عمرانی رکھی گئی۔اس دعوت میں جو دنیا کی کامیاب ترین عوامی تحریکوں میں سے ہے اس تصور کا سہارا نہ لیا گیا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمان الٰہی کے تحت آلِ عباسؓ کو خلافت کا مستحق قرار دیا تھا۔اور اس دینی بنیاد پر وہ کھڑے ہوئے ہیں، خاندانی شرف اور افضلیت کا بے شک ذکر ہوا۔مگر سبائیہ کے مقابلے میں جو حضرت علیؓ کو حضور اکرم ﷺ کا وارث اور جانشین کہتے تھے اور اسے فرمان الٰہی بتاتے تھے۔ان کے مقابلے میں کہا گیا کہ چچا کی موجودگی میں چچا کا بیٹا کیسے وارث ہوسکتا ہے۔لیکن عوام کے سامنے جو اصول بتایا گیا وہ یہ تھا کہ خلافت اسلامیہ میں عربوں اور غیر عربوں سب کی نمایندگی ہونی چاہیے۔امیر المومنین ہارون الرشید نے جو اپنے وقت کے سردار بنی ہاشم اور نمایندہ اہل اسلام تھے انھوں نے شاہ روم کو جو نصرانی دین کا نمایندہ تھا ایک مبسوط تبلیغی مراسلہ بھیجا،اس میں منقولی اور معقولی دلائل کے علاوہ حضور اکرم ﷺ کی منافع دینوی سے بے نیازی کے ثبوت میں بتایا گیا ہے کہ آپ نے اپنے خاندان کے سیاسی تفوق کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی حالانکہ کرتے تو اس کی پذیرائی کی جاتی فرماتے ہیں: (عصر المامون، طبع ۱۹۲۷ء، دار الکتب مصریہ، طبع ثانی رسالہ ابی الربیع محمد بن ثابت)

لعمر الله لو اراد الملک لاقاربه و اراد طلب السطان لذوی رحمة لوکد لهم عقداً لا یحل ولا یبرم لهم امرالا ینقض ولاثل لهم فے عنفوان امره ملکالایخرج من ایدیهم ولایبرح ابدًا فیهم.

[بخدا اگر وہ (حضور ﷺ) اپنے رشتہ داروں کی حکومت چاہتے اور عزیزوں کی

حکومت کے خواہش مند ہوتے تو تاکید کے ساتھ عہد کو ایسا پختہ کر دیتے کہ اسے
توڑا نہ جاسکتا اور بات کو ایسی مضبوط کر دیتے کہ ٹالی نہ جاسکتی اور ابتدائے تحریک
ہی میں ان کی حکومت کی جڑیں ایسی گہری کر جاتے کہ وہ ان کے ہاتھ سے نہ نکلتی
اور ہمیشہ انھی میں رہتی۔]

کیا یہ پیمان اس بارے میں شافی نہیں کہ بنو ہاشم اپنی حکومت کو اللہ تعالیٰ کے شرعی فرمان کے تحت نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس انسانی کوششوں پر مبنی رکھا اور اسی اعتبار سے کامیابی یا ناکامی ہوئی۔ جس کی کوشش تعمیری انداز میں رائے عامہ کو اپنے حق میں استوار کرنے پر مذکور رہے اسے کامرانی نصیب ہوئی اور جو صحیح بنیاد پر کھڑے نہ ہوئے نسبی تعلّیوں ہی پر جن کے پروپگینڈے کا دارومدار رہا وہ ناکام رہے۔

چنانچہ محمد الارقط بن عبداللہ حسنی اور ان کے بھائی ابراہیم یا ایسے ہی دوسرے وہ علوی جو وقتاً فوقتاً خلفائے اسلام کے خلاف بغاوتیں اور خروج کرتے رہے، ان سب کی کوششیں انسانی اور سیاسی تھیں حکم الٰہی اور فرمانِ نبوی کا سہارا کسی نے نہیں لیا۔ اور نہ اپنے آپ کو معصوم کہا ان میں سے بعض نے جو مظالم ڈھائے اور اخلاقی جرائم کا ارتکاب کیا، یا امت سے علانیہ غداری کی تو اس پر معصومیت کا پردہ کسی نے نہ ڈالا۔

زیدیہ کے ایک بہت بڑے عالم محمد بن الحسن دیلمی نے اپنی کتاب قواعد عقائد ال محمد لکھی، اس میں اسماعلیہ اور اثنا عشریہ کے مذہب کا بطلان، انسانوں کے بارے میں ان کا مہلک غلو اور حضرات صحابہ کرامؓ کو راہ حق سے ہٹا ہوا سمجھنا بیان کر کے بتایا ہے کہ زیدیہ کے نزدیک یہ کفر محض ہے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب کی ابتدا ان کلمات سے کرتے ہیں۔ (مطبعۃ السعادۃ مصر، ۱۹۵۰ء) یہ کتاب امام یحییٰ حمید الدین کے ہاں مخطوطے کی صورت میں تھی۔ اب اسے شائع کیا گیا ہے)

بسم اللہ الرحمن الرحیم. قبل الا شتغال ببیان مذھب الباطنیۃ نذکر
طرفامن مذھب الغلاۃ والمفوضۃ لانھم منھم ایضاً. وذلک لان

اصول مذهب الغلاة والمفوضة و الباطنية من الاسماعيلية والا مامية الا ثنا عشرية مختلط بعضها ببعض فى كثير من المسائل ولذلک قيل الامامية دهليزا الباطنية لان الكل دخلوا فى الشيعه من جهتهم و كلهم يدعون التشيع ويغلون فى الدين ويخر جون من طريق المسلمين.

[باطنیوں کا بیان کرنے سے پہلے ہم غالیوں اور مفوضوں کی بعض باتیں بیان کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ بھی انھی میں ہیں، وجہ یہ ہے کہ غالی ہوں یا مفوض، اسماعیلی باطنی ہوں یا اثنا عشری امامی، ان سب کے مذہبی اصول بہت سے مسائل میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اسی لیے کہا گیا ہے کہ امامیہ کا مذہب باطنی مذہب کی دہلیز ہے۔ انھی کے ذریعے لوگ شیعیت میں داخل ہوتے ہیں اور سب کے سب تشیع کے مدعی ہوکر دین میں غلو کرتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے طریقے سے نکل جاتے ہیں۔]

پھر آگے چل کر ص ۱۰۵ پر لکھتے ہیں:

منها انهم يكفرون الامة المسلمة باجمها ويسمونهم الامة المنكوسته اى عن رشدها ويسمون الأ ئمة والعلماء والفضلاء من لدن النبى صلى الله عليه وسلم الى يومنا الطواغيت والا صنام... فاول صنم من اصنام الطاغوتية ابوبكر ثم عمر ثم عثمان ومن كان مثلهم فى كل وقت وزمان...وهل هذا الاكفرصراح وشرک محض؟

[ایک وجہ یہ ہے کہ یہ تمام امت مسلمہ کو کافروں کی جماعت کہتے ہیں اور ان کا نام انھوں نے امت سرنگوں رکھا ہے یعنی راہ راست چھوڑ دینے والی امت۔ پھر یہ لوگ نبی ﷺ کے عہد سے آج تک کے تمام ائمہ، علماء اور فضلاء امت کو شیاطین

اور اصنام کہتے ہیں.... (ان کے نزدیک) شیطانی بتوں میں پہلے بت ابوبکر ہیں پھر عمر اور پھر عثمان انھی کی طرح کے دوسرے وہ سب حضرات جو کبھی اور کہیں پیدا ہوئے ہوں.... کیا یہ تصور صریح کفر اور شرک محض نہیں ہے؟]

مفوضہ[۴] اور غالیوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا:

ان اللہ تعالیٰ فوّض امر العالم الی الائمۃ الی علی والحسن و الحسین علیھم السلام وباقی الائمۃ من بعدھم وھم یخلقون و یرزقون ویمیتون و یحیون ویبعثون ویعاقبون ویثیبون.

[اللہ تعالیٰ نے کارجہاں ائمہ کے سپرد کر رکھا ہے یعنی حضرت علی حضرت حسن حضرت حسین علیہم السلام اور ان کے بعد آنے والے باقی اماموں کے۔ یہی لوگ پیدا کرتے ہیں، روزی دیتے ہیں مارتے ہیں جلاتے ہیں مرنے کے بعد اٹھاتے ہیں عذاب دیتے ہیں اور جزا دیتے ہیں۔]

امامیہ اثنا عشریہ اگرچہ اتنا تو نہیں کہتے مگر ان کے ہاں یہ عقیدہ عام ہے کہ جب حضرت علیؓ کو پکارا جاتا ہے تو وہ مدد کے لیے آتے ہیں۔ اسی لیے ''یاعلی'' کا نعرہ اور مصیبت کے وقت انھیں پکارنے کا طریقہ ان کے ہاں رائج ہے۔[۵] اور نادعلیاً ان کے مشہور ومقبول وظیفہ ہے۔ ساتھ ہی صحابہ کرام، امہات المومنین اور خلفائے اسلام پر لعنت ان کے ہاں عبادت کا درجہ رکھتی ہے شعبان کی پندرھویں شب آل ابی سفیان اور آل مروان رضی اللہ عنہم پر لعنت کرنے کے لیے ان کے ہاں خاص ہے اور اسے بڑا اثمر ور وظیفہ سمجھا جاتا ہے۔

صحیح النسب علویین کے بعض طبقوں میں شیعی تصّورات، خاندانی تعلّی، پیدائشی بزرگی اور اپنے بزرگوں کی جناب میں غلو کا رواج اس وقت پڑا جب مشرق میں مجوسی الاصل بویہی روافض اپنا سیاسی اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ صحابہ کرام پر لعن وطعن کا سلسلہ شروع ہوا۔ ماتم حسینؓ اور عید غدیر کا اہتمام سرکاری طور پر کیا گیا اور حضرت علیؓ اور ان کی اولاد سے غیر معتدل عقیدت کا اظہار کیا جانے لگا۔ تاریخ کی چھوٹی بڑی ہر معتبر کتاب سے ثابت ہے کہ ان

تمام بدعات وسیئات کی ابتدا امیر الامراء معز الدولۃ اوراس کے بویہی خاندان نے کی،اس سے پہلے مسلمانوں میں ایسا کوئی تصّور اورکوئی رواج نہ تھا۔چنانچہ علامہ خضری نے محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ میں الدولۃ العباسیہ کے تحت ص۳۸۳ پر کتب تاریخ کا خلاصہ اس طرح پیش کیا ہے:

لقد كان اهل بغداد قبل الدولة البوهية على مذهب اهل السنة والجماعته ويفضلون الشيخين ابى بكر وعمرو على سائرهم ولا يقدحون فى معاويةولا غير من سلف المسلمين.فلما جأت هذه الدولة وهى متشيعة غالية نما مذهب الشيعة ببغدادووجدله من قوة الحكومة انصارًا فقد كتب على مساجد بغداد ۳۵۱ ھ ماصورته' ''لعن الله معاوية بن ابى سفيان ولعن من غصب فاطمة فدكاً ومن منع ان يدفن الحسن عند قبرجده عليه السلام ومن نفى ابازر الغفارى ومن اخرج العباس عن الشورے'' والخليفة كان محكوماً لايقدر على المنع واما معز الدولة فيا مره كان ذلک فلما كان الليل حكه بعض الناس فاراد معز الدولة اعادته فاشار عليه وزيره ابومحمد المهلبّى بان يكتب مكانه ما.يجيئى ''لعن الله الظالمين لال رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا يذكر احدًافى اللعن الا معاوية''

[بویہی حکومت کے قیام سے پہلے اہلِ بغداد سب اہل سنت والجماعۃ کے مذہب پر تھے،حضرت ابوبکرؓ اورحضرت عمرؓ کو سب صحابہ سے افضل سمجھتے تھے اورحضرت معاویہؓ یا مسلمانوں کے دوسرے بزرگوں میں سے کسی پرطعن نہیں کرتے تھےلیکن جب یہ حکومت قائم ہوئی جوغالی شیعہ حکومت تھی توبغداد میں شیعہ کوفروغ ہوا۔اور حکومت کی پشت پناہی سے اسے قوت ملی۔چنانچہ۳۵۱ھ میں بغداد کی مسجدوں میں جوعبارت لکھی گئی اس کی صورت یہ تھی:'خداتعالیٰ معاویہ بن ابی سفیان کواپنی

رحمت سے دور کرے، اوراس پر بھی لعنت کرے جس نے فاطمہ سے فدک چھین لیا اور جس نے حسن کوان کے نانا علیہ السلام کے پاس دفن نہ ہونے دیا، اوراس پر جس نے ابوذر کوشہر بدر کیا اوراس پر جس نے عباس کوشوریٰ میں شامل نہیں کیا۔'

خلیفۂ وقت محکوم تھے اورانھیں اس سے روکنے کی قدرت نہ تھی یہ سب کام معزالدولہ کے حکم سے ہوا تھا۔جب رات ہوگئی بعض لوگوں نے یہ عبارت مٹا دی۔معزالدولہ نے چاہا کہ دوبارہ لکھوائے لیکن اس کے وزیر ابومحمد المہلّبی نے مشورہ دیا کہ اس کے بجائے حسب ذیل عبارت لکھوادے۔'خدا ان ظالموں پر لعنت کرے جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی اولاد پر ظلم کیا اوراس پر لعنت میں نام کسی کا نہ لے۔سوائے معاویہ کے۔']

یہ لعنت حضرت صدیق اکبرؓ پر تھی۔جن پر یہ افترا کیا گیا ہے کہ انھوں نے سیدہ فاطمہ کو فدک سے محروم کردیا۔پھر یہ لعنت حضرت مروانؓ پر ہے جن پر یہ بہتان رکھا گیا ہے کہ انھوں نے حضرت حسنؓ کو حضور اکرم ﷺ کے پاس دفن نہیں ہونے دیا۔حضرت ابوذرؓ کو شہر بدر کرنے کا جھوٹ حضرت عثمانؓ پر بولا گیا ہے،اور حضرت عباسؓ کو شوریٰ میں شامل نہ کرنے کا الزام حضرت فاروق اعظمؓ پر ہے۔

بویہی امیر الامراء کی حکومت خبیثہ کا جب خاتمہ ہوا تو خلفائے عباسیہ نے مستقل طور پر یہ عبارت لکھوادی۔مساجد بغداد کے منبروں پر۔

الا ان خیر الناس بعد رسول الله صلی الله علیه وسلم ابوبکر ثم عمر ثم عثمان ثم علی ثم معاویه خال المسلمین رضی الله عنهم اجمعین.

[یہ جان لو کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد انسانوں میں سب سے بہتر ابوبکر ہیں پھر عمر پھر عثمان پھر علی پھر معاویہ مسلمانوں کے ماموں اللہ ان سب سے راضی ہو۔]

قاضی ابوبکر ابن عربی نے چھٹی صدی ہجری میں بغداد کی مسجدوں میں یہ عبارت لکھی

ہوئی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ یہ رد عمل تھا بویہی زندقہ والحاد کا ورنہ مسجدوں میں ایسی عبارت لکھوانے کی کیا ضرورت تھی۔ اہل ایمان تو اپنے تمام بزرگوں کا یکساں احترام کرتے ہی چلے آرہے ہیں اور صحابہ کرام کے ساتھ جو عقیدت مسلمانوں کو ہے وہ دنیا میں دوسرے مذاہب کے لوگ اپنے اسلاف کے ساتھ کب رکھتے ہیں۔

یہی حال ان عبیدی ملاحدہ کا تھا جنھوں نے ادعائے فاطمیت کے ساتھ مصر میں حکومت قائم کی۔ان کے متعلق تمام علمائے تاریخ متفق ہیں کہ (تاریخ الخلفاء، ص۵، طبع مصر)

اکثرهم زنادقة خارجون عن الاسلام ومنهم من اظهر سب الانبياء ومنهم من اباح الخمر ومنهم من امربالسجود له والخير منهم رافضى خبيث لئيم يامر بسب الصحابة رضى الله عنهم.

قال القاضى ابوبكر الباقلانى كان المهدى عبيدالله باطنياً خبيثاً حريصاً علے ازالة ملة الاسلام اعدم العلماء والفقهاء ليتكمن من اغواء الخلق وجاء اولاد ه على اسلوبه اباحوا الخمر والفروج و اشاعوا الرفض وقال الذهبى كان القائم بن المهدى شرًّامن ابيه زنديقا معلونا اظهرسبّ الانبياء.وقال وكان العبيد يون على ملة الاسلام شرًّا من التتر.

وقال ابوالحسن القابسى ان الذين قتلهم عبيدالله و بنوه من العلماء والعبادا ربعة الاف رجل ليردوهم عن الترضى عن الصحابة فاختاروا الموت.

[ان میں اکثر زندیق ہیں اور اسلام سے خارج، ان میں سے بعض وہ ہیں جنھوں نے انبیائے علیہم السلام پر سب وشتم کیا بعض وہ ہیں جنھوں نے نشہ حلال کردیا، ان میں وہ بھی ہیں جس نے اپنے آپ کو سجدہ کروایا، اوران میں جو سب سے اچھا تھا۔ وہ رافضی تھا۔ خبیث تھا، مردود تھا، اور صحابہ پر لعنت کا حکم دیتا تھا۔

قاضی ابوبکر الباقلانی فرماتے ہیں مہدی عبیداللہ باطنی تھا خبیث تھا اور ملت اسلام کو مٹانے پر حریص تھا، اس نے علماء وفقہاء کو شہید کیا تا کہ مخلوق کو گمراہ کرنے کی طاقت اسے حاصل ہو جائے اور اس کی اولاد اسی کے طریقے پر چلی انھوں نے شراب نوشی اور زنا کاری حلال کر دی اور رفض کو فروغ دیا۔

امام ذہبی فرماتے ہیں قائم بن مہدی اپنے باپ سے بھی برا تھا، زندیق تھا ملعون تھا، انبیائے کرام علیہم السلام کو گالیاں دیتا تھا اور فرماتے ہیں، ملت اسلامیہ کے لیے عبیدی لوگ تاتاریوں سے بھی زیادہ برے تھے۔

ابوالحسن القابسی کہتے ہیں کہ عبیداللہ نے علماء اور صلحاء میں سے جن حضرات کو شہید کیا وہ چار ہزار تھے انھیں وہ صحابہ کے لیے دعا کرنے سے روکنا چاہتا تھا لیکن انھوں نے موت کو ترجیح دی۔]

سلطان غازی صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں اس دولت خبیثہ کا خاتمہ ہوا۔ حسن بن صباح اسی دعوت کا داعی تھا، بے شمار علماء وفضلاء وفقہاء کا خون اس کی گردن پر ہے۔

بویہیوں اور عبیدیوں میں اگر چہ سیاسی اور مذہبی چشمک تھی مگر جہاں تک دین اسلام کو تباہ اور ملت اسلامیہ پر مصائب توڑنے کا مسئلہ ہے تو یہ دونوں حکومتیں ایک دوسرے کی معاون تھیں یہ سب روائداد صفحات تاریخ پر ثبت ہے اور کسی تاویل کی اس بارے میں گنجائش نہیں۔

غرض یہ کہ چوتھی صدی سے پہلے آل علیؓ میں ان عقائد کا شائبہ بھی نہ تھا۔ جو عجمی سرزمین میں پیدا ہوئے۔ قدمائے آل علی کا ان عجمی تصورات سے بیزار اور بری ہونے کا عملی ثبوت یہ ہے کہ وہ آپس میں اپنے تعلقات مستحکم رکھتے تھے اور خلافت قائمہ یعنی اموی اور عباسی خلفاء کے ساتھ بھی ان کے روابط شریعت کے مطابق قائم تھے۔ لیکن ان کی طرف منسوب ہونے والے عجمی فرقوں نے انھیں آپس میں بانٹ رکھا ہے۔ ہر فرقے کی امامت کا سلسلہ الگ ہے اور سب کے سب اپنے اپنے ائمہ کو انھی صفات سے متصف سمجھتے ہیں جو شیعیت کے امتیازات ہیں، اور دوسرے سلسلے کو کاذب اور مدعی جانتے ہیں۔ اگر واقعی آل علی کو شیعی تصورات سے کچھ دلچسپی

ہوتی اوران کے ہاں امامت عرفی کا کوئی سلسلہ ہوتا تو ہر سلسلہ امامت کے لوگ ایک دوسرے کے حریف ہوتے اوران میں یگانگت نہ پائی جاتی۔شخصی اور انسانی حیثیت سے دوستی دشمنی یارقابت و یگانگت اور بات ہے مگر دینی اعتبار سے دومتضادنظریوں میں ہم آہنگی کا کوئی امکان نہیں۔مثلاً یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک سلسلے میں علی بن حسین (زین العابدین) امام معصوم ہیں اوران کا تقرر خدا کی طرف سے ہوا ہے اوردوسرے فرقے کے نزدیک یہی حیثیت ان کے چچا محمد بن علی بن ابی طالب (ابن الحنفیہ) کی ہے۔اسی طرح امامیہ اثناعشریہ کے ہاں خدا کی طرف سے امامت موسیٰ بن جعفر (الصادق) کوملی۔اوراسماعیلیہ کے نزدیک ان کے بڑے بھائی اسماعیل بن جعفر کو۔پھر اسی طرح ان کے اوربھی سلاسل ہیں جن میں سے کچھ ختم ہوگئے اور کچھ باقی ہیں۔خدا کی طرف سے تقرراگر ایک ہوا ہے تویقیناً دوسرے کا نہیں ہوا۔اسی لیے یہ ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہیں۔اگراسی تکفیر کا سلسلہ آل علی کے مابین بھی ہوتا تو نہ ان میں نہ باہمی تعظیم وتکریم ومودت ہوتی اور نہ رشتے داری یعنی ساراعلم الانساب انھی کے ہاتھوں غارت ہو چکا ہوتا۔

امامیہ اثناعشریہ کے ہاں بارھویں امام محمد بن حسن ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بارہ سوبرس سے غار میں چھپے بیٹھے ہیں اوران پرسلسلۂ امامت ختم ہوگیا لیکن اسماعیلیہ کے ہاں امامت جاری ہے اورموجودہ کریم آغاخاں ان کے ایک فرقے کے نزدیک امام عصر ہیں اوران تمام صفات سے موصوف جواہل تشیع کے سب فرقوں کے نزدیک امام میں ہوتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ یاامت مسلمہ کے دوسرے ائمہ کرام میں سے کسی کواس قسم کے تصورات سے کیا فائدہ ہوسکتا تھا اورامامت کا یہ تصور ان کے نزدیک کسی درجے میں کب درست سمجھا جاسکتا تھا۔جب کے سب کے ہاں کتاب اللہ،سنت رسول ﷺ اوراجماع صحابہ کرامؓ پرمدار کار ہے۔امام اعظم تو شیعی تصورات رکھنے والوں سے اتنے بیزار تھے کہ ان کی روایت قبول کرنے کے بھی روادار نہیں۔چنانچہ خطیب بغدادی نے الکفایہ فی علم الروایۃ میں اپنی سنت سے عبداللہ بن المبارک کے حوالے سے بیان کیا ہے: (ص ۱۲۶، مکتبہ السلفیہ،شیش محل لاہور)

سأل ابو عصمة اباحنيفة عمن تأمرني ان اسمع الاثار قال من كل

عـدل فی هواه الاآلشیعة.قال واصل مذهبم تضلیل اصحاب محمد رسول الله صلی الله علیه واٰله وسلم.

[ابوعصمۃ نے ابوحنیفہ سے دریافت کیا آپ مجھے کن لوگوں سے روایت لینے کا حکم فرماتے ہیں۔فرمایا:ہرمعتبر ثقہ شخص سے اگرچہ وہ عقائد میں جماعت سے ہٹاہواہو۔سوائے شیعہ کے،پھر فرمایا:ان کا(شیعہ کا)اصل عقیدہ یہ ہے کہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوگم راہ ثابت کریں۔]

پھر یہی خطیب ص۱۲۵۔۱۲۶پر فرماتے ہیں:

قـداسـلـفنا الحکایة عن ابی عبدالله الشافعی فی جواز قبول شهادة اهـل الاهـواء غیر صنف من الرافضة خاصة ویحکی ذلک عن ابی حنیفه امام اصحاب الرای وابی یوسف القاضی.

[ہم نے پہلے ابوعبداللہ الشافعی (الامام) کی یہ بات بیان کی ہے کہ ہواپرست لوگوں کی روایت قبول کی جاسکتی ہےسوائے رافضیوں کے خاص طبقے کی یہی بات امام اصحاب الرای ابوحنیفہ سےنقل کی گئی ہےاورقاضی ابویوسف سے۔]

امام اعظم کی پہلی ملاقات جب حضرت عطاء بن ابی رباح سے ہوئی اورطلب علم کے لیے آپ نے ان کی خدمت میں رہنا چاہا،تواس کا حال ابن بطال نے شرح بخاری میں اس طرح لکھا ہے:(تفسیر المنارج،۸،ص۲۱۵،طبع مصر)

عـن ابـی حـنیـفته انه قال لقیت عطاء بن ابی رباح بمکة فسألته عن شـئ "فـقـال من این انت؟"قلت"من اهل الکوفة"قال"انت من اهل الـقریة الذی فرقوادینهم وکانو شیعا؟"فلقت"نعم"قال" من الیّ الا صـنـاف انـت؟"قـلـت"ممّن لایسبُّ السلف ویؤ من بالقدرولایکفر احداً بذنب".فقال عطاء عرفت فالزم."

[ابوحنیفہ سےمروی ہے وہ فرماتے ہیں میں نے مکے میں عطاء بن ابی رباح سے

ملاقات کی اوران سے کچھ سوال کیے انھوں نے پوچھا ''تم کہاں کے ہو'' میں نے عرض کیا ''کوفے کا'' فرمایا ''تم اس بستی کے ہو جہاں کے لوگوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور گروہ گروہ بن گئے؟'' میں نے کہا ''جی ہاں'' فرمایا ''ان میں سے کس گروہ سے تمھارا تعلق ہے؟'' میں نے عرض کیا ''ان سے جو بزرگان سلف کی جناب میں بے ادبی نہیں کرتے، تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں اور گناہ کے سبب کسی کو کافر نہیں کہتے'' فرمایا ''تمھیں دین کا عرفان ہے، اسی پر جمے رہو۔]

یہاں سے معلوم ہوا کہ اپنے مشائخ کرام کے طریقے پر امام صاحب کا شروع سے یہ مذہب تھا کہ سب صحابہ کرام کی تعظیم کریں، ان کے اختلافات میں فریق نہ بنیں، تقدیر پر ایمان رکھیں اور معاصی پر کسی کی تکفیر نہ کریں۔ یعنی نہ رافضی ہوں اور نہ منکرین قدر ہوں اور نہ خوارج۔ بلکہ پوری طرح جماعت سے وابستہ رہیں اور سنت کا اتباع کریں۔ یہی امت کے سواد اعظم کا مسلک ہے اور اسی سواد اعظم کے عظیم ترین ائمہ میں امام ابوحنیفہ ہیں۔ ان کی اس سے بڑی کوئی ہتک نہیں ہوسکتی کہ انھیں کسی فرقے سے منسوب کیا جائے یا خلفائے اسلام سے بے تعلق بتایا جائے۔ یا جمل وصفین جیسے سیاسی جھگڑوں میں کسی کو اچھا یا برا کہنے والا سمجھا جائے یا ان کی ہمدردیاں ایسے لوگوں کے ساتھ بتائی جائیں جنھوں نے امت کا کلمہ متفرق کرنا چاہا۔ اور اپنے عہد کے متفق علیہ خلیفہ کے خلاف بغاوت کی۔ امام اعظم کے سامنے ان کے شیخ اکبر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا عمل تھا۔ جو جمل وصفین کے معاملات میں غیر جانب دار رہے اور افتراق امت کو پسند نہ کیا۔ اسی لیے انھوں نے حضرت علیؓ سے بیعت نہیں کی، کیونکہ جماعت المسلمین اور امت کے سواد اعظم نے ان کی خلافت پر اجماع نہیں کیا تھا۔ اور اسی طرح انھوں نے ابن الزبیرؓ سے بھی بیعت نہیں کی لیکن امیر المومنین معاویہؓ اور امیر المومنین یزید، امیرا لمومنین عبدالملک اور امیر المومنین الولید سے بیعت کی۔ اپنے تابعی شاگرد امیر المومنین عبدالملک سے آپ نے بیعت جن الفاظ میں تحریر کے ذریعے کی وہ موطأ امام مالک اور صحیح بخاری میں مذکور ہے۔ (صحیح بخاری، ج ۴، ص ۲۴۵، باب کیف یبایع الامام الناس)

الی عبداللہ عبدالملک امیر المومنین انی اقرابالسمع الطاعۃ لعبد اللہ عبدالملک امیرالمومنین علی سنۃ اللہ وسنۃ رسولہ فیما استطعت وان بنی قداقربذلک.

[بجناب بندۂ خدا عبدالملک امیرالمومنین میں اللہ کی مقررکردہ سنت اوراس کے رسول کی سنت پر اللہ کے بندے عبدالملک اورامیرالمومنین کا فرمان سننے اوراسے حتی المقدور بجالانے کا اقرار کرتا ہوں ایسا ہی اقرار میرے فرزندوں نے بھی کیا ہے۔]

پھر امام ابوحنیفہ کے سامنے اپنے دوسرے شیخ اعظم حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بھی یہ عمل تھا کہ وہ اگرچہ حضرت علیؓ کے ساتھ تھے ہرطرح ان کی مدد کی مگر انھوں نے بیعت سے لے کر صفین کے معرکے تک بار بار انھیں روکنے کی کوشش کی اوران اقدامات کے خطرات سے آگاہ کیا۔اوراس ٹولی سے محترز رہنے کی تلقین کی جس نے امت میں سارافساد کھڑا کیا تھا لیکن بوجہ چھوٹے بھائی ہونے کے ساتھ چھوڑنے کی جرأت نہ کی۔ورنہ حقیقی جذبات ان کے ہاں وہی تھے جوان کے سب سے بڑے بھائی حضرت عقیلؓ کے تھے۔اسی لیے انھوں نے حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت معاویہؓ کوخط بھیج دیا تھا کہ ہم اب اختلاف ختم کرکے آپ سے صلح اور بیعت کے لیے تیار ہیں۔عجب نہیں کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت حسنؓ کو جو صلح اور بیعت کی دعوت دی (صحیح بخاری ،کتاب الصلح)وہ حضرت عباسؓ کے اسی مراسلے کے سبب ہو۔حضرت حسنؓ اورحضرت معاویہؓ کے مابین حضرت ابن عباسؓ نے صلح نامہ مرتب کرکے بحیثیت گواہ اپنے دستخط کیے تھے۔[٦] پھر انھوں نے امیرالمومنین یزید کی ولایت عہد اور خلافت کی بیعت کی اوراس پر مستقیم رہے۔حرّہ کے ہنگامے سے بنو ہاشم کوالگ رکھا۔ابن الزبیرؓ سے بیعت نہیں کی اورآپ ہی کے فرمان پر بنو ہاشم سب کے سب امیرالمومنین عبدالملک کی بیعت میں داخل ہوگئے۔حضرت ابن عباسؓ کواموی خلافت کے قیام کا انتظار تھا۔اوروہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ امیرالمومنین عبدالملک کامیاب ہوجائیں گے جیسا کہ صحیح بخاری سے معلوم ہوتا ہے (ج ٣، کتاب التفسیر ، ص ١٣٦، باب قولہ ثانی اثنین اذ ہما فی الغار)حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ:

والـله ان وصلوني وصلوني من قريب وان ربوني ربني اكفاء كرام. فـاثـر التـويتات والا سامات والحميدات يريد ابطنامن بني اسدبني تـويـت وبـنـي اسامه وبني اسدان ابن ابي العاص برزيمشي القدمية يعني عبدالملك بن مروان وانه لوىٰ ذنبه يعني ابن الزبير.

[بخدا اگر (بنوامیہ) میرے ساتھ صلہ رحمی کریں تو یہ صلہ رحمی قریب ترین عزیزوں کی طرف سے ہوگی۔ اور اگر وہ میری پرورش کریں گے تو یہ پرورش ذی احترام ہم چشموں کی طرف سے ہوگی تو پھر میں تو تیات، اسامات اور حمیدت کو کیوں ترجیح دوں (آپ کی مراد بنوتویت، بنواسامہ اور بنواسد سے تھی) اور جو ابوالعاص کے فرزند ہیں یہ مردانہ وار بڑھ رہے ہیں یعنی عبدالملک بن مروانؒ اور جو صاحب ہیں انھوں نے اپنی دم سیکڑ رکھی ہے یعنی ابن الزبیرؓ۔]

لیکن یہ فتح آپ کی زندگی میں انھیں حاصل نہ ہوئی۔ اس لیے آپ نے اپنے فرزندوں کو اپنی وفات کے وقت وصیت کی تھی کہ سب شام چلے جائیں۔ اور ابن الزبیرؓ کی حکومت میں نہ رہیں۔ چنانچہ یہ حضرات چلے گئے۔ امام ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں: (فتح الباری، ج۸، ص۲۶۴) فـلحق علي بعبد الملك فكان اثر الناس عنده۔ [حضرت علی بن عبداللہ بن عباسؓ امیر المومنین عبدالملک کے پاس چلے گئے اور وہ آپ کے ہاں نہایت درجہ مقرب تھے] اسی طرح حضرت محمد بن علی بن ابی طالب (ابن الحنفیہ) نے امیر المومنین یزید سے دونوں بیعتیں کی تھیں۔ اہل مدینہ کی بغاوت میں شریک نہیں ہوئے۔ ابن الزبیرؓ سے بیعت نہیں کی اور التوابون اور مختار ثقفی نے خون حسینؓ کا بدلہ لینے کے بہانے جو تحریکیں چلائیں ان سے قطعاً بے تعلق رہے اور امیر المومنین عبدالملکؒ سے بیعت کی۔ آپ کے بیعت نامے سے ان تمام خرافات کی تکذیب ہو جاتی ہے جنھیں اس سلسلے میں تاریخ کو مسخ کرنے والوں نے اچھالا ہے۔ آپ کا بیعت نامہ یہ تھا:

بسـم الـلـه الـرحمن الرحيم لعبد الله عبدالملك امير المومنين من

محمد بن علی امابعد فانی لمارایت الامۃ قداختلفت اعتزلتھم و فلما افضی ھذا لامر الیک وبایعک الناس ورابت الناس قد اجتمعوا علیک کنت لرجل منھم ادخل فی صالح مادخلوا فیہ فقد بایعتک وبایعت الحجاج لک وبعثت الیک ببیعتی ونحن نحب ان تؤ مننا وتعطینا میثاقا علی الوفاء.

[بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، بندۂ خدا عبدالملک امیرالمومنین کی خدمت میں منجانب محمد بن علی۔امابعد میں نے جب یہ دیکھا کہ امت میں اختلاف پڑ گیا ہے تو ان سب سے الگ ہوکر بیٹھ گیا، پھر جب معاملہ آپ کے ہاتھ میں آیا لوگوں نے آپ سے بیعت کرلی اور میں نے دیکھا کہ سب نے آپ پر اجماع کرلیا تو میں نے بھی اپنے آپ کو انھی میں کا ایک فرد سمجھا اور جس نیک کام میں وہ شریک ہوگئے میں بھی شریک ہوتا ہوں میں نے آپ سے بیعت کرلی ہے یعنی آپ کی بیعت حجاج کے ہاتھ پر کرلی اور اپنا یہ بیعت نامہ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ہم کو محبوب ہے کہ آپ ہمیں امان دیں اور عہد پورا کرنے کا ہم سے وعدہ کریں۔]

امیرالمومنین عبدالملک نے اس بیعت نامے کے جواب میں لکھا:

انک عندنا محمود. انت اجت واقرب الینا رحمۃً من ابن الزبیر فلک العھد والمیثاق وذمۃ اللہ ورسولہ ان لا تھاج ولا احد من اصحابک بشیٔ تکرھہ. ارجع الی بلدک واذھب حیث شئت ولست ادع صلتک وعونک ماحییت. وکتب الی الحجاج یأمرہ بحسن جوارہ واکرامہ فرجع ابن الحنفیۃ الی المدینۃ و بھادارًا واقام بھا.

[آپ ہمارے نزدیک قابل ستائش ہیں ابن الزبیرؓ کے مقابلے میں نسبتاً ہم سے قریب تر ہیں اور ہمیں محبوب ہیں اللہ کے ساتھ ہمارا عہدو پیمان ہے اللہ کا ذمہ ہے

اوراس کے رسول کا ذمہ ہے آپ کواورآپ کے ساتھیوں کو ایسی کوئی بات نہیں پہنچائی جائے گی جوآپ کو ناگوار ہو۔آپ اپنے شہرکوواپس ہوجایئے اورجب جی چاہے جایئے۔میں زندگی بھرآپ کی مدارات اورآپ کی امداد سے دریغ نہیں کروں گا۔پھر(امیر) حجاج کوآپ نے ان کے ساتھ خوش معالگی اوراحترام کا حکم نامہ بھیجا۔چنانچہ جناب محمد بن علی (ابن الحنفیہ) مدینہ واپس ہوئے اور وہاں ایک گھر بنا کر مقیم ہوگئے۔]

امام ابو حنیفہ کوصحابہ کرام اوربنی ہاشم (آل بیت) کا طرزعمل معلوم تھا کہ اموی خلافت کے خلاف خروج کووہ ناجائز سمجھتے تھےاوران ہنگاموں سےانھوں نےکوئی دلچسپی نہیں لی جوابن الزبیرؓ کی حکومت قائم کرنے یا خون حسینؓ کا بدلہ لینے کے نام سے جاری کی گئیں بلکہ ان تحریکوں سے انھوں نے بیزاری ظاہر کی۔جمہور صحابہ اورآل بیت اوراپنے دونوں عظیم شیخوں کے اس عمل کی موجودگی میں ان کی ہمدردیاں ان لوگوں کے ساتھ کیسے ہوسکتی تھیں۔جنھوں نے خلافت قائمہ کے خلاف خروج کیا۔وہ حضرت ابن عمرؓ کے اس ارشاد کو کیسے فراموش کرسکتے تھے جوصحیح بخاری میں مذکور ہے: (ج ۲، کتاب الفتن)

وانی لاعلم غدرًا اعظم من ان نبایع رجلا علی بیع الله ورسوله ثم ننصب له القتال.

[مجھےاس سے بڑا کوئی غدر نظر نہیں آتا کہ ہم اول توایک شخص کے ہاتھ پرخدااور رسول کی بیعت کریں اور پھراس سےلڑنے کے لیے پراجمائیں۔]

امیرالمومنین یزید کے خلاف ابن الزبیرؓ کی حمایت میں اہل مدینہ نے جو بغاوت کی اورحرّہ کا افسوس ناک اور تباہ کن حادثہ پیش آیا اس کے متعلق البدایہ والنہایہ میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: (ج ۸، ص ۲۰۸)

واعتزل الناس علی ابن الحسین وكذلک عبدالله بن عمر بن الخطاب لم یخلعا یزید ولا من بیت ابن عمرو كذلک لم یخلع

یزیدًا احد من بنی عبدالمطلب.

[(حضرت) علی ابن الحسین (زین العابدین) ان لوگوں سے (یعنی باغیوں سے) الگ رہے اور اسی طرح (حضرت) عبداللہ ابن عمرؓ بن الخطاب بھی، ان دونوں نے (امیرالمومنین) یزید کی بیعت نہیں توڑی، اور نہ (حضرت) ابن عمرؓ کے گھرانے والوں نے، اسی طرح آل عبدالمطلب (یعنی بنو ہاشم) میں سے بھی کسی نے بیعت نہیں توڑی۔]

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں: (ص ۲۳۳)

وقد کان عبداللہ بن عمر بن الخطاب وجماعة اهل بيت النبوة ممن لم ينقص العهد ولا بايع احدابعد بيعة يزيد.

[(حضرت) عبداللہ بن عمرؓ بن الخطاب اور اہل بیت نبوت (یعنی بنی ہاشم) کے سب لوگ ان میں ہیں جنھوں نے عہد نہیں توڑا اور (امیرالمومنین) یزید سے بیعت کرنے کے بعد (ان کی زندگی میں) کسی سے بیعت نہیں کی (اور ان کے بعد حضرت ابن الزبیرؓ سے بھی بیعت نہیں کی۔]

امام ابوحنیفہ کے یہ دونوں شیخ جو اجلّہ صحابہ میں ہیں ان کا عمل ان کے سامنے تھا اور انھی کے نظریات کے تحت ان کی پرورش ہوئی تھی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ان میں شیعیت کی کوئی رمق آسکے۔ علاوہ ازیں تابعین عظام میں جو ان کے اساتذہ ہیں یعنی قاضی شریح (م ۸۸ھ) علقمہ (م ۶۲ھ) مسروق بن الاجدع (م ۶۴ھ) اور اسود بن زید (م ۹۵ھ) جو خاص حادثہ کربلا کے وقت کوفے میں موجود تھے۔ ان میں سے کسی نے جمہور صحابہ کرام کے موقف کے مطابق حضرت حسینؓ کے اقدام کی حمایت نہیں کی جب تک کہ خود حضرت حسینؓ نے کوفے پہنچنے سے پہلے ہی جب وہاں کے حالات معلوم کر لیے کہ عراق پوری طرح امیرالمومنین یزید کی بیعت پر مجتمع ہے اور سبائیوں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ سب جھوٹ تھا تو آپ نے اپنے موقف سے رجوع کا اعلان کر دیا اور امیرالمومنین یزید سے بیعت کرنے کے لیے کوفے کی راہ سے پلٹ کر

کربلا دمشق کی طرف چل پڑے۔لیکن آپ کے ساتھ جو ساٹھ سبائی تھے اور جو مکہ مکرمہ سے آپ کو سبز باغ دکھا کر اپنے ساتھ لائے تھے ان کے سبب حادثہ کربلا رونما ہوا۔اس حادثے کی ذمہ داری ہم عصر امت نے حکومت پر نہیں ڈالی یعنی نہ عمر بن سعد پر نہ امیر عبیداللہ پر چہ جائیکہ وہ امیر المومنین یزید کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے۔حتیٰ کہ ابن الزبیرؓ نے امیر المومنین کے خلاف جب بغاوت کروائی تو انھوں نے بھی ان کے معائب و مظالم میں خونِ حسینؓ کا نام نہیں لیا۔اور لیتے بھی کیسے جب انھیں صحیح صورت معلوم ہوتی تھی اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس بغاوت میں کوئی ہاشمی شریک نہیں ہو رہا۔کیونکہ حضرت حسین کے آخری موقف کی پذیرائی میں وہ حضرات جو حادثہ کربلا کے بعد زندہ بچے تھے انھوں نے دمشق جا کر امیر المومنین یزید سے بیعت کر کے حضرت حسینؓ کا منشا پورا کر دیا۔اسی لیے وہ سب حضرات اپنی بیعت پر مستقیم رہے اور ابن الزبیرؓ کی خاطر بیعت توڑنے پر تیار نہیں ہوئے۔

اسی طرح امام اعظم کے اساتذہ کرام جو عہد مرتضوی میں موجود تھے انھوں نے صفین کی جنگ میں حصّہ نہیں لیا اور غیر جانب دار رہے اسی طرح جو اساتذہ ان کے حادثہ کربلا کے وقت کوفے میں موجود تھے انھوں نے حضرت حسینؓ کا ساتھ نہ دیا۔اور ان کے خروج کو جائز نہ جانا۔وہ مسلمانوں کے ان دو بڑے گروہوں کے اختلاف میں فریق بننے کے لیے تیار نہ تھے۔ حضرت علقمہؒ البتہ جنگ صفین میں شریک ہوئے اور ایک ٹانگ سے معذور ہو گئے مگر پھر سیاست میں عملاً کبھی حصّہ نہیں لیا اور علمی مشاغل ہی سے سروکار رکھا۔اسی لیے امیر المومنین یزید کی بیعت توڑ کر حضرت حسینؓ کا ساتھ دینے سے بھی انھوں نے گریز کیا۔

ان حقائق تاریخیہ کی موجودگی میں وہ سب تصورات پادر ہوا ثابت ہوتے ہیں جو روایات واہیہ کے ذریعے امام ابوحنیفہ کو کسی درجے کی شیعیت سے متہم کرنے کے لیے وضع کیے گئے۔اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں اپنے مذہب کی تدوین میں خود امام صاحب کا عمل ۔ امیر المومنین ابوجعفر المنصور کا فرمان اور اس کا امام صاحب کی طرف سے جواب اوپر نقل کیا جا چکا ہے کہ آپ کے ہاں استخراج مسائل کا کیا طریقہ تھا اور یہ کہ قیاس کو حدیث پر آپ کے ہاں مقدم

نہیں رکھا جاتا۔ یہی بات خطیب بغدادی نے **تاریخ بغداد** میں امام صاحب کے طریقۂ اجتہاد کی خود ان کی زبانی اس طرح بیان کی ہے:

> ''اوّل میں مسئلہ کتاب اللہ سے لیتا ہوں۔ اس میں نہ ملے تو سنت رسول اللہ ﷺ دیکھتا ہوں۔ اگر دونوں میں نہ ملے تو پھر آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کے اقوال دیکھتا ہوں ان میں سے جس کا قول چاہتا ہوں۔ چھوڑ دیتا ہوں لیکن ان کے اقوال سے باہر نہیں جاتا۔ پھر بات اگر ابراہیم وشعبی پر آپڑے یا ابن سیریں، حسن بصری، عطاء، سعید بن المسیب پر اور ایسے ہی آپ نے دوسرے نام لیے تو پھر میں بھی اسی طرح اجتہاد کرتا ہوں جیسے ان حضرات نے کیا۔''

اب سوچنا چاہیے کہ جو شخص اصحاب رسول اللہ ﷺ کے اقوال سے باہر جانے کو تیار نہ ہو اور ان کے اجماع کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے بعد حجت شرعیہ جانے وہ ان کے کسی اجماعی فیصلے کو باطل کیسے کہہ سکتا ہے۔ اموی خلافت صحابۂ کرام کے اجماع سے قائم ہوئی تھی اور اس خلافت کے کارکنوں میں ہمیں صحابہ کرام کے اسمائے گرامی امیر المومنین ولید اوّل تک ملتے ہیں اور عباسی خلافت تو قائم ہی ہوئی تھی تمام امت کے اجماع سے۔ ایسی صورت میں نہ آپ اس خلافت کی حجیت پر شبہ کر سکتے تھے۔ نہ امیر المومنین ابو جعفر المنصور کی اطاعت سے منہ موڑ سکتے تھے اور نہ ان خلافتوں کے خلاف کھڑے ہونے والے کسی شخص کا نظری یا عملی حیثیت سے ساتھ دے سکتے تھے۔

ان مؤلفوں اور مصنفوں کو سبائی روایات اپنی کتابوں میں درج کرتے وقت غور کرنا چاہیے تھا کہ جس امام کا مذہب کتابی صورت میں خود اس کے اپنے شاگردوں کے ہاتھوں میں مدوّن ہے اور تین چوتھائی امت جس مذہب کی پابند ہے۔ اس امام کے بارے میں ایسی روایات کیسے قبول کی جا سکتی ہیں جو خود اس کے مذہب اس کے اساتذہ کے مذہب اور اس کے تلامذہ کے مذہب کے خلاف ہیں۔ یہ روایات اگر کسی درجے میں صحیح ہوتیں تو کیا مذہب حنفی کو خلفائے اسلام کے ہاں سرکاری حیثیت حاصل ہو سکتی تھی؟ اور یہ امر مسلّم ہے کہ خلافت عباسیہ

کا نظام قانون فقہ حنفی پر قائم تھا۔یہی وجہ ہے کہ مصر کے عبیدی ملاحدہ کی حکومت میں اہل السنتہ کے معاملات کے لیے شافعی اور مالکی قاضیوں کوتو مقرر کیا گیا۔کسی حنفی المذ ہب کو وہاں قاضی بنانے کی اجازت نہ تھی۔کیونکہ عبیدیوں کے نزدیک وہ خلافت عباسیہ کا مذہب تھا۔

اخذ روایت میں سختی

علمائے حدیث میں بعض حضرات کے ہاں اہل ہواو بدعت سے اخذ روایت میں نرمی ہے اور بعض کے ہاں سختی۔امام اعظم ان میں ہیں جن کے ہاں اس بارے میں سختی ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا اور خصوصیت کے ساتھ یہ سختی ان لوگوں کے حق میں زیادہ ہے جن میں تشیّع پایا جاتا ہو۔کیونکہ تشیّع سے آدمی جمل وصفین میں فریق بن جاتا ہے۔اور حادثہ کربلا کو غیر معمولی اہمیت دے کر جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی جناب میں سوئے ظن کا مرتکب ہوتا ہے۔کیونکہ کسی صحابی نے بھی حضرت حسینؓ کے خروج کی حمایت نہیں کی اور سب صحابہ نے جو ان سے ملے انھیں اس اقدام سے روکا۔جب تک کہ انھوں نے کوفہ پہنچ کر اپنے موقف سے رجوع کر کے امیر المومنین یزید سے بیعت پر آمادگی کا اعلان کرتے ہوئے کوفے کے راستے سے پلٹ کر براہِ کربلا دمشق جانے لگے تھے کہ ان کے ساتھ ۶۰ کوفیوں کی غداری سے یہ سانحہ پیش آ گیا۔

گویا تشیّع اپنے لوازمات کے ساتھ حضرت حسینؓ اور آپ کے فرزند ارجمند نیز دوسرے اعزّہ واقرباء کے مواقف کے خلاف ایک تحریک ہے۔اسے اوّل التوابون نے تین برس کی خاموشی کے بعد اختلال کے زمانے میں جاری کرنا چاہا اور پھر مختار ثقفی نے،اور نام لیا۔ خونِ حسینؓ کے انتقام کا۔لیکن نہ بنو ہاشم نے ان تحریکوں سے کوئی دلچسپی لی اور نہ صحابہ کرامؓ نے بلکہ سب ہم عصر امت نے ان کے قائدین کو گمراہ جانا اور کذاب کہا۔پھر تین سو برس تک اسلامی معاشرے میں اس حادثے کا ذکر نہ تھا۔سوائے اس دلی رنج اور صدمے کے جو ایسی قیمتی اور بے بہا جانیں ضائع ہونے پر ہر مومن محسوس کرتا ہے۔صرف اہل تشیّع کے ہاں ذکر ہوتا ہوگا۔جیسا کہ ابو مخنف کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے اور طبری وغیرہ نے اس کی خرافات نقل کر کے اپنی تاریخ

کے اوراق سیاہ کیے ہیں۔مگر یہ بات کتابوں کی حد تک رہی۔اسے اہمیت تو چوتھی صدی ہجری میں بویہی روافض نے دی جیسا کہ پچھلے اوراق میں مذکور ہوا۔اور صفحات دہر پر ثبت ہے۔

اسی لیے اہل تشیّع سے روایت لینے میں امام اعظم کی جو سختی ہے اس میں امام شافعی بھی شریک ہیں۔جیسا کہ الکفایہ کے حوالے سے بیان ہوا۔اب طبقات الشافعیۃ الکبری سے یہ سختی اور بھی نمایاں ہوجاتی ہے۔(ج ۲،ص ۲۵۱،طبع مصر)

قال الشافعی فی الرافضی یحضر الوقعة لایعطیٰ من الفئ شیئ لان اللہ تعالیٰ ذکر اٰیة الفئ ثم قال والذین جاؤ امن بعدھم فمن لم یقل بھا لا یستحق.

[اس رافضی کے بارے میں جو غنیمت اور فئی کی تقسیم کے وقت حاضر ہوا امام شافعی فرماتے ہیں کہ اسے اس میں حصہ نہ دیا جائے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آیۃ فی کے بعد فرمایا ہے: جو لوگ ان کے (یعنی مہاجرین وانصار کے بعد) آئے کہتے ہیں (خدایا ہماری بھی پردہ پوشی فرما اور ان بھائیوں کی بھی جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے گزر گئے اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کی طرف سے کدورت مت رہنے دے۔خدایا تو ہی ہے دلوں میں رافت ورحمت پیدا کرنے والا) تو جو شخص یہ نہ کہے اسے (فئے میں حصہ لینے کا) کوئی حق نہیں۔]

الکفایہ فی علم الروایہ میں ہے (ص ۱۳۱) کہ حضرت عبداللہ الاخرم حافظ حدیث سے پوچھا گیا کہ امام بخاری نے ابوالطفیل عامرؓ بن واثلہ کی کوئی روایت کیوں نہیں لی تو فرمایا **لانہ کان یفرط فی التشیع** (اس لیے کہ ان میں تشیع بہت زیادہ تھا) یہ عامر بن واثلہ صغار صحابہ میں ابن الزبیرؓ اور امیر المومنین مروانؒ اوّل کے طبقے میں ہیں۔صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔اور پھر کوفے میں رہ گئے تو ان میں تشیع آ گیا۔امام بخاری نے حضرت ابن الزبیرؓ اور حضرت مروانؒ کی روایات اور فتاویٰ صحیح میں درج کیے ہیں لیکن عامر بن واثلہ کی راویت لینے سے احتراز کیا حالانکہ ان کا تشیع محض نظری تھا اور وہ اس لیے تیار نہیں ہوئے کہ قواعد شرعیہ توڑ کر

متفق علیہ امام کی بیعت فسخ کر دیں، وہ حادثہ کربلا کے وقت کوفے میں موجود تھے اور خروج میں حضرت حسینؓ کا ساتھ نہیں دیا۔

مواقف اقربائے حسینؓ

حادثہ کربلا کے عینی شاہد علی بن الحسین (زین العابدین) ہیں نیز ان کے سگے بہنوئی اور ابن عم حسن بن الحسن اور دوسرے ابن عم زید بن الحسن اور تیسرے ابن عم عبید اللہ ابن العباس بن علی بن ابی طالب وغیرہ ہم۔ان کے علاوہ سیدہ زینب بنت علیؓ تھیں جنھیں حضرت حسینؓ کا اس سفر میں ساتھ دینے کے سبب ان کے شوہر حضرت عبد اللہ ابن جعفرؓ نے طلاق دے دی تھی یہ سب حضرات جب دمشق گئے اور امیر المومنین یزید سے بیعت کر کے حضرت حسینؓ کے آخری موقف کی تکمیل کر دی تو اس بیعت پر ہمیشہ قائم رہے، امیر المومنین کے خلاف کسی تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی ان کے ذمہ دار رہے اور ابن الزبیرؓ سے بیعت نہیں کی۔

امیر المومنین یزید حضرت عبد اللہ بن جعفرؓ کے داماد تھے یعنی ان کی دختر نیک اختر سیدہ ام محمد کے خاوند سیدہ زینب جو حادثہ کربلا کے سبب بہت ملول تھیں جب اس پیرانہ سالی میں کہ عمر باون برس تھی دمشق گئیں تو اپنے عظیم المرتبت داماد کے حسن سلوک اور باادب ملاطفت و مدارات سے اتنی متاثر ہوئیں کہ مدینے میں واپس ہونے کے بجائے وہیں رہ گئیں اور وہیں وفات پائی۔دمشق میں ان کا مزار مبارک زیارت گاہ خلائق ہے۔

لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ سیدہ زینبؓ کے دونو عمر بچے عون اور محمد کربلا میں شہید ہوئے۔اس سلسلے میں بہت دلدوز افسانے اور مرثیے پڑھے جاتے ہیں۔حالانکہ یہ عون اور محمد سیدہ زینبؓ کے دیور تھے ان میں عون الاکبر، حضرت علی کے سگے بھتیجے ہونے کے علاوہ آپ کے داماد بھی تھے، سیدہ ام کلثوم بنت علیؓ کے خاوند۔ان کی شہادت کے بعد سیدہ ام کلثوم کا نکاح ان کے ایک بھائی حضرت محمد جعفری کے ساتھ ہوا جنھوں نے حضرت حسینؓ کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ان کی وفات کے بعد وہ عبد اللہ بن جعفر کے نکاح میں آئیں۔کیونکہ وہ ان کی بڑی ہمشیرہ سیدہ

زینب کو طلاق دے چکے تھے۔سیدہ زینب کے ایک ہی فرزند تھے جناب علی جو الزینبی کہلاتے ہیں وہ اپنے والد ماجد کے حکم سے اپنی والدہ اور اپنے ماموں کا ساتھ دینے سے رکے رہے۔ کربلا کے سفر میں ساتھ نہ گئے۔

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ عون اور محمد کو حضرت عبداللہ بن جعفر کے بھائیوں اور حضرت حسینؓ کے چچا کے فرزندوں کی حیثیت سے نہیں رویا جاتا بلکہ کذباً وافتراًسیدہ زینب کے کم سن فرزند بتا کر رویا جاتا ہے۔گویا حضرت جعفر طیارؓ کے فرزند اس قابل نہیں کہ حضرت حسینؓ کے ساتھ شہید ہونے کے باوجود ان کا ماتم کیا جائے۔اسی طرح خود حضرت حسینؓ کے بھی دو بھائیوں کا نام کسی کی زبان پر نہیں آتا حالانکہ وہ بھی کربلا میں شہید تھے یعنی ابوبکر اور عثمان فرزندان حضرت علیؓ کا اس طرح تخریبی مقاصد کے تحت علم الانساب غارت کیا جاتا ہے۔

بعض لوگ شبہ کرتے ہیں کہ دمشق میں جن،سیدہ زینبؓ کا مزار ہے وہ بنتِ علی کہلاتی ہیں وہ ہیں تو بنتِ علی ہی مگر بنت الحسن بن الحسن بن علی بن ابی طالب کی حیثیت سے جو امیر المومنین الولید الاول کی زوجہ محترمہ تھیں اگر یہ ثابت ہو جائے تب بھی یہ اس کی دلیل ہے کہ حادثہ کربلا کا کوئی اثر آل علی نے ایسا نہیں لیا جو انھیں اموی سادات سے برگشتہ کردے بلکہ انھوں نے باہمی محبت ومودت برقرار رکھی۔کیا یہ اس کا قطعی ثبوت نہیں کہ بنو ہاشم نے حادثہ کربلا کی ذمہ داری امیر المومنین یزید اور ان کی حکومت پر نہیں ڈالی۔یہ حسن بن الحسن حادثہ کربلا میں موجود تھے۔جیسا کہ مذکور ہوا اور وہاں کی ایک ایک بات ان کی آنکھوں دیکھی تھی لیکن نہ تو یہ امیر المومنین یزید کے خلاف اہل مدینہ کی بغاوت میں شامل ہوئے جو ابن الزبیرؓ کے داعیوں نے بپا کی تھی نہ انھوں نے التوابون اور مختار ثقفی سے کوئی تعلق رکھا جو اپنے تخریبی مقاصد کے تحت یکے بعد دیگرے خون حسینؓ کا بدلہ لینے کھڑے ہوئے تھے۔اور نہ انھوں نے بعد میں ابن الزبیرؓ سے بیعت کی۔کیونکہ وہ مرکز خلافت دمشق کو جانتے تھے اور وہاں کے اربابِ حل وعقد نے ابن الزبیر کو باغی قرار دے دیا تھا پھر امیر المومنین عبدالملک کی بیعت میں داخل ہو گئے اور اپنی نور چشم کو ان کی فرزند ارجمند ولید اول کے حبالۂ عقد میں دے دیا جو بعد میں دعوت محمدیہ کے عظیم

ترین علمبردار اور امام محمد یہ کے یگانہ روزگار امام ثابت ہوئے۔

حضرت حسینؓ کی شہادت سے جن حضرات کے دلوں پر سب سے زیادہ چوٹ پڑی، ان کا طرز عمل تو یہ تھا کہ امیر المومنین یزید کو اپنا امام تسلیم کرنے کے علاوہ اپنا شفیق بزرگ جانتے تھے لیکن ان کی محبت کا دم بھرنے والوں نے امیر المومنین کے خلاف وہ طوفان مچا رکھا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو اہل السنۃ کہتے ہیں وہ بھی اکثر اس میں بہہ گئے۔اس صورت حال کی ذمہ داری ان مصنفوں پر ہے جنھوں نے وہی روایتیں اپنی کتابوں میں بھر دیں اور اہل تشیع کی روایات لینے سے احتراز نہ کیا۔پھر وہ مصنف ہیں جو تھے تو شیعی مگر کہتے تھے کہ اپنے آپ کو اہل السنن،اور اسی طرح انھوں نے کام کیا مثلاً محمد بن جریر طبری جو اپنی تفسیر اور تاریخ کے سبب بڑا مقام رکھتے ہیں۔اور بعد کے لوگوں نے ان کے علمی تبحر کے سبب علمائے اہل سنت میں سمجھ لیا۔حالانکہ ہم عصر مسلمانوں نے انھیں اس قابل نہیں سمجھا کہ مقابر مسلمین میں انھیں دفن کریں۔ وہ اپنے گھر میں مدفون ہوئے۔

اسی طرح ابوعبداللہ الحاکم نیشاپوری بڑے محدث تھے اور اکابر علماء وفقہاء سے انھوں نے فیض لیا لیکن تھے شیعی المشرب۔ان کی کتاب المستدرک اس پر شاہد ہے۔ایسی ایسی واہی روایات کو انھوں نے اپنے مقاصد کے تحت بخاری ومسلم کی شرط پر صحیح قرار دیا ہے جن کی کچھ اصل نہیں،ویسے ان کی کتاب معرفۃ علوم الحدیث بلند پایہ ہے اور طلبائے علم حدیث کے لیے مفید۔مگر اس میں انھوں نے یہ اہتمام کیا ہے کہ امیر المومنین معاویہؓ کا اسم گرامی نہ آنے پائے۔ان کا رفض خلفائے ثلاثہ کے بارے میں نہ تھا۔کیونکہ ان کے ساتھ انھوں نے بڑی عقیدت ظاہر کی ہے۔البتہ اموی خانوادے سے نفرت کے ذریعے انھوں نے اپنا کام چلایا ہے۔حالانکہ اس عہد کے مسلمان اہل السنن میں انھیں سمجھتے تھے جو حضرت معاویہؓ کے ساتھ بھی وہی عقیدت رکھیں جو خلفائے ثلاثہ کے ساتھ ہو۔چنانچہ محمد بن ابی طاہر ان کے بارے میں فرماتے ہیں۔(طبقات الشافعیۃ الکبریٰ،ج ۳،ص ۶۸،طبع مصر)

انہ کان شدید التعصب فی الباطن وکان یظھر التسنن فی التقدیم

والخلافة وكان مخرفاً غاليا عن معاوية واهل بيته يتظاهر به ولا يتغذر منه.

[وہ باطن میں شیعی تعصب رکھتے تھے اور ظاہر میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کو مقدم رکھتے تھے اور خلافت کی اسی ترتیب کے قائل تھے لیکن حضرت معاویہؓ اور ان کے گھرانے سے سخت روگرداں تھے، برملا اس کا اظہار کرتے اور اس پر انفعال محسوس نہ کرتے۔]

امام السبکی نے ان کی طرف سے بڑی صفائی پیش کی ہے مگر کامیاب نہیں ہو سکے۔ کیونکہ انھوں نے دلیل یہ قائم کی ہے کہ جن بزرگواروں سے الحاکم کو فیض ہے ان کا فیض یافتہ شخص رافضی نہیں ہوسکتا حالانکہ یہ دلیل کمزور ہے دیکھنا تو خود اس شخص کے عمل کا ہے کہ اپنے اساتذہ کے طریقے پر قائم رہا یا اس سے ہٹ گیا۔ ان کی کتابوں سے ان کا تشیع پوری طرح ظاہر ہے۔ المسعودی نے بھی اجلۂ واکابر سے تحصیل علم کی حتی کہ اموی علما سے بھی، مگر کٹر رافضی تھے۔ مروج الذھب اس پر گواہ ہے۔ اس میں اصحاب رسول ﷺ پر اس قدر جھوٹ بولے گئے ہیں کہ ان کا شمار نہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں (منہاج السنتہ، ج ۲، ص ۱۳۱) وفي تاريخ المسعودى من الاكاذيب مالا يحصيه الاالله تعالىٰ (مسعودی کی تاریخ میں اتنا جھوٹ ہے کہ اس کا شمار بس اللہ تعالیٰ ہی جانے) لیکن سیوطی جیسے لوگ جنھیں تحقیق سے کچھ مس نہ تھا محض حاطب اللیل تھے۔ انھوں نے اہل السنتہ میں ہونے کے باوجود تاریخ الخلفاء میں ایسی لغویات بھر دیں کہ بہت لوگ غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے۔

ان اکاذیب کے ذریعے وقائع تاریخی کی صورت مسخ کر دی گئی ہے اور اکابر امت کے بارے میں ایسی خرافات کو شہرت دی گئی ہے اور ایسے ایسے انداز میں ان اباطیل کو بیان کیا جاتا ہے کہ اہل السنن بھی ناواقفیت کے سبب غلط راہ پر پڑ جاتے ہیں۔ اس لیے امام اعظم ابوحنیفہ نے اہل تشیع کی روایات سے محترز رہنے کا حکم دیا ہے۔ اور اپنا مذہب یہ رکھا ہے کہ جمل وصفین کی طرح حادثہ کربلا کے بارے میں سکوت کیا جائے اور جن امور میں صحابہ کرام ملوث ہوں ان

میں فریق بننے سے گریز کیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہے۔اور وحدت امت اسی طرح قائم رہ سکتی ہے۔

دعوت عباسیہ اور آل عبد مناف ابو طالب

امیر المومنین سیدنا معاویہؓ نے صحیح بنیاد پر یہ اہتمام کیا تھا کہ خلافت اسلامیہ کو خالص عربی حکومت رکھیں تاکہ غیر عرب نومسلم حکومت میں داخل ہو کر دعوت محمدیہ کو مسخ نہ کر سکیں کیونکہ مجوسی، یہودی اور نصرانی لوگوں کو اپنی اپنی ثقافت پر بہت غرّہ تھا یہ بات بڑی خطرناک ہوتی اگر انھیں محض اسلام قبول کرنے کے سبب حکومت میں شریک کر لیا جاتا۔اسی حکمت عملی کا یہ نتیجہ نکلا کہ مملکت اسلامیہ مستحکم رہی اور دین مبین اپنی خالص شکل میں محفوظ رہا۔لیکن ساٹھ ستر برس کی مدت میں نومسلموں کے دلوں میں یہ جذبہ رہ رہ کر ابھرتا تھا کہ دوسرے درجے کے شہری ہونے کے بجائے انھیں بھی حاکمانہ اقتدار میسر آئے۔آخر عہد اموی میں یہ صورت حال شدت اختیار کر گئی اور وقت آ گیا تھا کہ اب حکمت عملی میں تبدیلی لائی جائے۔

قبیلہ قریش میں بنوامیہ کے بعد یہ درجہ بنوہاشم کا تھا کہ قیادت کے لیے آگے بڑھیں۔بنوہاشم میں سے آل علی کی سب تدبیریں پہلے ہی کئی بار ناکام ہو چکی تھیں اور جو گروہ اپنے آپ کو ان کا حمایتی کہتا تھا اس کا کردار ایسا رہا کہ علویہ کی جانیں تو ضائع ہوئیں مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔پھر ایک بات یہ تھی کہ آل علی کے سامنے سوائے حصول حکومت کے اور کوئی عمرانی منصوبہ نہ تھا۔ان کے تمام خروجوں میں کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ خلافت و حکومت پر وہ اگر فائز ہو جاتے تو ان کا لائحہ عمل کیا ہوتا۔ان میں جو بھی کھڑا ہوا اس نے صرف نسبی تعلّیوں کا سہارا لیا اور کوئی بات ایسی پیش نہ کی جس کے سبب لوگ اس کی حمایت پر کمر بستہ ہو سکیں۔علویہ کی حمایت میں یا ان کا قصاص لینے کے بہانے جو لوگ کھڑے ہوئے ان کا مطمح نظر صرف فساد تھا۔اسی لیے جمہور صحابہ و آل البیت نے انھیں ملّت کا دشمن قرار دیا۔

حضور اکرم ﷺ سے اقربیت کے دعوے سے کھڑے ہونے والے ایک طرف آل

عباسؓ تھے اور دوسری طرف حضرت علیؓ کی فاطمی اولاد آل علی کی ناکامیوں کے سبب آل عباس نے اپنی تحریک ان سے الگ رکھی حالات حاضرہ کے تحت اب ذمہ داری بھی انھی کی تھی کہ امت کی سربراہی اور دعوت محمدیہ کی حفاظت و آبیاری کا انداز ایسا رکھیں کہ وحدت امت پیدا ہو۔ یوں یہ عظیم الشان دعوت شروع کی گئی جس نے اسلام کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ کا دھارا موڑ دیا۔ اور وہ نظام بروئے کار آیا جسے چلانے کے لیے تمام کلمہ گو صدیوں تک برابر کے حصے دار بنے رہے۔ سب اہل تحقیق متفق ہیں کہ اس عجیب وغریب اور کامیاب ترین دعوت کا اجرا ۱۰۰ھ میں ہوا اور یہ زمانہ امیر المومنین عمر ثانی اموی کا تھا۔

حبر الامۃ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پوتے حضرت محمد الامام عباسی نے اپنے داعیوں کو حکم دے دیا تھا کہ حجاز اور عراق میں کام نہ کریں بلکہ ابتدا خراسان سے کی جائے۔ حجاز میں تحریک کی ضرورت نہ تھی اور عراق میں کام شروع کرنے کا مطلب ہوتا کہ چھوٹتے ہی دعوت کو تعمیری رکھنے کے بجائے تخریبی بنا دیا جائے۔ چنانچہ عباسی داعیوں نے شرق وغرب میں ہر زاویۂ نگاہ سے محنت کر کے رائے عامہ اپنے حق میں استوار کی۔ جو لوگ ہموار ہو جاتے ان سے بیعت لی جاتی تھی کہ امام کے ظہور پر ان کا ساتھ دیں گے۔ یعنی اس بات کا اہتمام تھا کہ خلیفۂ وقت کی بیعت توڑنے اور ان کی اطاعت سے منہ موڑنے کی ترغیب نہیں دی جاتی تھی۔ بیعت آئندہ کے لیے لی جاتی تھی اور اس طرح قواعد شرعیہ کا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ خراسان میں کام مکمل کرنے کے بعد سب سے آخر میں عراق پر توجہ کی گئی۔ امام اعظم اور امیر ہبیرہ کے عنوان کے تحت صورت حال بیان کی جا چکی ہے، اس وقت حال یہ تھا کہ چاروں طرف عرب قبائل خصوصاً مضری و یمنی عرب آپس میں ایسے دست و گریباں تھے جیسے ان کا کوئی سربراہ نہ ہو۔ ہر طرف شورش اور خون خرابہ تھا، ان فتنوں میں عباسی داعیوں نے کوئی حصّہ نہیں لیا۔ اور نہ انھوں نے خلافت قائمہ کے خلاف کوئی علانیہ حرکت کی۔ البتہ امت کی اس خانہ جنگی سے انھوں نے خوب فائدہ اٹھایا ہر جگہ اپنے ہمنوا پیدا کیے۔ اور سب پر ثابت کر دیا کہ اختلال کی یہ صورت اس وقت رفع ہوگی جب آل بیت نبوت میں سے بنوالعباس کے ہاتھ میں زمام کار آئے گی

کیونکہ ہمارے امام کی دعوت کی بنیاد ہی یہ ہے کہ خلافت اسلامیہ کو عربی رکھنے کے بجائے تمام مسلمانوں کو اس میں نمایندگی دے دی جائے اور ہر علاقے کے مسلمانوں کو اندرونی آزادی وخود مختاری حاصل ہو۔

اس حسن سے تعمیری انداز میں یہ تحریک چلائی گئی اور کامیابی سے ہم کنار ہوئی۔ صحیح ہے کہ داعیوں نے اپنے اپنے مقاصد کے تحت جوڑ توڑ سے بھی کام لیا۔ لیکن یہ انتشار کو ہوا دینے کے لیے نہ تھا بلکہ غرض یہ تھی کہ اسی انتشار کو وجہ اختلاف بنایا جائے۔ لوگوں نے پروپگینڈا کیا ہے کہ اہل خراسان کی فوجی طاقت کے ذریعے عباسیوں نے ملّت اسلامیہ پر اپنا تسلط قائم کیا اور بزور شمشیر حکومت پر قابض ہو گئے۔ گویا ان کے نزدیک خراسانی لوگ اتنے ہیبت ناک تھے اور ایسے ایسے تباہ کن آلات وحرب کے مالک کہ پورے عالم اسلام کو انھوں نے زیر کرلیا اور وہ بھی دوسری صدی کے مسلمانوں کو جن سے ہر بالغ شخص ہتھیار بند تھا اور ماہر حرب وضرب۔

اگر ان پر پگینڈا کرنے والوں میں تھوڑی سی بھی بے تعصبی ہوتی اور امت مسلمہ کی روح کا انھیں ادراک ہوتا، جو جبر کے سامنے آج بھی نہیں جھکتی، تو ایسی بات نہ کہتے عباسیوں کا تسلط اس لیے قائم ہوا کہ احوال حاقرہ سے امت نالاں تھی۔ اور چاہتی تھی کہ فتنہ وفساد رفع ہو کر یک جہتی آئے کیونکہ اموی حکمت عملی اب اپنی افادیت کھو چکی تھی۔ اور ہر جگہ کے لوگ حکومت میں برابر کا حصّہ چاہتے تھے۔ اس طرح انقلاب کے لیے فضا ہموار تھی اور قدرتی بات تھی کہ لوگوں کی نگاہیں نبی ﷺ کے گھرانے کی طرف اٹھیں۔ آل علیؑ کے عقیم اور بے نتیجہ اقدامات کے مقابلے میں صرف آل عباسؓ تھے جن کا پیغام تعمیری تھا اور جن کی تحریک میں آزادی اور مساوات کی بشارت تھی۔ چنانچہ ہر جگہ کے مسلمان ان کی طرف جھکتے چلے گئے اور انھی کو امت کا نجات دہندہ سمجھا۔

عباسی امام نے ظہور اس وقت فرمایا۔ جب فضا انقلاب کے لیے تیار ہو گئی، امت کا کوئی متفق علیہ امام نہ رہا اور خود اموی خاندان میں پھوٹ پڑ گئی۔ یوں تو زوال کے آثار امیر المومنین ہشام کی آنکھ بند ہوتے ہی نمودار ہو گئے تھے۔ ایسے ہی جیسے اورنگ زیب عالمگیر کی

وفات کے بعد ہندوستان میں ہوا۔لیکن غضب یہ ہوا کہ آخری متفق علیہ خلیفہ ولید ثانی کو ۱۲۶ھ میں افتراً وکذباً بدترین الزامات لگا کر شہید کردیا گیا اور یوں اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی چلا کر اس گھرانے نے طوائف الملوکی کی صورت پیدا کردی۔اس ہنگامے کے بعد جناب مروان ثانی نے خاندانی اختلال پر قابو پاکر معاملات سلجھانے کی کوشش کی تھی۔لیکن اپنی انسانی فضیلتوں مومنانہ خصلتوں اور قائدانہ صلاحیتوں کے باوجود وہ نہ ایسی مقبولیت حاصل کرسکے اور نہ اتنی مادی طاقت کا اختلال دور کرسکیں اور مرکزیت پیدا ہوجائے۔حالات ان کے قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ان کی بیعت ۱۲۷ھ میں ہوئی مگر اس سے پہلے ہی عباسی داعی میدان میں کھل کر سامنے آچکے تھے اور اسی سال خراسان میں عباسی امام کی بیعت کی تکمیل ہوچکی تھی۔اور جنگوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا یعنی مروان ثانی کی آئینی حیثیت انھیں تسلیم نہ تھی کیونکہ اس کا انعقاد عباسی امام کی بیعت کے بعد اور اختلافی ماحول میں کیا گیا تھا۔عالم یہ تھا کہ دمشق کے قرب وجوار کے علاوہ امویوں کا اقتدار جاتا رہا تھا اور کامیابی کے وسائل کم سے کم تر ہوتے چلے جارہے تھے۔

اس صورت حال سے پریشان ہوکر اور عباسی داعیوں کی روز افزوں کامیابیاں دیکھ کر امویوں کے ایک طرف دار علواں بن المقنی نے وہ مشہور اشعار مروان ثانی کو لکھ بھیجے جن سے اموی موقف کی کمزوری اور ان کی سیاسی زبوں حالی عیاں ہے۔ان کے اس مخلص کو اس صورت حال کا کوئی مداوا نظر نہیں آتا تھا۔سوائے اس کے کہ انجام کی پروا کیے بغیر مردوں کی طرح جان کی بازی لگادی جائے۔(طبقات الشافعیہ الکبریٰ،ج ۵،ص ۱۱۱،طبع مصر)اس منظوم خط میں وہ کہتے ہیں:

فقل لبنی امیة لیت شعری	ا ایقاظ امیة ام ینام
وقد ظهر الخراسانی معه	بنو العباس والجیش للهام
فان لم تجمعوا جیشا یضیق ال	عراق علیهم والشام
فلا قوهم کمالا فی علیاً	بصفین معاویة الهمام
وکان علیٰ قوی منه عزماً	واعلی رتبة وهو الامام

ولا یاخذکم حذر وخوف فما یغنی اذاحام الحمام

[بنوامیہ سے کہہ دو کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اموی خاندان جاگ رہا ہے یا محوخواب ہے۔خراسانی ظاہر ہوگیا ہے اوراس کی پشت پر بنوعباس ہیں اور عظیم الشان لشکر۔ اگر تم لوگ اتنا لشکر جمع نہ کرسکو جوعراق اور شام کی سرزمین ان پر تنگ کرسکے۔تو ان سے اسی طرح بھڑ جاؤ جیسے (وسائل کی کمی کے باوجود) عظیم المرتبت معاویہ (حضرت علیؓ) سے متصادم ہوگئے تھے۔حالانکہ (حضرت) علی اپنے عزائم میں ان سے زیادہ قوی تھے ان کا رتبہ بلند تھا اور وہ خلیفہ تھے۔اورتم پر ڈر اور خوف مستولی نہ ہو۔جب میدان کارزار گرم ہوجائے تو پھر پروا کاہے کی۔]

پھر کہتا ہے:

فمو توافی ظھور الخیل صبراً کماقدمات قبلکم الکرام

ولا تتدرعوا اتواب ذل وعارِقد تدرعھا اللئام

[تو گھوڑوں کی پیٹھوں پر اسی طرح استقلال سے جان دو جیسے تم سے پہلے غیرت مند لوگ جان دے چکے ہیں۔ذلت اور عار کا لبادہ مت اوڑھو۔کیونکہ یہ لبادہ تو پست فطرت دوہمت لوگ اوڑھا کرتے ہیں۔]

ان اشعار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اموی خلافت کے احوال دگرگوں ہوچکے تھے اوروقت آگیا تھا کہ انجام سے بے پرواہوکر وہ ذلّت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دیں اوران اشعار سے یہ بھی عیاں ہے کہ جس حزم وعزم کے ساتھ دعوت عباسیہ جاری کی گئی اوراسے قبولیت عام حاصل ہوئی اس کا انجام یہ ہونا تھا کہ فتح سے ہم کنار ہوں اوراموی خلافت کا تختہ الٹ جائے۔

جناب مروان ثانی نے ان اشعار کے جواب میں لکھا تھا: الحاضریریٰ مالا یری الغائب (جوحاضر ہووہ ان باتوں کو دیکھتا ہے جسے غائب نہیں دیکھ سکتا) یعنی تمھیں کیا معلوم میں کن مشکلوں میں پھنسا ہوا ہوں یعنی ایسے مایوس کن حالات سے دوچار تھے۔

واہی افتراء

دعوت عباسیہ کے سلسلے میں ایک خود ساختہ تصور کو اس طرح پھیلایا گیا ہے کہ عباسیوں کی تحریک بنوامیہ کے خلاف تھی۔ اور مقصد یہ تھا کہ ان علویوں کے خون کا بدلہ لیا جائے جو اموی عہد میں اپنے خروجوں کے سلسلے میں مقتول ہوئے تھے۔اسی لیے عباسیوں نے سیاہ ماتمی لباس اختیار کیا اور جھنڈا بھی اپنا سیاہ رکھا۔بعض افسانہ نگاروں نے یہاں تک کہہ دیا کہ دراصل یہ تحریک علویہ کی تھی اور ان کی ہمدردی میں عباسی لوگ اس میں شامل ہو گئے تھے۔لیکن جب کامیابی حاصل ہوگئی تو خلافت علویوں کے سپرد کرنے کے بجائے خود اس پر قابض ہو گئے۔ یہ تصور وہی ہے جو شکست خوردہ بے تدبیر نامقبول لوگوں کا ہوا کرتا ہے۔

عباسیوں کو علوی مقتولوں کا بدلہ لینے کی کیا ضرورت تھی جب کہ یہ خروج اور اقدامات ان کی رائے کے خلاف کیے گئے تھے اور قواعد دینیہ کے تحت ان کی کوئی گنجائش نہ تھی، پھر دیکھنا ہے کہ حضرت حسینؓ کے خون کا بدلہ لینے اوّل التوابون کھڑے ہوئے اور پھر مختار ثقفی۔لیکن بنو ہاشم نے ان دونوں فتنوں سے کوئی تعلق نہ رکھا بلکہ سخت بیزاری ظاہر کی۔بنو ہاشم تو اس زمانے میں بنوامیہ کی خلافت کے ایسے حامی تھے کہ انھوں نے ابن الزبیرؓ سے بھی بیعت نہیں کی اور منتظر رہے کہ امیر المومنین عبدالملک کامیاب ہوں تو ان سے بیعت کی جائے۔کیونکہ امت کا اختلال رفع کر کے مرکزیت پیدا کرنے کی قابلیت اسی یگانہ روزگار بطل جلیل میں تھی اور آئینی حیثیت سے موقف بھی انھی کا صحیح تھا۔کیونکہ خلافت میں ارباب حل وعقد کے عام اجتماع میں مروانی خلافت پر اجماع ہوا تھا۔ برخلاف اس کے ابن الزبیرؓ کا موقف کمزور تھا۔بنو ہاشم اور اکابر صحابہ ان کے ادعائے کے خلافت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔اس لیے کہ انھوں نے متفق علیہ امام امیر المومنین یزید سے بیعت نہیں کی تھی اور صحابہ کرام کی اجماعی فیصلے کی بے وقعتی کر کے اختلال پیدا کر رکھا تھا۔انھیں جو تھوڑی سی وقتی کامیابی نصیب ہوئی تو محض اس لیے کہ کھل کر اپنی خلافت کا اعلان انھوں نے امیر المومنین یزید کی وفات کے بعد کیا تھا،اسی لیے بعض صغار صحابہ ان کے

ساتھ ہو گئے تھے۔مگر ان کا زمانہ کہلاتا ہے ''فتنوں کا زمانہ'' صحاح میں جہاں کہیں اس دور کا ذکر ہے تو ''فتنہ ابن الزبیر'' ہی کی حیثیت سے ہے۔

صحیح بخاری میں ابن الزبیر اور امیر المومنین عبدالملک کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول موجود ہے۔جیسا کہ بیان ہوا (ج ۳، کتاب التفسیر، باب قولہ ثانی اثنین اذ ہمانی الغارص، ۱۳۶، طبع مصر)

ان ابن ابی العاص برز یمشی القدمیه یعنی عبدالملک بن مروان وانه لوی ذنبه یعنی ابن الزبیر.

[ابوالعاص کے فرزند مردانہ وار بڑھ رہے تھے یعنی عبدالملک بن مروان، اور یہ جو صاحب ہیں تو انھوں نے اپنی دم سکیڑ رکھی ہے یعنی ابن الزبیر اگر ابن الزبیر کو بنو ہاشم اور اکابر صحابہ کی حمایت حاصل ہوتی اور ان کی خلافت کی آئینی حیثیت تسلیم کر لی گئی ہوتی۔تو پھر اہل شام کی کامیابی کا امکان نہ تھا۔اور وہ باغی اور خارجی قرار پاتے۔]

رہا زید بن علی بن الحسین کا خروج تو اس کا بھی یہی حال تھا کہ ہاشمی گھرانے کے کسی ایک فرد نے بھی ان کا ساتھ نہیں دیا، بلکہ ہر طرح کوشش کی کہ سبائیوں کے بہکائے میں آ کر متفق علیہ امام کی بیعت توڑنے سے احتراز کریں پھر ان کا بدلنے لینے کا تصور عباسیوں کے ہاں کیوں پیدا ہوتا اور وہ اپنی عوامی تحریک کو خاندانی چپقلش بنا ڈالنے کی غلطی کیوں کرتے۔

عباسیوں کی تحریک خاندان بنوامیہ کے خلاف نہیں تھی بلکہ ان کے سیاسی نظام کے خلاف ایک عوامی تحریک تھی اور اس کا علویہ سے کچھ تعلق نہ تھا بلکہ یہ اہتمام رکھا گیا تھا کہ جو لوگ علویہ کے حمایتی کہلاتے تھے انھیں اس تحریک سے دور رکھا جائے۔یہ تحریک اس غرض سے چلائی گئی تھی کہ خلافت کو عربی رکھنے اور غیر عرب مسلمانوں کو اس سے دور رکھنے کے سبب عوام میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔امویوں کی جگہ اگر اس وقت کوئی اور خاندان ہوتا تب بھی یہ تحریک اسی طرح چلائی جاتی۔کیونکہ امت کے احوال ایک عظیم الشان انقلاب کے متقاضی تھے۔اور

ضروری ہوگیا تھا کہ عباسی امام کے حق میں رائے عامہ استوار کی جائے، اسباب فراہم کیے جائیں اور موزوں وقت پر اقدام کیا جائے کہ کامیابی متوقع ہو۔

سیاہ رنگ

عربوں میں نہ پہلے سیاہ رنگ کو ماتمی سمجھا جاتا تھا اور نہ آج سمجھا جاتا ہے۔ اس رنگ کا ماتمی ہونے کا تصور عجمی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے دو جھنڈے تھے۔ ایک سیاہ جو ظل کہلاتا تھا (سایہ) اور ایک سفید جسے سحاب کہتے تھے (بادل) اموی خلافت میں سفید رنگ اختیار کیا گیا اور عباسی خلافت میں سیاہ۔ اور یہ دونوں رنگ اتباع سنت میں اختیار کیے گئے تھے۔ سیاہ رنگ کو ترجیح دینے کا ایک تاریخی پس منظر ہے۔ آنحضرت ﷺ کی فاتحانہ شان کی تکمیل فتح مکہ سے ہوئی اور اس وقت سیاہ عمامہ آپ زیب سر کیے ہوئے تھے۔ پھر غزوہ تبوک تھا جس کی اہمیت قرآن مجید سے ثابت ہوتی ہے۔ اس غزوے نے اہل ایمان کا ایمان اور اہل نفاق کا نفاق ظاہر کردیا۔ اس مہم کی قیادت خود سرور کائنات ﷺ نے کی تھی۔ اس غزوے میں آپ کا جھنڈا سیاہ تھا اور آپ کے علمبردار تھے حضرت صدیق اکبرؓ (ابن عساکر، ابن ہشام، طبقات ابن سعد) پھر **الاصابہ فی تمییز الصحابہ** میں ہے (ج ۲، بذیل سعد بن مالک) کہ حضرت سعد بن مالک ابوالکنودؓ کو آپ نے جو جھنڈا عطا فرمایا تھا وہ سیاہ تھا اور اس پر سفید ہلال کا نقش تھا۔ (**رایتہ سودا، فیھا ھلال ابیض**)

غرض یہ ہے کہ عجمی توجیہات بے اصل ہیں۔ ماتم داری کیا کرتے ہیں شکست خوردہ ناکام لوگ۔ کامیاب و کامراں اصحاب عزیمت کو ماتم داری سے کیا واسطہ۔ وہ اگر وقتی طور پر ناکام ہوجائیں تب بھی ان کے ہاں رونا پیٹنا نہیں بلکہ نئے عزم اور نئے ولولے سے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ یہ رسم تو چوتھی صدی ہجری میں مجوسی الاصل بویہی خاندان کے معزالدولہ نے اس وقت جاری کی جب وہ اور اس کے اہل خاندان امور خلافت پر مستولی ہوگئے۔ اور طاقت کے بل پر زندقہ والحاد کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ سبائیوں نے اموی و عباسی خلافت کے سرکاری رنگ

سفید وسیاہ کے مقابلے میں سبز رنگ بعد میں اختیار کرلیا تھا جو مجوسی معبد کے جھنڈے کا رنگ تھا۔

اموی سادات

انقلاب حکومت کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ خلافت عباسیہ میں اموی سادات کے ساتھ عموماً اور خانوادۂ خلافت امویہ کے ساتھ خصوصاً عباسی خلفا کا برتاؤ اس صلہ رحمی پر مبنی تھا جس کے وہ حق دار تھے۔ تاریخ میں ان بیسوں اموی بزرگوں کے اسمائے گرامی محفوظ ہیں۔ جنھیں خلافت کے اہم مناصب پر فائز کیا گیا اور انھیں خلفائے عباسیہ کے ہاں وہی برادرانہ تقرب حاصل تھا جو جاہلیت اور اسلام میں بنو ہاشم اور بنو امیہ میں ہمیشہ قائم رہا۔ یہ موضوع بہت طویل ہے۔ مختصراً چند حضرات کے اسمائے گرامی یہاں درج کیے جاتے ہیں اور اس سے اندازہ لگے گا کہ عباسیوں کی تحریک کسی خاندانی یا نسلی پست جذبے کے تحت نہ تھی بلکہ ملت کی خیرخواہی اور امت کے ارتقاء کے لیے اسے جاری کیا گیا تھا۔ چنانچہ خلافت قائم ہونے کے بعد اس دعوت کی آبیاری میں ان تمام حضرات کو شریک کیا گیا جو اس کے اہل تھے۔ اور ملّی فرائض کا انھیں احساس تھا۔ جو لوگ دعوت محمدیہ کے علمبردار ہوتے ہیں ان کے ہاں نسلی، لسانی، ملکی اور ایسے ہی دوسرے زمینی امتیازات کی گنجائش کہاں ہوتی ہے۔

اب ملاحظہ ہوں اموی خانوادۂ خلافت اور دوسرے اموی سادات کے اسمائے گرامی اور عباسی خلفاء کے ساتھ ان کے تعلقات خصوصی۔

۱۔ عبدالعزیز بن امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز: یہ اموی بزرگ، آخری اموی خلیفہ جناب مروان ثانی کے عہد میں والی مدینہ تھے۔ امیر المومنین المنصور نے انھیں اپنا ندیم بنایا۔ چنانچہ وہ ان کے مخصوص لوگوں میں سے تھے، سیاہ سرکاری لباس پہنتے **وکان فی صحابة ابی جعفر المنصور خاصاً به ممن یلبس السوادو یلازمه حیث کان ر** (ابن حزم جمہرۃ الانساب، ص ۹۷)

۲۔ انھی مروان ثانی کی صاحبزادیاں اور اعزہ مصر میں تھے ان کی شہادت کے بعد

انھیں سب کو عزت و احترام کے ساتھ ان کے وطن حرّان بھجوادیا گیا اور ان کے لیے پیش قرار وظیفہ مقرر کر دیا۔امیر المومنین المہدی نے اس وظیفے میں اور اضافہ کر دیا۔(ہسٹری آف سیر سینز، ص۱۸۳، مطبوعہ۱۹۴۹ء)

۳۔اموی سادات کے جو خاندان کوفے اور بصرے میں آباد تھے ان کے ساتھ امیر المومنین ابوجعفر المنصور نے رشتۂ مناکحت استوار کیا،آپ کی یہ اموی زوجہ محترمہ خالد بن اُسید بن ابی العیص بن امیہ کے اخلاف میں سے تھیں اور ان سے آپ کے دو فرزند پیدا ہوئے علی و عباس اور ایک دختر عالیہ (دوسری اموی خاتون سے اپنے فرزند ارجمند امیر جعفر کا نکاح کیا۔ جو سیدہ زبیدہؒ کے والد ماجد ہیں۔پھر اپنے دوسرے فرزند اور ولی عہد امیر محمد المہدی کا نکاح سیدہ رقیہ بنت عمرو بن خالد بن عبداللہ بن امیر المومنین عثمانؓ سے کیا اور ان سے دو فرزند پیدا ہوئے۔ایسے ہی اور بھی رشتے قائم کیے۔

۴۔حضرت یحییٰ بن سعید بن ابان ابن سعید بن العاص اموی خلیفہ جو بلند پایہ محدث تھے اور کوفے کے ساکن،انھیں اپنے پاس بغداد بلایا۔اور اپنی صحبت کا شرف عطا فرمایا۔

۵۔عبداللہ بن عاصم بن امیر المومنین عمر بن عبدالعزیزؒ کو امیر المومنین محمد المہدیؒ نے مسجد نبوی کی توسیع کا متولی بنایا۔امیر جعفر بن سلیمان عباسی اس وقت والی مدینہ تھے۔(فتوح البلدان، ج۱،ص۲۷ ترجمہ)

۶۔آل امیر المومنین عبدالملک۔طبری اور ابن خلدون وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ امیر المومنین المہدی کا گزر امیر مسلمہ بن امیر المومنین عبدالملک کے قصر پر ہوا،تو ان کے عم بزرگوار عباس بن علی السجاد نے بتایا کہ جب حضرت محمد الامام اس طرف آئے تھے تو امیر مسلمہ نے ان کی ضیافت کی تھی اور چار ہزار دینار نذر کیے تھے۔امیر المومنین نے حضرت مسلمہ کے فرزندوں کو طلب فرما کر بیس ہزار دینار مرحمت فرمائے اور ان کا بیش قرار وظیفہ مقرر کیا۔ان کی نسل کے لوگ بنی مسلمہ سے معروف ہیں اور ان کے بعض حامل آثار خاندان مصر کے علاقے ''الاشمونین'' میں آباد ہیں۔(الاعلام زرکلی، ج۸،ص۱۲۲)

۷۔طبری اور ابن خلدون نے بتایا ہے کہ ۱۴۵ھ میں حبشیوں نے مدینے میں جولوٹ مار کی اور فساد کیا تو اس وقت مسجد نبوی میں نماز پڑھانے کے لیے ایک اموی نوجوان بلند آواز سے یہ کہتے ہوئے امامت کے لیے بڑھے میں الاصبغ بن سفیان بن عاصم بن عبدالعزیز بن مروان ہوں اور امیر المومنین ابوجعفر کی اطاعت کے ساتھ تم کو نماز پڑھاتا ہوں۔(طبری، ج ۳، ص ۲۵۴)

۸۔علی بن عبداللہ بن خالد بن یزید بن حضرت معاویہؓ جو السفیانی کہلاتے تھے اور مادری نسب میں عباس بن علیؓ بن ابی طالب کے نواسے تھے دمشق میں مسکن گزین تھے، خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں علم بغاوت بلند کیا اور ۱۹۵ھ میں مارے گئے۔(الاعلام زرکلی، ج ۵، ص ۱۱۷ و دیگر کتب)

۹۔ابومروان محمد بن عثمان اموی۔آپ امیر المومنین المعتصم باللہ اور ان کے فرزند امیر المومنین الواثق باللہ کے زمانے میں مکہ معظّمہ کے قاضی تھے(جمرۃ الانساب، ص ۸۷)

۱۰۔بغداد کا عدلیہ اور اموی قضاہ۔امیر المومنین جعفر المتوکل علی اللہ کے عہد سے لے کر ڈھائی سو برس تک بغداد کے عدلیہ پر اموی سادات فائز رہے۔امام ابن حزم فرماتے ہیں: (جمرۃ الانساب، ص ۱۰۵)

والقضاء فی بغداد متردد فی بنی ابی عثمان بن عبداللہ بن خالد بن اُسید بن ابی العیص بن امیۃ من عھد المتوکل الی زماننا ھذا او ھم ابی الشوارب.

[بغداد میں عہدۂ قضا (امیر المومنین) المتوکل علی اللہ کے عہد سے ہمارے زمانے تک ابی عثمان بن عبداللہ بن خالد ابن اُسید بن ابی العیص بن امیہ کے خاندان میں متوارث چلا آتا ہے۔یہ لوگ بنو ابی الشوارب کہلاتے ہیں۔]

ان میں علی بن محمد بن عبدالملک بن محمد ابی الشوارب اور محمد بن عبداللہ اموی بغداد کے قاضی القضاۃ تھے۔اسی طرح العاص بن محمد اموی بصرے کے قاضی تھے۔علامہ ابن کثیر نے ۴۱۰ھ کے واقعات میں ابوالحسن احمد بن محمد بن عبداللہ بن عباس بن محمد بن عبدالملک بن محمد ابی

الشوارب القرشی الاموی کو قاضی القضاۃ بنایا ہے۔ بغداد میں وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ بڑے فاضل وزاہد تھے بارہ برس قاضی القضاۃ رہے۔ بصرے میں دوسرا اموی خاندان حضرت ابوسفیانؓ کے فرزند عتبہ کی اولاد میں تھا۔ ان میں مشہور ادیب ومصنف محمد بن عبداللہ بن عمرو ابوعبدالرحمٰن اموی العتبی تھے)(م ۲۲۸ھ) ان کے جد اعلیٰ امیر المومنین حضرت معاویہؓ کے بھائی عتبہ کی نسل میں ایک مشہور عالم ومصنف محمد بن احمد بن محمد بن اسحاق بن الحسین بن المنصور بن معاویہ بن محمد بن عثمان بن عتبہ بن ابوسفیان تھے جو بقول علامہ ابن کثیر لغت وانساب کے عالم انساب العرب پر ان کی تالیف ہے وہ خراسان کے ابی درد مقام کے ساکن تھے۔ اس شہر کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ المؤتلف والمختلف پر ان کی کتاب بھی ہے ۵۰۷ھ میں وفات ہوئی (البدایہ، ج ۱۲، ص ۱۷۶) ایسے ہی علماء وفضلاء اس دودمان عالی شان کے عراق وشام وغیرہ میں آباد تھے۔ مثلاً عبداللہ بن سعید بن عبدالملک بن مروان جن کی کنیت ابوصفوان تھی۔ امیر المومنین عبدالملک کے پوتے ہیں۔ یہ دمشق میں رہتے تھے، کتاب النوادر کے مصنف ہیں ۱۵۴ھ میں بعہد امیر المومنین المنصو روفات پائی۔

اموی دودمان عالی شان کے بڑے بڑے علماء اوراولیاء اللہ عہد عباسی میں مشہور انام تھے۔ اوران کے فیوض سے یہ امت بہرہ ورتھی مثلاً ابوالولید حضرت حسان بن محمد بن احمد بن ہارون بن حسان بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن عنبسہ بن سعید بن العاص القرشی الاموی۔ جو خراسان میں امام اہل حدیث تھے اورمرجع خلائق۔ ان کی پیدائش کی بشارت ان کی والدہ ماجدہ کوخواب میں ملی تھی اوراللہ تعالیٰ کے یہاں انھیں اتنی مقبولیت حاصل تھی کہ ابوالحسن بن عبداللہ بن محمد الفقیہ فرماتے ہیں: ”مجھ پر اگر کوئی علمی مشکل پیش آتی یا دینوی کوئی پریشانی ہوئی تو میں حضرت ابوالولید کے مزار پر حاضر ہوتا اوران کے توسل سے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا تو میری مشکل حل ہوجاتی تھی (طبقات الشافعیۃ الکبری، ج ۲، ص ۱۹۱۔۱۹۲، طبع مصر) ۲۷۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۴۹ھ میں وفات پائی۔

غرض یہ ہے کہ سیاسی انقلاب میں جتنا کشت وخون ہوتا ہے اس انقلاب میں بھی

ہوا۔لیکن لوگوں نے عجیب وغریب بہیمانہ حرکتیں عباسیوں سے منسوب کردی ہیں کہ چن چن کر ایک ایک اموی کو قتل کیا گیا اور خلفائے پیشین کے مزارات کی بے حرمتی کی گئی۔امیر المومنین ہشام کی لاش قبر سے نکال کر سولی پر لٹکائی گئی،اس کو کوڑے مارے گئے اور پھر جلا دیا گیا۔اسی طرح ۷۰،۸۰ اموی سادات کو قتل کرکے ان کی تڑپتی ہوئی لاشوں پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا دسترخوان کیسے بچھایا اس کا ذکر نہیں۔یہ حددرجہ مکروہ و بے بنیاد روایت سب سے پہلے ابومخنف جیسے مؤلف نے جسے سب ہی ائمہ رجال نے کذّاب بتایا ہے اپنی کتاب میں درج کی تھی اسی کذّاب راوی سے بعد کے مؤلفین تحقیق کی آنکھ بند کرکے نقل درنقل کرتے رہے ہیں۔

اسی قسم کی ایک لرزہ خیز روایت طبری نے یہ لکھی ہیں کہ جب امیر المومنین المہدیؒ نے مسند خلافت کو رونق بخشی تو انھوں نے قصر خلافت میں ایک کمرہ دیکھا جو مقفل رہتا تھا۔انھیں تجسس ہوا کہ اس کمرے میں کیا ہے،اسے کھلوایا تو دیکھا کہ بے شمار آدمیوں کی کھوپڑیاں صاف کی ہوئی رکھی ہیں اور ہر ایک پر پرچی لگی ہوئی ہے کہ یہ سر کس کا ہے۔آپ یہ منظر دیکھ کر لرز گئے اور سب کو دفن کرادیا۔یعنی بیٹے کو جو ولی عہد بھی تھا یہ خبر نہ تھی کہ ابا جان کیا حرکتیں کیا کرتے تھے۔آخر لوگوں کا قتل ہونا ان کی کھوپڑیوں سے کھال اتارنا اور صفائی کرنا۔پھر کوٹھری میں قرینے سے رکھنا اور منشیوں کا بیٹھ کر ہر ایک کے نام کی پرچی لگانا کہ کہیں غلطی نہ ہوجائے۔یہ سب کام ایسے چپ چپاتے ہوتا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی حتی کہ بیٹوں کو بھی کچھ معلوم نہ تھا۔لکھنے والوں نے یہ لغوبات اپنے مقاصد کے تحت لکھیں،لیکن شرم انھیں نہیں آتی جو حوالے دے کر انھیں بیان کرتے ہیں اور باور کرانا چاہتے ہیں کہ قصر خلافت امید گاہ انام نہیں تھا بلکہ بوچڑ خانہ تھا۔لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔

انقلاب کی ایک ایک بات امیر عبدالرحمٰن الداخل اموی کی دیکھی ہوئی تھی۔انھوں نے ہسپانیہ جا کر یہ باتیں کیوں نہیں بیان کیں اور وہاں کے مصنفوں نے انہیں کیوں نہیں لکھا۔حالانکہ انھیں خوب نمک مرچ لگا کر لکھنا چاہیے تھا۔یہ سب روایتیں سبائی راویوں کی بیان کردہ اور شیعی مصنفوں کی اپنی کتابوں میں درج کردہ ہیں جنھیں دوسرے نقل درنقل کرتے چلے جاتے

ہیں۔اور عقل کو کام میں نہیں لاتے۔ہمیں تو یہ ملتا ہے کہ جب حضرت امیر الداخل ہسپانیہ متمکن ہوگئے تو اپنے اہل وعیال کو دمشق سے بلوایا۔اگر خانوادۂ خلافت کے ایک ایک شخص کو قتل کردیا گیا تھا تو یہ کیسے بچ گئے،پھر جو لوگ مزارات اکھاڑ پھینکنے اور لاشوں پر تازیانے برسانے والے ہوں ،مردوں کی ہڈیاں جلوانے والے ہوں اور تڑپتی ہوئی لاشوں پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھائیں۔ان کی بہیمانہ حرکتوں کا تقاضا تو یہ تھا کہ تمام امت ان سے ناراض ہوجائے اور جیسے ایک حکومت کا تختہ الٹا تھا ان کا بھی الٹ دیتی۔لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اموی خلافت بھی سو برس تک ایسی مقبول رہی کہ ان کے مقابلے میں کوئی ہنگامہ کارگر نہ ہوسکا۔اور عباسی خلافت بھی زائد از پانچ سو برس بغداد میں اس شان سے قائم رہی کہ جو بھی اس کے خلاف کھڑا ہوا،اس نے منھ کی کھائی۔پھر یہ بات بھی عجیب ہے کہ اموی خلافت مشرق میں ختم ہوئی تو مغرب میں قائم ہوگئی اول امارت کی حیثیت سے پھر خلافت کی صورت میں۔اسی طرح خلافت بنوعباسیہ بغداد ختم ہوئی تو مصر میں دوبارہ عباسی خلافت ہی کا احیاء کیا گیا۔برخلاف اس کے جو افراد ان خلافتوں کے خلاف کھڑے ہوئے ان کے سب عزائم خاک میں مل گئے۔اس تاریخی حقیقت کی روشنی میں وضعی مناقب وفضائل اور مظلومیت کی داستانیں کب قابل اعتناء رہتی ہیں۔اور کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اپنے وقت میں اموی اور عباسی خلافتوں کو قبولیت عام حاصل نہ تھی اور لوگ دیوانہ وار ان ہستیوں پر فدا تھے جو وقتاً فوقتاً خلافت قائمہ کے خلاف کھڑے ہوکر ناکام رہے۔

علوی سادات

امیر المومنین المامون کے زمانے میں عباسیوں کی مردم شماری کی گئی تو چھوٹوں ، بڑوں،مردوں اور عورتوں کی تعداد تیس ہزار تین تھی (ضحیٰ الاسلام،ج ا،ص ۱۲۶)اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ باقی ہاشمیوں اور مطلبیوں کی تعداد کتنی ہوگی۔بعد کی صدیوں میں جو اضافہ ہوا وہ اپنی جگہ ہے۔اب ہم دیکھتے ہیں کہ اموی اور عباسی خلافتوں میں ڈھائی سو برس کے اندر حسنیوں اور حسینیوں کے خروجوں کی تعداد ۶۵ کے قریب ہے(ملاحظہ ہو تحقیق مزید بسلسلۂ

خلافت معاویہؓ ویزید) ان میں سے کسی کو اتنے حمایتی میسر نہ آسکے کہ معمولی چپقلش سے زیادہ امت کو کچھ نقصان پہنچا سکیں۔ پھر ان میں ایک بھی خروج ایسا نہ تھا جس میں کھڑے ہونے والے کو بھی اس کے اپنے گھرانے کے لوگوں نے غلط اقدام سے نہ روکا ہو۔ اور اس کا ساتھ دینے سے گریز نہ کیا ہو۔

لہذا یہ سمجھنے کی گنجائش نہیں کہ امویوں اور ہاشمیوں میں یا عباسیوں اور علویوں میں کوئی خاندانی چپقلش تھی۔ یہ سب آپس میں شیر وشکر تھے اور ان کے باہمی رشتے پیہم ومتواتر ہوتے رہے اور آج تک ہوتے ہیں۔ سیاسی خلفشار جو گنے چنے لوگوں نے پیدا کیا، اس کا کوئی اثر ہاشمیوں وامویوں کے اپنی مودت اور تعلقات خویشی پر نہیں پڑنے دیا۔ لیکن ہواپرست لوگوں نے ان ہزاروں علوی سادات کو فراموش کر کے بعض افراد کے شخصی اقدامات کو خاندانی اور نسلی نزاع کی صورت دے دی۔ بلکہ انھیں دینی رنگ دینے سے بھی گریز نہ کیا۔ یہ نہ سوچا کہ امویوں امویوں میں، عباسیوں عباسیوں میں، حسنیوں اور حسنیوں میں، حسینیوں حسینیوں میں بھی سیاسی بنا پر خوں ریزی ہوئی۔ جب ان واقعات کو خاندانی یا دینی نہیں بنایا گیا اور افراد تک محدود رکھا گیا تو ان ۶۵ خروجوں کو یہ اہمیت کیوں دی جائے۔ جو دے دی گئی ہے اور امت میں مستقل افتراق کا سبب بنا دیا گیا ہے۔ جب خود امویوں، عباسیوں اور علویوں نے ان واقعات کو اہمیت نہیں دی اور باہمی مودت وقرابت کے تعلقات کی خوشگواری قائم رکھی، تو بعد کے لوگوں کو کیا حق ہے کہ وہ پرانی باتوں کو ہوا دیتے رہیں اور گڑھے مردے اکھاڑیں۔

امت کے سواد اعظم کا ہمیشہ یہ وتیرہ رہا اور یہی سنت صحابہ کرام کی ہے کہ اگر وقتی اختلاف پیدا ہو حتی کہ جنگ وجدل تک نوبت پہنچ جائے تو وقت گزر جانے پر اخلاف نے سب کچھ بھلا دیا اور وحدت امت قائم رکھی، اسی کے نتیجے میں ارتقاء ہوا اور دنیا میں مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ان لوگوں کو ڈیڑھ ہزار برس کے اس تجربے کے باوجود یہ بات کیوں سمجھ نہیں آتی کہ گزرے ہوئے حوادث کا ہیجان انگیز تذکرہ تعمیری نہیں ہے تخریبی ہے۔ اخلاف کے قلوب اسلاف کی طرف سے مکدر ہوتے ہیں اور گزرے ہوئے لوگوں کی ہستیاں زیر تنقید آتی ہیں۔ منہ میں زبان اور ہاتھ

میں قلم کسی خاص طبقے کے لیے مخصوص نہیں اور غلط بات کی تنقیح تو اہل فکر کو کرنی ہی پڑتی ہے۔

علویوں کے ۶۵ خروج اور ملّت اسلامیہ کے چھیاسٹویں غداری، شریف حسین کی، ایسی حرکتیں نہیں ہیں کہ امت مسلمہ کو ان لوگوں سے کوئی ہمدردی ہوتی اور وہ انھیں خلافت پر فائز کرنے کے لیے کسی درجے میں تیار ہوسکتی۔ یہ وجہ ہے کہ ان لوگوں کو کبھی کامیابی نہ ہوسکی اور ان افراد کی حرکتوں کا نتیجہ سوائے فتنہ وفساد کے اور کچھ نہ نکلا۔ یہ فساد اگر معمولی سیاسی چپقلش کی طرح کے ہوتے تب بھی ایک بات تھی مگر انھوں نے تو آپس میں بہیمانہ اور شرمناک بلکہ ناپاک حرکتیں کیں کہ قلوب ان کی طرف سے ہٹتے چلے گئے۔ مثلاً:

۱۔ **حسین بن الافطس بن الحسن بن علی بن الحسینؓ:** ان صاحب نے امیر المومنین المامون کے عہد میں خروج کیا۔ کعبہ کے ستونوں پر جتنا سونا چڑھا ہوا تھا وہ کھرچ لیا اور کعبے کے خزانوں میں جتنی نفیس اشیاء تھیں انھیں لوٹ لیا۔ لوگوں کا مال ومتاع ہتھیانے کے علاوہ ان پر ایسے ایسے مظالم کیے کہ اکثر لوگ شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ یہ بیان عمدۃ الطالب کے شیعہ مورخ ونساب کا ہے۔

۲۔ **محمد بن جعفر الصادق:** اپنے صادق باپ کا یہ کاذب بیٹا رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر کے جھوٹی حدیثیں بیان کیا کرتا تھا۔ ابن الافطس نے جب دیکھا کہ اس کی حرکتوں سے لوگ انتہائی متنفر ہوگئے ہیں تو محمد (بن جعفر) کو ورغلا کر اس کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ لیکن علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

> ''بعد چندے محمد بن جعفر (الصادق) کے لڑکے علی اور حسین ابن الافطس نے ہاتھ پاؤں نکالے اور طرح طرح کی بداعمالیاں کرنے لگے۔ زنا، اغلام اور سرِ بازار عورتوں کو اپنی عزت بچانی مشکل ہوگئی اور انھوں نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ پھر جہاں کہیں کوئی خوبصورت لڑکا نظر آتا۔ اس پر یہ ٹوٹ پڑتے حتیٰ کہ قاضی مکہ کے لڑکے کو بھی نہ چھوڑا۔''

امیر المومنین المامون نے سرکوبی کے لیے لشکر بھیجا تب اس فتنے سے نجات ملی۔ اب

یہ امیر المومنین کا عفو تھا کہ چونکہ محمد بن جعفر نے توبہ کی اور حدیثیں وضع کرنے پر شرمندگی ظاہر کی تو اسے معاف کر دیا۔

۳۔زید النار بن موسیٰ (الکاظم): چند دن کے لیے اس شخص نے بصرے میں شورش بپا کی۔عباسیوں کے گھر جلا دیے۔لوگوں کا مال ومتاع لوٹا،باغیوں کو آگ لگادی۔اس لیے زید النار کہلایا۔جب گرفتار ہوکر امیر المومنین المامون کے حضور پیش ہوا تو آپ نے اپنے رحم وکرم کے سبب اسے معاف کر کے اس کے بھائی اور اپنے داماد امیر علی الرضا کے پاس بھیج دیا۔مگر وہ اس کی حرکتوں سے اتنے ناراض تھے کہ مدت العمر اس سے بات نہیں کی۔(عمدۃ الطالب،ص۲۱۰)

۴۔ابراہیم الجزار بن موسیٰ (الکاظم): اس شخص نے یمن میں فساد کیا اور اتنے لوگوں کو قتل کیا اور ان کا مال لوٹا کہ اس کا نام 'الجزّار' پڑ گیا یعنی قصاب گرفتار ہونے پر امیر المومنین المامون نے اسے بھی معاف کر دیا۔

۵۔اسماعیل بن یوسف بن ابراہیم بن موسیٰ بن عبداللہ بن الحسن بن الحسن بن علیؓ بن ابی طالب: اس شخص نے امیر المومنین المستعین باللہ کے زمانے میں مکہ معظّمہ کو آماجگاہ فساد بنایا۔ البدایہ والنہایہ میں ہے:(ج۱۱،ص۹) نیز طبری میں ہے:

واخذ مافی الکعبة من الذهب والفضته والطیب وکسوة الکعبة.

[کعبے میں جتنا سونا،چاندی،عطر اور پردے غلاف تھے وہ سب نے لوٹ لیے۔]

پھر بقول طبری (ج۱۱،ص۱۳۷،نیز البدایہ والنہایہ،ج۱۱،ص۱۰)

واعترض الحجاج فقتل منهم جمعاً کثیر ونهبهم (حاجیوں کے قافلے پر ٹوٹ پڑا۔بہت سے لوگوں کو شہید کیا۔اوران کا مال لوٹ لیا) پھر یہی حرکتیں اس نے مدینے میں کیں۔

وهو الذی حاصر المدینة حتی مات اهلها جوعاً ولم یصل احدفی مسجد رسول الله ﷺ

[اس شخص نے مدینے کا محاصرہ کرلیا۔یہاں تک کہ وہاں کے لوگ بھوکوں مرگئے

اور مسجد نبوی میں کوئی شخص نماز نہ پڑھ سکا۔]

۷۔محمد بن حسن بن محمد بن ابراہیم بن الحسن بن زید بن الحسن بن علی بن ابی طالب:
۲۵۲ھ میں اس شخص نے امیر المومنین المعتمد علی اللہ کے زمانے میں خروج کیا۔ مسجد نبوی میں بیٹھ کر علانیہ شراب پیتا تھا اور بدفعلیاں کرتا تھا۔امام ابن حزم فرماتے ہیں: (جمہرۃ الانساب،ص ۴۴)

وکان من افسق الناس شرب الخمرفی مسجد النبی ﷺ نهارًا و فسق فیه بقینہٖ لبعض رحمه الله وقتل لبعض اهل المدینة بالسیف والجوع وکان قیامه ایام المعتمد وقتل اهل المدینة ولم یصل بها طول مدته فیها جمعة وجماعته۔

[یہ نہایت درجہ فاسق تھا۔مسجد نبوی میں علانیہ شراب پیتا تھا اور بعض اہل مدینہ کی چھوکریوں کے ساتھ بدفعلی کرتا تھا۔.......اس نے اہل مدینہ کو تلوار اور بھوک سے مارا اس نے خلیفہ المعتمد علی اللہ کے زمانے میں بغاوت کی تھی۔اہل مدینہ کو اسی نے قتل کیا کہ جب تک اس کا تسلط رہا (مسجد نبوی میں) جمعے کی نماز ادا نہ کی جا سکی۔ اور نہ جماعت کی]

۷۔محمد بن الحسین بن جعفر بن موسیٰ (الکاظم): اس نے اور اس کے بھائی علی بن الحسین نے مدینے میں بغاوت کی۔۲۷۱ھ کا واقعہ ہے۔امیر المومنین المعتمد علی اللہ کا عہد تھا۔ اس بغاوت کے احوال امام ابن حزم اس طرح بیان کرتے ہیں: (جمہرۃ الانساب،ص ۵۸)

وهما الذان قاما فی ۲۷۱ھ بالمدینة فقتلا اهلها واخدا اموالهم واخرابا المدینة حتی بقیت لایصلیٰ فی مسجد رسول الله ﷺ شهرًا کاملاً لاجمعة وجماعة اصلاً.و قتل محمد بن الحسین حین قیام ثلا ثه عشررجلاً من ولد جعفر بن ابی طالب رضی الله عنه عند صبروا وهو ملقب بالملیط.

[ان دونوں نے مدینے میں ۲۷۱ھ میں بغاوت کی۔وہاں کے لوگوں کو قتل کیا اور

ان کا مال لوٹا مدینے کو ایسا تباہ کیا کہ مسجد نبوی میں پورے ایک مہینے نہ جمعہ ہوسکا اور نہ جماعت کی قطعاً کوئی نماز ہوسکی اور اس محمد بن الحسین نے اپنے تسلط کے دوران حضرت جعفر بن ابی طالب کی اولاد میں سے تیرہ حضرات کو پکڑ کر شہید کر دیا۔ اس لیے اس کا لقب ملیط ہو گیا۔ (یعنی خبیث بے ننگ و نام)]

ان نام نہاد ''سادات کرام ابناء رسول اللہ'' کی حرکتوں کے یہ چند نمونے ہیں اور ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لوگوں کے قلوب ان سے کیوں متنفر رہے۔ اور کس وجہ سے آل علی کی خلافت قائم ہونے کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔ اس قسم کی حرکتیں صرف انھی سات آٹھ آدمیوں کی نہ تھیں، ان ۶۵ میں سے اکثر کا کردار ایسا ہی پست اور شرمناک تھا، تفصیل طویل ہے اور موجب ندامت۔

اب اموی اور عباسی خلافتوں پر تنقید کرنے والوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ تمام جرائم جن کا صدور بعض آل علی سے ہوا، ان کا ذکر نہیں کرتے اور انھی جرائم کو کذباً وافتراءً اموی اور عباسی خلفاء پر تھوپ دیتے ہیں، اتنا نہیں سوچتے کہ اگر خلفائے کرام نے ایسی حرکتیں کی ہوتیں اور ان بعض علویوں نے اپنی پاک بازی اور عدل کوشی کی کوئی مثال قائم کی ہوتی یا امت نے ان کی کاروائیوں کو کسی درجے میں تعمیری سمجھا ہوتا تو امویوں اور عباسیوں سے ان کے دل بھر جاتے اور ان علویوں کی طرف قلوب مائل ہوتے۔ انھیں کامیاب کرنے کے لیے مسلمان جوق در جوق جان و مال کی بازی لگانے کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ یعنی عالم یہ نہ ہوتا کہ ان میں سے کوئی ایک خروج بھی ایک ناکام وقتی ہنگامے سے زیادہ کچھ نہ ہوتا۔ اور امت کے قلوب خلافت قائمہ ہی کی طرف جھکے رہے۔

ابن علقمی اور اس کے سبائی ساتھیوں نے آل علی کی خلافت قائم کرنے کے لیے ہلاکو خان سے سازباز کی اور مرکز خلافت تباہ کرادیا۔ مگر نتیجہ صرف یہ نکلا کہ امت پر بلا نازل ہوئی۔ ان کی بستیاں اجڑ گئیں، لیکن آل علی کی خلافت قائم ہونے کے بجائے مصر میں پھر خلافت عباسیہ ہی قائم ہوگئی۔ مسلمانوں نے بعد میں ان تاتاریوں کا وہ قلع قمع کیا کہ سب بدلہ

لے لیا گیا۔یعنی یہ لوگ اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کی اخلاقی برتری سے ایسے متاثر ہوئے کہ گروہ گروہ آ کر اسلام قبول کرنے لگے۔یوں عالم اسلام میں دعوت محمدیہ کی نشاۃ ثانیہ کا اللہ تعالیٰ نے انتظام کردیا۔ ؎

پاسبان مل گئے کعبہ کو صنم خانوں سے

ہمارے زمانے میں اسی علوی خلافت قائم کرنے کی ہوس میں شریف حسین نے نصاریٰ سے ساز باز کی۔اسلحہ اور اشرفیوں کے صندوق کے صدوق وصول کرکے بغاوت کی پوری پوری تیاری کی۔اور عین اس وقت جب ترکی خلافت کے امیر المومنین نے کفار کے خلاف اعلان جہاد کیا،اس شخص نے کفار کے ساتھ ہوکر امیر المومنین کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کردیا۔ترکی امیر عساکر کو جب اس کی ریشہ دوانیوں کی خبر ہوئی اور انھوں نے اس سے باز پرس کی تو اس شخص نے خاص حرم میں کعبہ کے قریب کھڑے ہوکر حلفیہ بیان دیا کہ افواہیں غلط ہیں اور میں پوری طرح عہد وفاداری پر قائم ہوں،وہ صاحب ایمان شخص تھے مطمئن ہوگئے لیکن شریف حسین اور اس کے لوگوں نے جو حرکتیں کیں،جس طرح خاص حرم میں ترکوں اور مخلص مسلمانوں کو شہید کیا،ان دلدوز واقعات کے عینی شاہد شاید اب بھی موجود ہوں۔مولانا خلیل احمد انصاری نے بذل المجہود فی حل ابی داود میں ایک حدیث پر بحث کرتے ہوئے یہ سب تفصیلات عینی شاہدوں سے معلوم کرکے بیان کی ہیں جو حرم کے علماء وفقہاء میں ہیں۔(کتاب الفتن والملاحم،ج۵،ص۸۹) اس شخص نے محض امت کا کلمہ ہی متفرق نہیں کیا اور امام المسلمین کے خلاف بغاوت ہی نہیں کی محض حرم میں بے گناہ مسلمانوں کو شہید ہی نہیں کیا۔بلکہ اپنے نصرانی آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے بعض ترک خواتین کی وہ بے حرمتی کرائی جس کے بیان کو قلم کا سینہ شق ہوتا ہے۔

اسی کے نتیجے میں عالم اسلام پر وہ مصائب ٹوٹے کہ بظاہر ابھی فلاح کا وقت دور نظر آتا ہے۔عرب کے ٹکڑے ہوگئے۔فلسطین پر یہود قابض ہیں اور تمام عرب بلاد عربیہ واسلامیہ کفار کی ترک وتاز سے نیم جان ہیں۔لیکن اللہ کا وعدہ ہے۔اس دور ابتلاء سے مسلمان پھر ابھریں گے جس کے کچھ آثار پیدا بھی ہورہے ہیں۔**وماذلک علی اللہ بعزیز**

اندلس کی اموی امارت وخلافت

امیر عبدالرحمٰن اموی الداخل نے اگرچہ خلیفہ عباسی سے بیعت نہیں کی تھی۔لیکن خلیفۂ اسلام انھی کو جانتے تھے جیسا کہ خود فرمایا ہے اوراوپر مذکور ہوا۔ہونا یہ چاہیے تھا کہ عباسی خلافت اوراموی امارت میں انتہائی چشمک اورعدوات ہوتی لیکن امیرالمومنین المنصور نے ابتدائی ناکامی کے بعد اندلس فتح کرنے کا خیال چھوڑ دیا اور یوں بے تعلقی کی فضا قائم ہوگئی لیکن بے تعلقی سیاسی تھی،دینی اور خاندانی تعلقات بدستور قائم رہے۔دونوں مملکتوں کے شہری اطمینان سے آتے جاتے تھے جس طرح اموی سادات کوخلافت عباسیہ میں اہم مناصب دیے گئے اورانھیں خاص مراعات سے نوازا گیا۔اسی طرح بعض عباسی سادات کا قیام اموی امارت اندلس میں ثابت ہے۔امام ابن حزم نے متعدد عباسیوں کا اندلس میں حکومت کے مہمانوں کی حیثیت سے رہنا بیان کیا ہے۔پھر تحصیل علم یا سیر وسیاحت کے لیے اندلس کے مسلمانوں کا بلاد عربیہ میں آنا جانا جاری رہا۔اندلس کے ایک عظیم عالم حضرت امام یحییٰ بن یحییٰ المصمودی جو موطأ کے راوی ہیں وہی اس کو اندلس لے گئے تھے اور وہاں وہ خود عظیم کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔علاوہ ازیں ملّی وحدت اوردینی اخوت خود موطأ کی تدوین سے ثابت ہے اوراندلس میں اس کی وہی حیثیت ہوئی جوخلافت عباسیہ میں تھی۔ہمارے بیان پرشاہد عادل ہے۔اموی حکمرانوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ اس کی تدوین عباسی امام نے کرائی ہے،علم کے بارے میں سیاسی یانسلی یالسانی کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا اور نہ مسلمانوں کے ہاں علم کی اجارہ داری کسی خاص خاندان میں تسلیم کی گئی بلکہ اسے انھوں نے روح اسلامی کے خلاف جانا۔

چنانچہ موطأ کی تالیف میں اس کا کوئی خیال نہیں کیا گیا کہ روایت فلاں خاندان کے افراد کی ہے۔اسے نہ لیا جائے یا اس کے راوی کا فلاں سیاسی موقف تھا۔اس لیے اس کی روایت قبول نہیں کی جائے گی۔

وہاں صرف راوی کی عدالت اوراس کا علمی مقام دیکھا جاتا تھا چنانچہ اس میں جہاں

ہاشمی سادات کی مرویات اور فتاویٰ ہیں وہاں اموی سادات کی مرویات وفتاویٰ کو بھی وہی حیثیت دی گئی ہے۔جمل وصفین میں حصّہ لینے والے یا غیر جانب رہنے والے یا بعد کے سیاسی نزاعات میں فریق بننے والے سب سے اس کتاب میں یکساں استفادہ کیا گیا ہے۔عباسی ائمہ نے امام مالک سے جب اس کی سماعت کی تو حضرت امیر المومنین معاویہؓ،امیر المومنین مروان اور امیر المومنین کی وہی علمی اور روحانی عظمت تسلیم کی جو حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی تھی بلکہ عبداللہ بن الزبیرؓ کی بھی جن کی سیاسی چپقلش امویوں اور ہاشمیوں دونوں سے رہی،اسی طرح اندلس کی اموی امارت اور پھر خلافت میں ہاشمی سادات اور ابن الزبیرؓ اور دوسرے وہ حضرات جو سیاسیات میں غیر جانب دار رہے۔ان سب کی یکساں حیثیت تسلیم کی گئی۔اور سب کے ارشادات قانونی نظائر کی حیثیت سے سنے اور سمجھے جاتے رہے۔وہاں ایسا کوئی تصور نہیں تھا کہ ''ہم صرف اپنے سلسلۂ امامت پر انحصار کرتے ہیں اور بس۔''

اب ایک اور دلچسپ واقعے کی تفصیل ملاحظہ ہو جس سے اندازہ ہوگا کہ دینی اور ملّی معلامات میں عباسی خلافت اور اموی امارت میں ہمیشہ یگانگت اور باہمی اعانت کا تصور قائم رہا۔مثلاً امیر المومنین المامون کے زمانے میں اندلس کے امیر عبدالرحمٰن الثانی تھے۔اس زمانے میں مصر کے والی امیر زیادۃ اللہ نے صقلیہ (سسلی) پر دھاوا بول رکھا تھا۔قاضی اسد بن فرات کئی شہر فتح کرنے کے بعد شہید ہو چکے تھے،پھر محمد بن الجواری نے قیادت سنبھال لی اور وہ بھی متعدد فتوحات کے بعد ۲۱۴ھ میں وفات پا چکے تھے۔اب امیر عسکر زہیر بن غوث تھے انھوں نے متعدد فتوحات کے بعد شکست کھائی اور اسلامی لشکر محصور ہو گیا۔اتنے میں رومیوں کی طرف سے ایک بڑی امدادی فوج بھی آ گئی۔جس سے مجاہدوں میں ہراس پھیل گیا اسی عالم میں اچانک اندلسی بحری بیڑا ادھر سے گزرا جس میں تین سو جہاز اور بیس ہزار سپاہی تھے،اس بحری لشکر کے افسر فرغوش تھے انھوں نے جو صورت حال دیکھی تو وہیں رک گئے اور مسلم فوج کا ساتھ دیا۔ادھر امیر زیادۃ اللہ کی طرف سے بھی مسلمانوں کو کمک پہنچ گئی،اب اسلامی لشکر کافی طاقتور ہو گیا۔فوج کی جدید ترتیب دی گئی اور سب نے بالاتفاق اس کی کمان امیر فرغوش اندلس کے سپرد کردی۔لیکن

پھر مسلمان شکست کھا گئے یہ صورت دیکھ کر امیر فرغوش وہاں سے ہٹ گئے اور بلرم پر حملہ کر کے اس کا محاصرہ کر لیا جب تک کہ فتح یاب ہوئے اور یوں پالالشکر اسلام کے ہاتھ رہا۔اس عظیم الشان فتح کے بعد امیر فرغوش کا بیڑا اپنے بھائیوں سے رخصت ہوگیا۔انھوں نے یہ نہیں چاہا کہ اس فتح کے ثمرات میں حصہ بٹائیں۔عباسی لشکر کی یہ امداد محض فی سبیل اللہ کی گئی تھی اور صرف دینی اور ملّی جذبہ کارفرما تھا (ملاحظہ ہو نصیر احمد جامعی کی کتاب مسلمان سسلی میں ،ص ۴۸۔۴۹، طبع سنگ میل پبلیکیشنز لاہور)

اب ملاحظہ ہو یورپ کے مورخوں کا یہ افترأ محض کہ اندلس کے حکمرانوں کو زیر کرنے کے لیے امیر المومنین ہارون الرشید نے شاہ فرانس شارلمین سے تعلقات قائم کیے تھے اور اس درجہ کی اس استمالت انھیں منظور تھی کہ القدس کے کلیسا کی کنجیاں اسے بھجوادیں۔دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ اندلس کی اموی امارت نے بازنطینی حکمراں سے اپنے تعلقات استوار کیے تا کہ عباسی خلافت کو پریشان کرتا رہے،یورپ کے مورخوں کی اس ہرزہ سرائی کا کوئی سراغ ہمیں قدیم مسلم مورخوں کے ہاں نہیں ملتا حالانکہ اگر اس منظر کشی میں صداقت کا شائبہ بھی ہوتا تو اس کا ذکر ضرور کرتے دراصل یہ نصرانی مورخوں کے احساس کمتری کی ایک علامت ہے ان کے سامنے مشرق و مغرب کے مسلمانوں کا تمدنی،تہذیبی،معاشرتی اور علمی تفوق تھااور اقوام عالم میں ان کی سیاسی برتری تھی۔ان کے مقابلے میں یورپ کی ذہنی،روحانی،علمی،معاشرتی اور سیاسی پستی تھی۔اس لیے انھوں نے عباسیوں اور امویوں کے مابین چپقلش بیان کر کے اپنے عوام کو تسلی دینے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے بادشاہ ایسے عظیم المرتبت تھے کہ مسلم حکمرانوں کو اپنے معاملات میں ان کی امداد کی احتیاج رہتی ہے۔یعنی کافروں کی مدد سے وہ ایک دوسرے کو زیر کرنا چاہتے تھے۔

اب ایک طرف دیکھا جائے وہ واقعہ جو اوپر بیان ہوا۔اور دوسری طرف یورپ کے مورخوں کی یہ افترا پردازی،ان دونوں میں کوئی وجہ تطابق نظر آتی ہے؟اموی سادات کرام کی عظمت و شرف اور ان کی للّہیت دینی غیرت اور امور ملّیہ میں تقویٰ شعاری کی ہم ایک اور مثال دینا چاہتے ہیں جب عباسی خلافت روبہ انحطاط ہوئی۔ایک طرف مشرق میں مجوسی الاصل بویہی

خاندان امور خلافت پر مستولی ہوگیا اور دوسری طرف مغرب میں دوسرا مجوسی الاصل عبیدی خاندان، اور یوں خلیفۂ عباسی کی حیثیت ایسی نہیں رہی کہ وہ آزاد فرائض امامت انجام دے سکیں تو اموی امیر عبدالرحمٰن الناصر نے علماء وفقہاء کا ایک اجلاس طلب کیا کہ خلیفۂ اسلام کی عجز کے سبب کیا اس کا امکان ہے کہ میں اپنے آپ کو خلیفہ کہہ سکوں۔ کیونکہ وہ اب اپنے فرائض صحیح ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ہمارے اور ان کے درمیان عبیدی ملاحدہ کی حکومت اور پھر سمندر حائل ہے۔تو اس وقت علماء نے فتوی دیا کہ ایسی صورت میں دو خلافتیں قائم ہوسکتی ہیں۔تب امیر عبدالرحمٰن الناصر نے اپنی خلافت کا اعلان کیا۔اور امیر المومنین کہلائے اموی ذہنیت یہ نہیں تھی کہ جب چاہا اور جہاں چاہا چند آدمی جمع کیے اور خلافت کا اعلان کردیا پھر چاہے نتیجہ کچھ بھی نکلے۔ اموی حضرات ہر معاملے میں قواعد شرعیہ اور مفاد ملّت پیش نظر رکھتے تھے۔ویسے ہر خاندان میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور حالات کبھی سازگار ہوتے ہیں اور کبھی نہیں سیاسی مدوجزر تو ہوتا ہی رہتا ہے۔یہاں یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ امیر المومنین الناصر نے عباسی خلیفہ کی آئینی حیثیت کا انکار کرکے اپنی خلافت کا اعلان نہیں کیا۔ بلکہ ان کو خلیفۂ اسلام تسلیم کرکے ایک شرعی جواز تلاش کیا کہ ایسے احوال میں دو خلافتیں ہوسکتی ہیں۔اگر دین کے بجائے خاندانی عصبیت کا جذبہ ہوتا تو خلیفہ عباسی کی خلافت کا انکار کرکے اپنی خلافت قائم کرتے۔لیکن وہ جانتے تھے کہ ایسا اقدام ملتِ اسلامیہ کے ساتھ غداری ہوتا اور اس سے امت کا کلمہ متفرق ہوجاتا۔

برخلاف اس کے آل علی میں سے جتنے لوگوں نے اموی اور عباسی دور میں خروج اور بغاوتیں کیں وہ چونکہ تعمیری نہ تھیں اور نہ ان کا کوئی ملیّ نصب العین تھا، اس لیے امت میں انھیں کبھی مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ کیونکہ شخصی طالع آزمائی کے علاوہ ان کا کوئی مطمح نظر نہ تھا۔پھر امت اس گروہ سے بھی نالاں تھی۔جنھوں نے وقت بے وقت بلکہ ہمیشہ بے وقت ان علویوں کو ابھار کر میدان میں کھڑا کیا۔اور پھر بے یارومددگار چھوڑ کر بھاگ گئے۔

وجہ یہ بھی ہے کہ اموی خلافت خالص عربی حکومت تھی اور عرب اس کے لیے تیار نہ تھے کہ اپنی حاکمیت ختم کردیں۔اس لیے اموی دور میں علویوں کو ناکامی ہوئی۔دعوت عباسیہ میں

تمام مسلمانوں کی حاکمیت کا تصور تھا اور ہر اسلامی ملک کو حکومت چلانے کی دعوت تھی۔اگر علویوں کا تصور بھی ایسا ہی ہوتا تو شاید وہ کامیاب ہو جاتے مگر ان کے ہاں تو مدار اس پر تھا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی ذریت ہیں۔اس لیے تمام امت کو ہماری حاکمیت تسلیم کرنی چاہیے۔چنانچہ ان میں سے جو بھی کھڑا ہوا اس نے اپنے ''ابن رسول اللہ'' ہونے ہی پر اپنے دعوے کی بنیاد رکھی، آسمان وزمین نے یہ منظر دیکھا ہے کہ ایک ہی خلیفہ کے خلاف کئی کئی ''ابنائے رسول اللہ'' کھڑے ہو گئے۔مگر ان میں نہ باہم کوئی رابطہ تھا نہ حکومت قائمہ کا تختہ الٹنے کا سامان،اور نہ انقلاب کے بعد کوئی نصب العین جسے موقعہ ملا اس نے سو دو سو اور دو ہزار عجمی لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا۔اور اس بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا،اور وہ بھی اپنے ہی خاندان کے دوسرے مدعیوں کے خلاف حریفانہ اگر کھڑے ہوتے تو کم از کم وقتی طور پر تو متحد رہتے۔

تاریخ کا طالب علم جب ان لوگوں کے ''کارنامے'' دیکھتا ہے تو حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ وہ تعمیر اور ارتقاء امت اور اہل عالم کے لیے دائمی عدل عمرانی کی دعوت جو رسول اللہ ﷺ نے جاری کی اور جس کے لیے آپ کے اصحاب کرامؓ نے جان و مال کی بازی لگائی پہلی صدی ہجری سے لے کر اس چودھویں صدی ہجری میں شریف حسین کی بغاوت کو ایک ہی منظر سامنے آتا ہے ایسے باغیوں کی امداد و حمایت کا اتہام امام اعظم ابوحنیفہ پر عائد کیا گیا۔جس کی حقیقت پچھلے اوراق میں کھول دی گئی ہے۔اب یہ امت مرحومہ پر اللہ کا فضل ہے اس کے وعدوں کی حقانیت ہے رسول خدا ﷺ کی معجزانہ برکت ہے اور صحابہ کرامؓ کی کرامت ہے کہ نام نہاد ''ابنائے رسول اللہ'' کی لائی ہوئی ہر مصیبت یہ امت جھیل گئی۔اور رہ رہ کر اپنی ہستی اپنی دعوت اور اپنے عزائم بروئے کار لانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے تائید ایزدی سے اپنی نشأۃ جدیدہ کا انتظام کرتی رہی اور اب بھی یہی توقع ہے کہ پھر اس امت کو اقوام عالم میں وہی مقام حاصل ہوگا جو فطری طور پر اس کا ہے۔وَلِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ (الروم:۴۔۵)

☙❧

حوالہ جات

۱ کاشانۂ خلافت کی حفاظت کرنے والوں میں عبداللہؓ بن عبداللہ بن عباسؓ، محمد بن طلحہؓ، عبداللہ بن الزبیرؓ، مروان بن الحکمؓ، حسن بن علیؓ جیسے حضرات تھے۔ چھت پر پہرہ دینے والوں میں ابو ہریرہؓ جیسے بزرگوار تھے۔ ام المومنین ام حبیبہ صلوات اللہ علیہا جب باغیوں کو سمجھانے اور مشکیزہ آب پہنچانے تشریف لائیں تو اشتر نخعی نے آپ کے خچر کے منھ پر گھونسا مار کر اس کا رخ پھیر دیا، امیر المومنین کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے ابن عباسؓ کو حکم دیا کہ ازواج مطہرات کو لے کر فوراً مکے چلے جائیں انھوں نے عرض کیا کہ میرے نزدیک حج سے زیادہ ضروری ان باغیوں کے خلاف جہاد معلوم ہوتا ہے۔ مگر آپ نے سرکاری طور پر انھیں امیرِ حج بنا کر روانہ کر دیا اور ساتھ ہی ایک مکتوب دیا کہ حاجیوں کو سنا دیں تاکہ مدینے کی صورت حال انھیں معلوم ہو جائے۔ محافظوں کی طرف سے بار بار عرض کیا جاتا تھا کہ قتال کی اجازت مل جائے مگر اس پر کسی طرح تیار نہیں ہوئے حتیٰ کہ آخر میں سب سے اپنا گھر خالی کرالیا۔ ابن الزبیرؓ سب کے بعد نکلے تھے کیونکہ حضرت ابن الزبیر کو امیر المومنین نے اپنا وصی مقرر کیا تھا۔ مکان تو خالی ہو گیا مگر محافظ دروازے پر برابر موجود رہے۔ امیر المومنین شہادت کے لیے پوری طرح تیار ہو کر تلاوت کلام پاک میں مشغول تھے کہ برابر کے ایک خالی گھر میں سے چڑھ کر چند باغی اندر آ گئے اور آپ کو شہید کر دیا۔ آسماں راحق بود گر خوں بیادر بر زمین۔ آپ کی زوجہ محترمہ سیدہ نائلہؓ نے جب دیکھا تو آپ کے اوپر جھک گئیں لیکن آپ کی انگلیاں کٹ گئیں اور آپ کو دھکیل کر قاتل اپنا کام کر گئے۔ محمد بن ابی بکر، عمرو بن الحمق اور کنانہ بن بشر اس ٹولی میں تھے۔

۲ یہ مواقف تو صحابہ کرام کے بیان ہوئے ان کے علاوہ بھی تابعین کی بڑی جماعت تھی جنھوں نے حضرت علیؓ سے بیعت کر لی تھی اور آئینی حیثیت سے انھیں امام جانتے تھے۔ ان کی حالت بھی یہ تھی کہ حضرت معاویہؓ کے خلاف انھیں لڑنا گوارا نہ تھا، اوّل تو ان کی شخصی عظمت اور خدمات ملیّہ تھیں۔ پھر جو مطالبہ لے کر وہ کھڑے ہوئے تھے اس کی حقانیت دلوں میں ایسی گھر گئی تھی کہ ان کے خلاف نبرد آزما ہونے پر ان کے قلوب مائل نہ ہو سکے۔ حالانکہ یہ لوگ ہمدانی تھے جنھیں حضرت علیؓ سے خاص عقیدت تھی۔ اپنی رعایا کی اس نفسیاتی کیفیت کا ادراک خود بھی آپ کو تھا،

اسی لیے جولوگ صفین کی جنگ میں شرکت پر تیار نہ تھے انھیں آپ نے دوسرے علاقوں میں جہاد کے لیے بھیج دیا تا کہ آپ کی فوج کی صفوں میں انتشار نہ پھیلے چنانچہ فتوح البلدان میں ہے: (فتوح البلدان، ج ا، ص ۴۵۸، ترجمہ)

''مرّہ ہمدانی کہتے ہیں کہ علی بن ابی طالبؓ نے ہم سے فرمایا: تم میں سے جو شخص ہمارے ساتھ ہو کر معاویہؓ سے قتال پسند نہ کرے وہ اپنی عطاء لے لے اور دیلمیوں کی طرف جا کر ان سے جنگ کرے۔ راوی کہتے ہیں میں انھی میں تھا جنھوں نے دوسری صورت پسند کی۔ ہم نے عطائیں لیں اور دیلم کی جانب روانہ ہوئے ہماری تعداد پانچ ہزار تھی۔''

۳ اس گروہ کی حرکتیں اہل صفاء کو ناگوار تھیں، چنانچہ حضرت ابوایوب انصاریؓ جنگ جمل تک حضرت علیؓ کے ساتھ تھے، پھر الگ ہو گئے اور صفین میں شریک نہیں ہوئے۔ (الاصابہ فی تمیز الصحابہ بذیل عنوان خالد بن زید) حضرت جریر بن عبداللہؓ جنگ جمل کے بعد تک ساتھ رہے لیکن پھر بددل ہو کر مدینے چلے گئے۔ حضرت قیس بن سعد بن عبادہؓ صفین کے بعد تک ساتھ رہے اور مصر کے والی بنے لیکن سبائیہ کی ریشہ دوانیوں سے ناراض ہو کر الگ ہو گئے اور مدینے جا بیٹھے۔

۴ شیعہ امامیہ کے مجتہد اعظم شیخ مقید نے اپنی مشہور کتاب من لا یحضرہ الفقیہ کے باب الاذان میں صراحتاً بیان کیا ہے کہ مفوضہ ہی ہیں جو اذان میں حضرت علیؓ کے ولی اللہ اور وصی رسول اللہ اور خلیفہ بلافصل ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ الفاظ جز و اذان نہیں ہیں جو ان الفاظ کو جز اذان سمجھ کر اس کو اذان دیتے وقت کہے اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

۵ غیر شیعہ جہلا بھی شیعہ پروپگینڈے سے یہ نعرہ لگا بیٹھتے ہیں۔

۶ دارالمصنفین اعظم گڑھ نے کام تو بہت کیا مگر تاریخی اعتبار سے سطحی اور اغلاط سے پُر۔ حضرت ابن عباسؓ کے احوال میں کہا گیا ہے کہ صفین کے معرکوں میں وہ بڑی بہادری سے لڑے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ نہ جمل میں ام المومنین صلوٰت اللہ علیہا کے خلاف معرکہ آرا ہوئے اور نہ صفین میں۔ وہ بصرے کے والی تھے اور شروع سے آخر تک رہے۔ میدان جنگ میں ان کے آنے کا موقعہ ہی کہاں تھا۔ اسی طرح آل عباس میں سے کسی کا حقیقی جنگ میں شریک ہونا ثابت نہیں کیونکہ وہ سب مختلف علاقوں کی حکومت پر فائز تھے۔ البتہ یہ ہے کہ جنگ جمل میں

جب باہمی صلح ہوگئی تو حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابن عباسؓ نے بطور ضامن کے اصحاب جمل کے ہاں رات گزاری اور حضرت محمد طلحہؓ نے اصحاب جمل کی طرف سے لشکر مرتضوی میں (منہاج السنۃ ،البدایہ والنہایہ نیز طبری) اسی طرح صفین کے بعد ثالثوں کا فیصلہ سننے کے لیے جو اجتماع ہوا تھا اس میں حضرت علیؓ کی طرف سے چار سو نمایندوں کی قیادت حضرت ابن عباسؓ نے کی اور آپ ہی انھیں نماز پڑھاتے تھے پھر حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہؓ کے مابین صلح نامہ مرتب کرنے میں آپ نے شرکت کی ،غرض ان جنگوں میں تعمیری موقف حضرت ابن عباسؓ ہی کا نظر آتا ہے اور آپ مسلمانوں کے مابین کشت وخون پسند نہیں کرتے تھے اور یہی موقف حضرت حسنؓ کا تھا، نیز حضرت محمد بن طلحہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ بن العاص کا۔

اختلاف مذاہب

امیر المومنین المامون کے عہد مبارک میں ایک نصرانی شخص نے اسلام قبول کیا۔اور کچھ دن بعد مرتد ہوگیا۔امیر المومنین نے اسے اپنے ہاں طلب کرکے پوچھا کہ:اسلام سے تمھیں وحشت کس سبب سے ہوئی ؟اس نے کہا: آپ کے دین میں مجھے اختلاف کی کثرت نظر آئی۔آپ نے فرمایا: ہمارے ہاں اختلاف دوقسم کا ہے ایک تو ایسا جیسے اذان کا ہے، جنازے کی تکبیر کا ہے، پھر تشہد کے اختلافات ہیں،عیدین کی نمازوں کے ہیں، ایام تشریق کے تکبیروں کے ہیں، قرأتوں کے ہیں، اورفتوے دینے کی دلیلوں کے ہیں اور ایسے ہی اور اختلافات ہیں۔ توان کواختلاف نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہ اختیار ہےتوسّع ہےاور تکلیف دور کرتا ہے۔جس نے اذان کے کلمات دو دفعہ کہے لیکن اقامت میں ایک ایک دفعہ کہے تو اس پر گناہ نہیں۔اسی طرح اذان میں بھی دو دو دفعہ کلمات کہے اور اقامت میں بھی تو اس پر لوگ نہ ایک دوسرے کو عار دلاتے ہیں اور نہ عیب نکالتے ہیں۔یہ بات تم عیاناً تم خود ہی دیکھ رہے ہو اور ہمارے اس بیان کے گواہ ہو۔

دوسرا اختلاف وہ ہے جو ہماری کتاب کی کسی آیت یا ہمارے نبی ﷺ کے کسی ارشاد کی تاویل میں ہو۔حالانکہ ہم خدا کی طرف سے آیت کے نزول پر اور حدیث کی صحت پر متفق ہیں اگر تمھاری وحشت کا سبب یہ ہوا ہو اور اسی وجہ سے تم ہماری کتاب کا انکار کرتے ہو۔تو پھر تورات اور انجیل پر بھی ایسا ہی اتفاق ہونا چاہیے جیسا کہ ان کے الفاظ کا خدا کی طرف سے ہونے پر اتفاق ہے اور یوں یہود و نصاریٰ میں تفسیر کے سلسلے میں کوئی اختلاف نہ ہونا چاہیے..... اگر اللہ

چاہتا کہ کتاب ایسی نازل کرے اور انبیا اور ان کے نائبوں کے اقوال اس نہج پر ہوں کہ تفسیر میں کوئی اختلاف نہ ہو سکے تو وہ ایسا کر سکتا تھا۔لیکن ہم دینی اور دینوی امور میں ایسا کہیں نہیں دیکھتے کہ خدا نے وہ چیز اتاری ہو جو ہر حال میں کفایت کرے۔اگر وہ ایسا کرتا تو آزمائش اور محنت نہ رہتی اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے اور مقابلے پر کامیابی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا نہ ہوتا،اس پر وہ شخص پھر اسلام لے آیا۔اور امیر المومنین نے سجدۂ شکر ادا کر کے حاضرین سے فرمایا آج اس پر روپیہ دے کر کچھ احسان مت کرنا تا کہ اس کا اسلام آزاد نہ ہو۔اور اس کا دشمن یہ نہ کہہ سکے کہ لالچ کے سبب مسلمان ہوا۔مگر آیندہ اس کے ساتھ بھلائی کرنے اسے امداد دینے اور اس کا دل لبھانے میں کسر مت رکھنا۔(ضحیٰ الاسلام، ج۱،ص۳۸۱)

امیر المومنین المامون نے اس حسن کے ساتھ یہ مسئلہ صاف کر دیا کہ فقہاء اور متکلمین کے جو اختلافات ہیں ان سے علم میں ارتقا ہوتا ہے لیکن یہ اختلاف فرقہ بازی کا موجب نہیں ہونا چاہیے اور جماعت کی مضبوطی اور امت کی وحدت پر حرف نہیں آنا چاہیے اور نہ ایسی کوئی حرکت ہونی چاہیے جس سے مسلمانوں کا حال و استقبال تباہ ہونے کا خطرہ ہو۔یہ جو بات بات پر کفر کے فتوے لگتے ہیں حتیٰ کہ مسجدیں بھی الگ الگ کر لی ہیں اور ایک دوسرے کے بزرگوں پر سب وشتم کا بازار گرم ہے۔اس کی اجازت نہیں، جو لوگ یہ حرکت کریں اور متحارب گروہ بن کر امت کا کلمہ متفرق کریں، ان سے نبی ﷺ کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ وَ کَانُوۡا شِیَعًا لَّسۡتَ مِنۡہُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ (الانعام:۱۵۹)(جن لوگوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے (اے نبی) تمھارا ان سے کسی معاملے میں کوئی تعلق نہیں۔)

سب اپنے اپنے فقہی اور کلامی مسائل پر قائم رہیں۔مگر ایسی باتوں سے احتراز کریں جو دوسروں کے لیے موجب اذیت ہوں اور منافرت پھیلے تو ہمیں حکم ہے کہ کلمے کی حرمت برقرار رکھیں۔ارشاد نبوی ہے:

عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ من صلی صلوتنا و استقبل قبلتنا واکل ذبیحتنا فذلک المسلم الذی لہ ذمۃ اللہ و ذمۃ رسولہ فلا

تحقروا الله في ذمة. (رواہ البخاری)

[حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے ہماری طرح نماز پڑھی۔ ہمارے قبلے کی طرف رخ کیا اور ہمارے ہاتھ کا ذبیحہ کھایا تو یہ شخص ایسا مسلمان ہے کہ اسے اللہ اور اس کے رسول کی پناہ حاصل ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں تم اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری پر حرف مت لاؤ۔]

لیکن جب یہ ہی شخص قرآن پاک کے کلمات میں ردوبدل اور تحریف ثابت کرنا چاہے، مہاجرین اور انصار کو مرتد کہے اور ان کی راہ سے ہٹ کر چلے اور دین میں وہ باتیں نکالے جو اس میں نہیں اور پھر اپنا جتھا الگ بنا کر امت کا کلمہ متفرق کرنا چاہے تو اس پر مذکورہ بالا تعریف صادق نہیں آتی اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ وعید رکھی ہے:

ومن يشاقق الرسول من بعد ماتبين له الهدى ويتبع غير سبيل المؤمنين نوله ماتولى ونصله جهنم وساء ت مصيراً.

[جس نے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی حالانکہ ہدایت اس پر واضح ہو چکی تھی اور ایسی چال چلا جو اہل ایمان کی راہ نہیں تو ہم بھی اس کا منہ اسی طرف پھیر دیں گے جدھر اس نے رخ کر رکھا ہو۔ اور پھر اسے جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔]

ایک قابل توجہ جائزہ

اموی اور عباسی خلافتوں کے دینی اور آئینی حیثیت کم کرنے کی بعض مورخوں و مصنف کتنی ہی کوشش کرلیں۔ روایات واہیہ کو حقائق کا رنگ دینے کے لیے کتنا ہی زور قلم صرف کر دیں یہ صورت حال اپنی جگہ دائم وقائم ہے۔ کہ ان خلافتوں کا نظام قرآن وسنت پر مبنی تھا اور اس کے چلانے والے، اوّل تو اصحاب رسول اللہ ﷺ تھے جن کے اسمائے گرامی ہمیں امیر المومنین ولید اوّل کے عہد مبارک ومسعود تک ملتے ہیں جنھوں نے اموی عہد میں مشرق ومغرب

میں اسلام کا پرچم لہرایا۔ پھر تھے صحابہ کرامؓ کے تربیت دادہ، ان کے مخلص اتباع اور ان کے بعد ان کے اتباع جو ملت اسلامیہ کے عظیم ترین علماء وفقہاء وائمہ ہیں ۲۵۰ھ تک کا زمانہ جو خیر القرون کہلاتا ہے۔ وہ صحابہ کرام اور ان کے اتباع کا عہد ہے اور اسی مدت میں احکام دین کے کلیات وجزئیات پوری طرح مدوّن ہوکر محفوظ ہوگئے۔

اب ایک طرف تو یہ حقیقت ثابتہ ہے اور دوسری طرف سبائیوں کی اور ان سے متاثر مؤلفوں کی تحریریں ہیں جو طبعًا ہر صاحب فکر کے دل میں کھرچن پیدا کرتی ہیں کہ یہ قرآن حکیم کیسی آخری کتاب ہے۔ حضور اکرم ﷺ کس طرح کے آخری رسول ہیں اور یہ امت کون سی قسم کی آخری امت ہے کہ اپنے ہادی ومولیٰ ﷺ کا برپا کردہ نظام تیس برس میں اچھی طرح نہ چلا سکی اور پھر اس کا عالم ایسا ابتر ہوگیا کہ غاصبان خلافت کے مظالم سہتی رہی حکومت کے ہاتھوں دین مبین کے اصول وقواعد کی پامالی دیکھتی رہی اور صدیوں ان ظالموں اور غاصبوں کے دامن سے عقیدت اور وابستگی کی معصیت میں مبتلا رہنے کو تقاضائے دین باور کرتی رہی اور نام نہاد ''آل رسول'' میں سے جو لوگ ان ظالموں غاصبوں اور دین سے بے پروا حکمرانوں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلانے کو بارہا کھڑے ہوئے، ان کی حمایت ونصرت سے اپنا دامن بچاتی رہی۔ اگر اسی پر بس ہوتا تو عالم اسے امت کی بے حسی سمجھ لیتے۔ مگر اس نے تو بے راہ روی کی حد کردی کہ ظالم وغاصب حکمرانوں کے ایک اشارے پر جوق در جوق جان ومال کی بازی لگانے اور ان کی حکومت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرنے کے لیے ہمہ تن مصروف جہاد ہوجانا اس کا شعار رہا۔

اس امت کی فرض شناسی کی انتہا یہ ہے کہ جب ''ظالم وجابر'' بنی امیہ کا تختہ الٹ دیا گیا اور ان میں سے تنہا ایک شخص راہ کے تمام مصائب جھیلتا ہوا اندلس پہنچا تو وہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ کسی نے نہ سوچا کہ یہ ایک دشمن گھرانے کا فرد ہے اور یوں ہسپانیہ میں پھر اسی ظالم وجابر اور دین سے بے بہرہ اموی خاندان کی ایسی حکومت قائم ہوگئی جہاں کئی صدیوں تک وہ علماء وفضلاء پیدا ہوتے رہے جن کی علمی کاوشوں پر مسلمانان عالم کو آج تک کیا کچھ فخر وناز ہے۔

یہ تھے قریش کے بطل جلیل اور بنی امیہ کے سورما امیر عبدالرحمٰن الداخل آپ سے

جب اندلس میں دریافت کیا گیا کہ بیعت خلافت کی لینا چاہتے ہیں یا امارت کی تو اس مردحق نے فرمایا: ''خلافت کی بیعت مشرق (عراق) میں ہوگئی۔ میں صرف امیر ہوں'' آپ اگر چاہتے تو اندلس میں حریف خلافت قائم کر سکتے تھے۔ مگر اموی سادات امت مسلمہ کے خادم اور خیر خواہ تھے ان کی للّٰہیت نے اجازت نہ دی کہ منصب خلافت کا استخفاف کریں اور جماعۃ المسلمین کے اجماع کی بے وقعتی کے مرتکب ہوں۔

پھر اس مردحق اور شہباز صداقت وعظمت کی یہ بات بھی سبائیت زدہ مؤلفین کے لیے خاص کر حیرت انگیز ہے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے انقلاب آیا۔ اس کے خاندان کی حکومت چلی گئی لیکن ہسپانیہ جا کر اس نے ان بہیمانہ حرکتوں میں سے کسی ایک کا بھی تذکرہ نہیں کیا۔ جو اموی سادات کرام کی قتل عام، ان کے مقابر کی انہدام اور ان کی لاشوں کی بے حرمتی کے دلدوز مناظر کا خاکہ پیش کرنے میں ابومخنف جیسے کذاب نے ابتدا کی پھر سبائیوں مصنف زورِ قلم صرف کرتے رہے جن سے دوسرے لوگ اپنی کتابوں میں اندھی تقلید سے نقل کرتے چلے آرہے ہیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوئی ہوتی تو اندلس مورخوں کی تحریروں میں کچھ تو ان کا ذکر ہوتا انقلاب حکومت میں کشت وخون اتنا ہی ہوا جتنا فوجی انقلاب میں عموماً ہوتا ہے اس سے زیادہ سب کذب محض ہے۔

علاوہ ازیں اس امت کی یہ بات بھی ہر دل میں کھٹک پیدا کرتی ہے کہ جب تا تاریوں کے ساتھ سبائی رافضیوں کی سازباز کے نتیجے میں خلافت عباسیہ مشرق میں ختم ہوئی۔ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تو پھر بھی اطمینان کا سانس لینے کے بجائے مسلمانوں نے ضروری یہ سمجھا کہ نئے سرے سے انھی ''ظالم وغاصب'' عباسیوں کی خلافت مصر میں قائم کی جائے۔ حالانکہ ان خلفاء کے ہاتھ میں اب فوجی وحربی طاقت بھی نہیں رہی تھی مگر عالم اسلام میں انھی خلفاء کو پیشوائے امت سمجھا جاتا تھا حتی کہ سلاطین ہند کے کتبوں اور سکوں میں ان کے اپنے لقب کے ساتھ قسیم امیر المومنین، نائب امیر المومنین لکھے جاتے تھے، اور بعض کتبوں میں خلیفہ عباسی کے نام کی صراحت بھی تھی۔ شاہان دہلی کے علاوہ سلاطین بنگالہ، سلاطین مالوہ وبہمینہ دکن

و جونپور سب کی عقیدت کی یہ کیفیت تھی وہ انھی کو مستقل بادشاہ وسلطان نہیں جانتے تھے بلکہ عباسی خلیفہ زماں کا نائب اپنے کو سمجھتے اور کہتے تھے سلطان محمد تغلق شاہ کو اس بارے میں جو غلو تھا۔ ضیاء برنی مصنف تاریخ فیروز شاہی نے تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ ابتدائی فقرات ملاحظہ ہوں:

درخاطر سلطان افتاد که سلطنت و امارت سلاطین بے امر دادن خلیفه که از آل عباس بود درست نیست وهر بادشاهے که بے منشور خلفائ عباسی بادشاهی کرده است یابادشاهی کند متغلب بوده است و متغلب بود.

[سلطان (محمد تغلق شاہ) کے دل میں آیا کہ خلیفہ عباسی کی اجازت کے بغیر سلطنت وحکومت جائز نہیں۔ جن بادشاہوں نے خلفائے عباسی کے فرمان کے بغیر حکومت کی ہے یا آیندہ کریں وہ غاصب تھے اور غاصب ہوں گے۔]

چنانچہ ۷۴۴ھ میں سلطان مذکور کی عرضداشت پر دربار خلافت عباسیہ مصر سے جب خلعت ولوائے سلطنت اور فرمان آیا سلطان نے تمام اراکین دولت وعلماء ومشائخ کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر استقبال کیا اور سواری سے اُتر کر فرمان وخلعت کو سر پر رکھا۔ اس کے درباری شاعر بدر چاچ نے متعدد قصائد اس بارے میں لکھے ایک قصیدے کے یہ چند شعر سنیے۔ کہتا ہے:

او شهنشاه شریعت بود منشورش کتاب
ایں زماں قائم مقام او امام اکبر ست
شاه ابن احمد ابوالعباس امیر المومنین
آنکه آل دودۂ عباس را سر دفتر است
آفتاب شرع و ملت آسمان ملک و دین
آنکه مر تخت خلافت را جمالش زیور است

[نوٹ: پہلے مصرعہ میں ''او'' سے مراد حضور اکرم ﷺ ہیں اور ''کتاب'' سے مراد قرآن کریم ہے چوتھے مصرعہ میں ''دودۂ عباس'' سے مراد عباسی خلیفہ ہیں۔]

تقریباً ساڑھے تین صدی بعد آخری عباسی خلیفہ مصر نے ۹۲۳ھ میں ترکی آل عثمان کے سلطان سلیم کو یہ منصب جلیلہ سپرد کر دیا تھا۔ ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۸ء تک ترکی سلاطین بحیثیت امیر المومنین عیسائی حکومتوں کی نظروں میں خار کی طرح کھٹکتے تھے۔ شریف حسین کو آلہ کار بنا کر دشمن اسلام قوتوں نے ترکی خلافت کا خاتمہ کرا دیا تھا مسلمانان ہند میں جو ہیجان و شور و شغب سالہا سال تک ہوتا رہا وہ اسی شیفتگی کی بنا پر جو مسلمانان عالم کی اس مرکزی قوت سے تھی اب سوچنا چاہیے کہ ملت اسلامیہ کی یہ عقیدت اور شیفتگی خاص کر اموی عباسی خلافتوں سے کیوں رہی اور بقول سبائیت زدہ اہل قلم جن ''آل رسول'' کے خون کا بدلہ لینے کے لیے عباسی خلافت کفار تتار کے ہاتھوں ختم کرادی گئی اور جن ''آل رسول'' کی خلافت قائم کرنے کے لیے ابن علقمی ونصیر طوسی جیسے رافض نے ہلاکو کے ٹڈی دل کو خفیہ سازشوں سے بلایا تھا ان کی خلافت کیوں نہ قائم ہوسکی۔ نیز شریف حسین نے ''آل رسول'' کی خلافت قائم کرنے کے لیے جو کچھ کیا اس کا نتیجہ وہ کیوں مرتب ہوا جو دنیا دیکھ رہی ہے۔ ان امور پر اگر غور کر لیا جائے اور جاہلی تعصب کی عینک کچھ دیر کے لیے آدمی اتار دے، اس پر کھل جائے کہ امت مسلمہ میں کامیابی اسے ملتی ہے جو قواعد دینیہ کی پاس داری کرے، آداب سیاست و جہانبانی سے بہرہ ور ہو۔ رائے عامہ اپنے حق میں استوار کرے اور ملت کے سامنے کوئی واضح تعمیری نصب العین رکھے۔

یہ سبب ہے کہ جو علوی اشخاص کے خروجوں میں نہ عامۃ المسملین نے کبھی ساتھ دیا اور نہ علماء وفقہاء نے حکومت قائمہ کے خلاف باغیانہ اقدامات کی کسی نہج تائید کی علویوں کی پیہم شکستوں اور ناکامیوں کو حفظ دین کے لیے ایثار وقربانی کا رنگ دینے کو ملاحظہ ہوں کیسے کیسے مہمل تراشے گئے۔ امیر المومنین ہشام جیسے نیک صفات خلیفہ کے خلاف زید بن الحسن جو باغیانہ اقدام میں مارے گئے تھے ان کی تقدیس میں رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بول کر ایک اکذب الاحادیث وضع کر ڈالی (ترجمہ بحوالہ الاسلام الصحیح ص۲۰ طبع بیروت ۱۳۵۴ھ)

''نبی ﷺ کی نگاہ زید بن حارثہ کی طرف اٹھی تو فرمایا (میرے اہل بیت میں سے ایک مظلوم کا یہی نام ہوگا۔ اللہ کی راہ پر قتل ہونے والے اور میری امت میں سے

سولی پر لٹکائے جانے والے کا یہی نام ہوگا) زید بن حارثہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: زید مجھ سے اور قریب ہو جاؤ۔ اللہ تمھاری محبت میرے دل میں اور زیادہ کرے کیونکہ تمھارا نام میری اولاد میں سے ایک پیارے بیٹے زید کا ہے۔''

یہ زید جنھیں کذاب راوی نے حضور رسالت مآب ﷺ سے منسوب الفاظ میری اولاد میں سے ایک پیارے بیٹے کہلوایا ہے حضرت حسینؓ کے پوتے تھے جو حضور اکرم ﷺ کے وقت رحلت فرمانے سے نصف صدی سے زیادہ عرصے بعد تولد ہوئے اور آپ کی وفات سے ایک سو بارہ برس بعد حکومت قائمہ کے خلاف بغاوت میں مارے گئے۔ ان صاحب کو جو احکام شریعت کی خلاف ورزی میں جماعت سے علیحدہ ہو کر بغاوت میں مقتول ہوئے ''زید شہید'' کہا گیا۔ پھر ان زید سے کوئی بیس بائیس سال بعد حکومت قائمہ کے خلاف دوسرے علوی فرد محمد نام الارقط لقب نے ۱۴۵ھ میں علم بغاوت بلند کیا۔ باغیانہ اقدام کی کامیابی کے واسطے ضعیف الاعتقاد عوام کو بہکانے کے لیے اپنے آپ کو ''مہدی'' کہا اور کہلوایا ان کے بھی اسی طرح مقتول ہونے پر سبائی راوی نے دیومالائی قماش کی یہ جھوٹی کہانی گھڑ ڈالی کہ محمد الارقط کے بغاوت میں مارے جانے سے ایک سو پینتیس برس پہلے ہی حضور اکرم ﷺ نے ان کے مقتل گاہ پر مع جماعت صحابہ نماز جنازہ پڑھ کر فرمایا تھا کہ یہاں میری اولاد سے ایک ''نفس زکیہ'' مقتول ہوگا۔ اموی اور عباسی خلفاء کے مفروضہ مظالم میں ''نفس الزکیہ'' کا پروپگینڈا اس شدت سے کیا گیا کہ نام کے بجائے یہی سبائی لقب اب بھی مودودی صاحب جیسے ''مفکر اسلام'' کی زبان قلم سے بار بار ادا ہوتا ہے۔ خیر القرون کے مسلمان ''ابناء رسول'' کی حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے اور خوب جانتے تھے کہ حضور اکرم ﷺ کے صلب مطہر سے چار صاحبزادے ہوئے جو سب بچپن میں فوت ہو گئے۔ آپ کے کسی فرزند کا سن بلوغت میں آنا منشائے الٰہی میں نہ تھا فرما دیا گیا: وما كان محمد ابا احد من رجالكم ولكن رسول الله وخاتم النبيين (اور محمد تم میں سے کسی ایک مرد کے بھی باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین) چاروں فرزندان رسول اللہؐ قاسم، طاہر، عبداللہ ابراہیم کا بچپن ہی میں وفات پا جانا بین ثبوت ہے کہ اس

دنیا میں نہ کوئی فرزند رسول اللہ ہے اور نہ ابناء رسول کی کوئی ذریت خلافت کا راز بھی اسی میں پنہاں سمجھے کہ وہم وراثت میں نہ پیدا کہیں ہو۔

جو زندہ رہا ہوتا بیٹا نبیؐ کا — عجب کیا وہ کرتا وراثت کا دعویٰ
نہ اٹھنا وہ خود تو کوئی اور اٹھاتا — نواسوں کی تاریخ کو دیکھے دنیا
نواسوں کی تاریخ مظہر ہے اس کی — کہ بیٹے نبی کے رہے کیوں نہ باقی

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اولاد علیؓ کے ادعائے خلافت کے سلسلے میں اپنے مخصوص طرز سے اظہار حقیقت ان الفاظ میں کر دیا ہے۔(ازالۃ الخلفاء، ج۱،ص۲۸۴)

درعنایت ازلی مقرر بود که هیچگاه حضرت مرتضیٰ واولاد اوتاداماں قیامت منصور نه شوند وهیچ گاه خلافت ایشاں علیٰ وجها صورت نه گیرد بلکه ازمیان ایشاں هرکه دعوت بخود کند وبقتال برآرد مخذول بلکه مقتول گردد.خداتعالیٰ مے فرماید:ولقد سبقت کلمتنا لعباد ناالمرسلین.انهم لهم المنصورون وان جندنا لهم الغالبون.

(وللخفاء الذین هم خلفاء الانبیاء حقا اسوة المرسلین فهم المنصورن وهم الغالبون).

سیرۃ امام ابوحنیفہؒ

(اتہام شیعیت کی حقیقت)

مؤلف
مولانا علی احمد عباسی رحمہ اللہ

اعداد و تقدیم
محمد فہد حارث

حارث پبلی کیشنز

Rs. 400/=